فردوسِ گمگشتہ

پرویز

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عمل تست جناں چیزے ہست

جناب پرویز کے ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

شائع کردہ

ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

قیمت: چھ روپے

فہرست مشمولات فردوس گم گشتہ

عنوان	صفحہ

رعدیات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

ایک دن ہم ایک دوست سے، جسے ذوقِ سلیم اور نورِ بصیرت سے بہرہ وافر عطا ہوا ہے، باتیں کر رہے تھے۔ دوران گفتگو میں ہم نے کہا کہ ہم بھی کس زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں جب دنیا کے ہر گوشے میں فساد ہی فساد نظر آتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہمیں اس پر جس قدر بھی فخر ہو کم ہے کہ ہم اس دور میں پیدا ہوئے ہیں جب تیرہ سو سال کے بعد، پھر قرآن کی آواز بلند ہوئی ہے اور ایسے ملک میں پیدا ہوئے ہیں جہاں سے یہ آواز اٹھی ہے۔ اُدھر سے فطرت کے رموز و بواطن اس تیزی کے ساتھ بے نقاب ہو رہے ہیں اور اِدھر قرآن کے اسرار و غوامض سے اس طرح پردے اُٹھ رہے ہیں اور یوں علامہ اقبال کے الفاظ میں "فطرت اللہ" آشکار ہوتی جا رہی ہے۔ ایسا دور اور کس کے حصے میں آیا ہو گا؟

اس میں کوئی کلام نہیں کہ، اس نقطۂ نگاہ سے، ہم اپنے زمانے کے متعلق جس قدر بھی فخر و مسرت کا اظہار کریں کم ہے قرآن اُس زمانے میں نازل ہوا جب دنیا ایک نیا موڑ مڑ رہی تھی اور کاروانِ حیات ایک نئی منزل میں داخل ہو رہا تھا۔ انسانیت اپنے عہدِ طفولیت کو چھوڑ کر عالمِ شباب میں پہنچ رہی تھی۔ توہم پرستیوں کا زمانہ ختم ہو رہا تھا اور علم و بصیرت کا دور آ رہا تھا۔ چنانچہ عین اس وقت، نوعِ انسانی کو ایسا ضابطۂ حیات دیدیا گیا جس کا ہر دعویٰ دلائل و براہین پر مبنی اور جس کا ہر اصول علم و حقیقت کا آئینہ دار ہے جو عقل کو مخاطب کرتا ہے اور اپنی تعلیم کو غور و تدبر سے پرکھ کر ماننے کی دعوت دیتا ہے۔

لیکن انسانوں نے قرآنی روشنی سے بہت تھوڑے سے وقت کیلئے راہ نمائی حاصل کی اور اس کے بعد اس شمعِ درخشندہ پر انسانی تصورات اور خود ساختہ معتقدات کے لیسے دبیز پردے پڑنے شروع ہوگئے کہ کچھ عرصہ کے بعد اسکی روشنی ان پردوں کے نیچے یکسر گم ہوکر رہ گئی۔ یہ حالت صدیوں سے چلی آرہی تھی کہ ہمارے زمانے میں بعض سعید روحوں نے اس شمعِ حقیقت سے انسانی تخیلات و معتقدات کے پردوں کو اٹھانے کی کوشش کی تاکہ اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی دنیا' اس دانشِ نورانی سے پھر سے راہ نمائی حاصل کرے۔ ان میں بعض حضرات وہ تھے جنہوں نے قدامت پرست' مذہبی حلقہ کو خصوصیت سے مخاطب کیا اور ان کی اُن غلطیوں کو ایک ایک کرکے گنایا جن کی وجہ سے وہ قرآن سے اس قدر دور ہوچکے تھے۔ اور بعض وہ جنہوں نے آنے والی نسل کے رجحانات' و میلانات کا وقت نظر سے مطالعہ کرکے اُسے بتایا کہ عصرِ حاضر کے تقاضے کیا ہیں اور قرآن کس طرح ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس طرح انہوں نے کوشش کی کہ ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ قرآن کے قریب آجائے اور اس شمعِ نورانی کو ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے اول الذکر طبقہ میں' علامہ اسلم جیراجپوری (مدظلہٗ العالی) کا نام خصوصیت سے لیا جاسکتا ہے اور ثانی الذکر میں علامہ اقبال (علیہ الرحمۃ) ایک ممتاز حیثیت لئے ہیں۔ محترم المقام جناب پرویز نے ان دونوں گروہوں کی بصیرتِ قرآنی سے کسبِ ضیا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نگاہ قدیم پر بھی ہے اور جدید پر بھی۔ انہوں نے اسلام کی تاریخ (مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ) کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ عصرِ رواں کے تقاضوں پر بھی وسیع نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کی ساری عمر قرآن کے مطالعہ میں گذری ہے اور قرآن کے ساتھ ان کی والہانہ گرویدگی اور عشق کا نتیجہ ہے کہ قرآن اُن کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا اور ان کے ذہن پر چھا چکا ہے۔ انہوں نے علامہ اقبالؒ کی طرح' قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو خاص طور پر اپنی فکرِ قرآنی کا مخاطب قرار دیا ہے اور اپنی کوششوں کا بیشتر حصہ انہی کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہماری غلط تعلیم' نوجوانوں کے دلوں میں کس کس قسم کے شکوک و شبہات پیدا کر دیتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ زمانہ کے اثرات کے ماتحت ان نوجوانوں کی ذہنیت کس قسم کی بن جاتی ہے۔ وہ ان کے شکوک کا استقبال' جارو یابس پیشانی کی نفرت انگیز تیوری اور کفِ بر دہاں لاحول سے نہیں کرتے۔ وہ انہیں ہمدردی سے سنتے اور شفقت سے ان کا علاج سوچتے ہیں۔ وہ اُن کی ذہنی سطح .....

کے مطابق گفتگو کرتے ہیں اور انہیں اس زبان میں قرآن سمجھاتے ہیں جو آسانی سے ان کی سمجھ میں آجائے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ جو دل میں شکوک و شبہات کی آگ لیکر آتا ہے وہ اطمینان و یقین کی جنت لیکر جاتا ہے۔

علامہ اقبال کو مبدا فیض کی کرم گستری سے، معرفت حقائق کے ساتھ اسلوب بیان بھی ایسا حسین و دلکش عطا ہوا تھا کہ وہ بڑے بڑے اہم اور ادق مسائل کو ایسی لطافت و نظافت سے بیان کر جاتے ہیں کہ سننے والے کے ذہن پر بار ہونا تو ایک طرف، شعر کی شعریت پر بھی اتنا بوجھ نہیں پڑتا جتنا پھول کی پتی پر قطرۂ شبنم کا۔ جناب پرویز قرآنی حقائق کو شعر میں بیان نہیں کرتے، نثر میں کرتے ہیں۔ لیکن ان کی نثر میں بھی وہ سحر ہے جو شاعری سے کم نہیں۔ ہمارے ہاں "مذہبی مسائل" کی ایک مخصوص زبان ہوتی تھی ــــ الجھی ہوئی۔ بے ربط۔ مبہم۔ معلق۔ خشک۔ فرسودہ۔ دلکشی اور جاذبیت سے اتنی ہی دور جتنی حسن و زیبائی سے، وہ "نولکشوری" کتاب جس میں وہ مسائل شائع ہوتے تھے۔ جناب پرویز نے جس طرح مذہبی تصورات میں ایک انقلاب پیدا کر کے انہیں دین کے حقائق سے بدل دیا ہے اسی طرح انہوں نے ان حقائق و مسائل کے پیرایۂ بیان کو بھی ایک نیا رنگ دیدیا ہے پرویز صاحب ہمارے دور کے بہت بڑے ادیب ہیں اور ایک خاص طرز نگارش کے مالک۔ انہوں نے اپنے ادب اور انداز نگارش کو قرآنی فکر کے اظہار کے لئے وقف کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ ان کے کسی مضمون (بلکہ تصنیف) کو دیکھنا شروع کیجئے۔ آپ اس میں ایسے جذب ہو جائیں گے کہ ختم کئے بغیر چھوڑنے کا خیال تک بھی آپ کے دل میں نہیں آسکے گا۔ اور جب آپ اسے ختم کر لیں گے تو آپ کے قلب و دماغ میں، غیر شعوری طور پر ایک ایسا انقلاب آچکا ہوگا جس کا اس سے پہلے آپ نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جناب پرویز نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک ایسا حلقہ پیدا کر لیا ہے جو غیر شعوری طور پر قرآنی حقائق کا گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے، اور خود بخود اس مرکز رشادت و سعادت کی طرف کھنچے چلا آتا ہے ان کی معرکہ آرا تصنیف معارف القرآن اس دور کی مایۂ ناز کتاب ہے۔ (اس کی چار ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور پانچویں کا مسودہ تیار ہے) اس کے علاوہ "سلیم کے نام خطوط" کا مجموعہ ایک بالکل اچھوتے انداز کی کتاب ہے۔ جس نے نوجوان طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ (اب یہ سلسلہ خطوط، طاہرہ کے نام بھی شروع کر دیا گیا ہے جو طلوع اسلام

میں پہنچتے ہیں۔) علاوہ بریں "اسباب زوال امت" میں اسلام کی صحیح تاریخ کا غائر نگاہ سے تجزیہ کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام، جو ایک دین (نظامِ زندگی) تھا کس طرح "مذہب" (پوجا پاٹ کا دھرم) بن گیا۔ اور "اسلامی نظام" میں قرآن کے مطابق آئین سازی جیسے اہم مسئلہ کے اصول و مبانی بیان ہوئے ہیں۔ لیکن ان مستقل تصانیف کے علاوہ، جناب پرویز کے گراں بہا مقالات، طلوع اسلام کے صفحات میں موتیوں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ ضرورت تھی کہ ان مضامین کو یکجا کر دیا جائے تاکہ قرآنی حقائق کے مختلف گوشے بیک وقت سامنے آجائیں۔ "فردوس گم گشتہ" اسی مجموعہ کا نام ہے۔ جس میں ۱۹۳۸ء سے لیکر آج تک کے مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کے متعلق کوئی تعارفی مقدمہ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

اس مجموعہ کے آخر میں جناب پرویز کی ان تقاریر کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً ریڈیو پر نشر کیں۔ ریڈیو کی تقاریر میں وقت کی پابندی اور دیگر قیود و حدود کی وجہ سے، وسیع مضامین کو مختصر الفاظ میں سمٹانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے آپ دیکھیں گے کہ جناب پرویز نے ان تقاریر میں کس قدر ارتکاز سے کام لیا ہے، جس سے ایسے ایسے اہم مباحث یوں سمٹ گئے ہیں جس طرح سورج کی شعاعیں آتشیں شیشہ کے نقطہ میں سے گذر رہی ہوں۔

اقبال نے مردِ مومن کی ایک خصوصیت یہ بھی لکھی ہے کہ

پر و در وسعتِ گردوں یگانہ ‌ ‌ ‌ ‌ نگاہِ او بشاخ آشیانہ

آپ زیرِ نظر مقالات و تقاریر سے دیکھیں گے کہ جہاں تک "نگاہ" کا تعلق ہے۔ جناب پرویز اس معیار پر کس طرح پورے اترتے ہیں۔ فضا کی پہنائیوں میں ان کے شہپر تخیل کی پرکشائی کا یہ عالم ہے کہ شرق و غرب کی شاید ہی کوئی وادی ایسی ہو جس پر سے ان کا گذر نہ ہوا ہو۔ اور ان کا یہ گذر بھی "عقابی نگاہ" سے ہوتا ہے۔ یعنی وہ ایک ایک چیز کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں اور ان کے حسن و قبح کو بغائر پرکھتے ہیں۔ لیکن اس تمام پرکشائی اور جذبری میں ان کی نگاہ ہمیشہ قرآن پر رہتی ہے۔ وہ ہر شے کو اس کی روشنی میں پرکھتے اور اس کی میزان پر تولتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں قرآن جس نتیجے پر پہنچاتا ہے اسے بغیر کسی خوف اور جھجک کے بلا توقف و تامل نہایت جرأت و بے باکی کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی یہی حق گوئی اور

بیباکی ہے، جس کی وجہ سے کیفیت یہ ہے کہ

اپنے بھی خفا اُن سے ہیں بیگانے بھی ناخوش

لیکن انہیں قرآن کے مقابلے میں نہ اپنوں کی خفگی سے کوئی رنج ہوتا ہے نہ بیگانوں کی ناخوشی سے کوئی صدمہ۔ وہ کوشش کرتے ہیں (اور آخر تک کوشش کرتے رہتے ہیں) کہ قرآن کی بات دوسرے کے سمجھ میں آجائے۔ لیکن وہ اس باب میں نہ کسی سے کوئی رعایت برتتے ہیں نہ مداہنت۔ اس معاملہ میں نہ کسی کی محبت و عقیدت ان کی راہ میں حائل ہوتی ہے نہ کسی کی شخصیت انہیں مرعوب کر سکتی ہے۔ نہ کسی "ابوالکلام" کی خطابت ان کی عناں گیر ہو سکتی ہے نہ کسی "رسل" کی بین الاقوامی شہرت۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پیش ہی اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ اس پر کسی قسم کا قلبی رجحان یا ذہنی میلان اثر انداز نہ ہونے پائے۔ جناب پرویز کی تحریروں میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر آپ کو ملے گی۔

پرویز صاحب کی دیگر تصانیف کی طرح، ان کے مقالات کا یہ فردوس رنگ مجموعہ بھی ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طلوع اسلام اپنی اس سعادت پر جس قدر بھی فخر و ناز کرے کم ہے۔ کہ جناب پرویز جیسے قرآنی مفکر نے اس کے اوراق کو اپنی قرآنی فکر کے اشاعت کے لئے مخصوص کر رکھا ہے اور ان کی تصانیف بھی اسی ادارہ سے اشاعت پذیر ہوتی ہیں (اور بتوفیق ایزدی ہوتی رہیں گی)۔ وَاللہُ المستعان علیہ توکلت وَالیہ اُنیب۔

اکتوبر ۱۹۵۶ء

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

ان کی راہ میں حائل ہوا۔ نہ نغمۂ مطرب کی دلکشی دامن گیر۔ نہ کسی کو صراحی کے ٹوٹ جانے کی پرواہ ہے نہ پیمانہ کے ڈھلکنے کا احساس۔ اس وقت تمام توجہات دروازوں اور کھڑکیوں پر مرکوز ہیں۔ باہر کس قدر سردی ہے۔ اس کا بھی کسی کو خیال نہیں۔ ہر ایک کی کوشش ہے کہ کسی طرح وہ سب سے پہلے باہر نکل جائے۔ اس افراتفری میں چٹخنیاں بھی نہیں کھلتیں۔ اس نفسانفسی میں ایک دوسرے کو روندنے اور مسلنے تک سے بھی گریز نہیں۔ یہ کیا ہوا؟ وہ محفل جو ابھی ایک ثانیہ پہلے عیش و طرب کی جنت دکھائی دے رہی تھی۔ کرب و الم کی جہنم کیوں بن گئی؟ کیف و سرور کے وہ جاں نواز نظارے جن کے متعلق جی چاہتا تھا کہ کسی ساحر کے ہاتھ کی ایک طلسمی جنبش سے ہمیشہ کے لئے اپنے اپنے مقام پر منجمد ہو کر رہ جائیں تاکہ زمان و مکان کے حوادث ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ پیدا کر سکیں۔ انہیں خود اپنے ہاتھوں سے یوں پریشان کیوں کر دیا۔ اس لئے کہ خلافِ فطرت فضا کی کثیف ہوا میں سانس لینے سے جان پر بن گئی۔ اور جان بچانے کی غرض سے پھر فطرت کی کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے تڑپ پیدا ہوئی۔ اپنے ہاتھوں سے بند کئے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں کو سر مار مار کر توڑنا پڑا۔ آئینِ فطرت کی خلاف ورزی کب تک کی جا سکتی تھی۔ بند کمرے میں کوئلہ سلگانے کا فطری نتیجہ تھا کہ دم گھٹنے لگ جائے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

لیکن سانس کا مسئلہ تو انسان کی طبیعی زندگی (Physical Life) سے متعلق ہے اس میں انسان اور حیوان سب برابر ہیں۔ جس کمرہ میں ان تمام انسانوں نے اس طرح بھگدڑ مچائی وہاں ان کے ساتھ

انسان اور حیوان کی زندگی کا فرق

دو تین کتے بھی تھے۔ انہوں نے بھی ان ہی کی طرح دروازوں سے ٹکریں ماریں۔ وہ بھی باہر نکلنے کے لئے ان ہی کی طرح، بلکہ ان سے بھی زیادہ، بیقرار و بیتاب تھے۔ لیکن کیا انسان اور کتے میں کوئی فرق نہیں۔ کیا دونوں کی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے؟ یہ تو غلط ہے۔ ابھی دم گھٹنے سے پہلے اس کمرہ میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کی کیف و مستی میں کتے کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ حالانکہ وہ بھی برابر کا شریکِ بزم تھا۔ سو ظاہر ہے کہ اس حصّے کا تعلق زندگی کے کسی ایسے شعبے سے ہے جو حیوان اور

انسان میں مشترک نہیں۔ بلکہ انسان کے لئے مختص ہے۔ اور اگر یہ انسان کے لئے مختص ہے تو لا محالہ اس کا اثر بھی (اچھا ہو یا برا) حیوانی زندگی سے ماوراء ہے۔ اور جب یہ کیفیت دنیائے لذت و طرب میں ہے تو ذمہ داریوں کی دنیا میں یہ اختصاص اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہ وہ اختصاص ہے جس کا تعلق انسانیت سے ہے۔ جس طرح طبیعی زندگی کے لئے آئین و ضوابط متعین ہیں اسی طرح دنیائے انسانیت کے لئے بھی دساتیر و قوانین مقرر ہیں پھر جس طرح طبیعی زندگی سے متعلق آئین و ضوابط کی خلاف ورزی سے مضر اثرات کا نمودار ہونا لازمی ہے اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق قوانین سے سرکشی برتنے سے ضرر رساں نتائج کا مترتب ہونا تقاضائے فطرت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ طبیعی زندگی سے متعلق اثرات کا احساس جلد اور بدیہی طور پر ہو جاتا ہے۔ اور انسانی زندگی سے متعلق نتائج و عواقب کے لئے وقت بھی درکار ہوتا ہے اور دیدہ وری بھی۔ یہ اثرات سر کی آنکھوں کے بجائے دل کی آنکھوں سے جلدی اور متعین طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

اب ذرا کرۂ ارض کے متذکرہ صدر کمرہ کی دیواروں کو پھیلانا شروع کیجئے حتیٰ کہ یہ پھیلتے پھیلتے یورپ کے چاروں گوشے بن جائیں۔ جو کچھ اس کمرہ کے اندر ہو رہا تھا اس کا مجموعی نام تہذیب مغرب رکھ لیجئے۔ رنگ و چنگ

تہذیب مغرب

کے سیلاب میں ڈوبے ہوئے مغرب کی نگاہیں حیوانی زندگی کے مقتضیات سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے اشیائے فطرت کو مسخر کیا لیکن کس لئے؟ صرف اس لئے کہ وہ ان کی حیوانی خواہشات کے بروئے کار لانے کا ذریعہ بن سکیں۔ وہ ساقی و مطرب کی جلوہ ریزیوں اور عشوہ طرازیوں میں کچھ ایسے مدہوش ہوئے کہ انسانیت کے تقاضوں کی یاد ہی باقی نہ رہی۔ وہ اس طوفانِ کیف و مستی میں غرق تھے اور اس کا مطلق احساس نہ تھا کہ گرد و پیش کی فضا میں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن جنہیں اللہ نے دیدۂ بینا عطا فرمایا تھا۔ ان کی نگاہیں کوئلہ کی اس مسموم گیس پر تھیں جو ہوا میں اس قدر کثافت پیدا کئے جا رہی تھی۔ جس طرح ایک طبیب حاذق سنکھیا کھانے والے کے انجام کے متعلق بہت پہلے آگاہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح ایک مردِ مومن جسے اللہ تعالیٰ نے قرآنی بصیرت عطا فرمائی ہے۔ قوموں کی روشِ زندگی سے ان کے مآل کے متعلق اندازہ لگا لیتا ہے اور اس

اس دم گھٹنے والی فضا میں جنہیں کچھ ہوش باقی ہے ان کے دل میں فطرت کی کھلی ہوا میں سانس لینے کے لئے تڑپ پیدا ہوئی ہے وہ ادھر ادھر دروازوں اور کھڑکیوں کی تلاش میں بیتابانہ دوڑ رہے ہیں ان ہی میں جریدہ اسٹیٹسمین کے مدیر مسٹر آرتھر مور بھی ہیں۔ یہ صاحبِ قلم، میدان صحافت وسیاست کے بالغ نظر شہسوار سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے سال گذشتہ تجارب ممالک کا دورہ کیا اور ان اسباب وعلل کی تلاش میں سرگرداں رہے جو موجودہ خلفشار کا موجب ہیں۔ انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنے اخبار میں۔

"ہماری موجودہ جنگ"

کے عنوان سے ایک مسلسل مقالہ لکھنا شروع کیا جو گذشتہ ماہ سے التزاماً شائع ہو رہا ہے۔ انہوں نے اس مقالہ میں زندگی کے موجودہ مسائل کو بےنقاب دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہرچند یہ کوشش

آرتھر مور کا تبصرہ

ایسی کامیاب نہیں جیسی ہونی چاہیئے تھی اس لئے کہ وہ حقائق کا مطالعہ تنہا عقل کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں، علم خداوندی کی روشنی ان کے پاس نہیں۔ اور جب انسان کے پاس علم خداوندی کی روشنی نہ ہو تو اس کی حالت آسمان میں چمکنے والی بجلی کی روشنی میں چلنے والے کی سی ہوتی ہے۔ کلما اضاء لهم مشوا فيه، واذا اظلم علیهم قاموا (۲۰)۔ جب فضا اس کی چمک سے روشن ہو جاتی ہے تو دو چار قدم چل لیتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتے ہیں۔ بایں ہمہ مسٹر مور کی طلب وجستجو اور تپش وخلش سے اتنا ضرور واضح ہو رہا ہے کہ مغرب اپنے غیر فطری نظام زندگی کے ہاتھوں کس درجہ تنگ آ چکا ہے اور آئین فطرت کے مطابق نظام حیات کے لئے کس درجہ بیتاب ہے۔ مسٹر مور مختلف سیاسی نظریات ورجحانات کے تذکرہ کے بعد لکھتے ہیں کہ

> میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم ایک عالمگیر جنگ کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کی تدبیر فوری نہیں ہو سکتی۔ یہ آگ ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیل کر رہے گی۔ اور جب ہٹلر اور مسولینی ختم ہو جائیں گے تو ان کے بعد بھی صفحۂ ارض کے ایک بڑے حصے پر اس آگ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ باہم خانہ جنگی یا مختلف طبقات کی لڑائی کی شکل میں۔ یہ مصیبت کا کل ایک

حق ہے ورود یہ کہ جو لوگ آج ہٹلر کے انفرادی مقصد کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ ان میں خود ایک مشترکہ اجتماعی مقصد اور عقیدہ پیدا ہو جائے۔ (اسٹیٹسمین ۱۱۲/۴۱ ۳۶)

اس اجتماعی عقیدہ یا مقصد کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

ساکنانِ ارض کو ہم اندازاً دو طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو کوئی نہ کوئی عقیدہ رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جن کا کوئی عقیدہ نہیں۔ وہ نظامِ جدید جسے ایک طرف ہٹلر اور دوسری طرف اشتراکیین پیش کر رہے ہیں مستقبل کے متعلق ایک عقیدہ کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ ان کے نظامِ جدید یا عقیدہ میں ارتقاء کا شعور ناگزیر ہے۔ لیکن کس قسم کا ارتقاء؟ ایک اندھی قوت کا ارتقاء۔ ان کے ہاں عقل کو ذرا بلند درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن عقل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مادی تہذیب اور اس کے لئے اجتماعی نظم و نسق پیدا کر دیتی ہے۔ یہ تو ان کی کیفیت ہے جن کے ہاں مقصدِ زندگی ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے ان کے برعکس دوسرے ممالک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ خدا کا عقیدہ رکھتے ہیں نہ ارتقاء کا۔ وطن پرستی۔ فرضِ منصبی کا احساس، غصہ، نفرت یا محض مجبوری۔ ان کی قوتِ عمل کے محرکات ہیں ...... ارتقاء کی حد و تحدید میں ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بندر سے انسان تک کی ارتقاء کی کڑیاں تو تسلیم کر لیں گے لیکن یہ چیز ان کے تصور میں نہ آسکے گی کہ ارتقاء کا سلسلہ نامتنہی ہے۔ ورائے انسان سے آگے بھی بڑھنا ہے۔

(اسٹیٹسمین ۲۵ نومبر ۱۹۴۱ء)

یہ ہے مسٹر مور کے خیال کے مطابق دنیا کی موجودہ حالت۔ اب یہ دیکھئے کہ وہ اس مصیبت کا حل کیا تجویز کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

مصیبت کا حل — اس عالمگیر جنگ میں کامیابی حاصل کرنے اور ایک نظامِ جدید کو متمکن کرنے کے لئے مختلف مذاہب کے باہمی امتزاج سے ایک جدید مذہب کی تشکیل

پند و نصیحت اس جذبہ کو بدل نہیں سکتی ...... اس کے لئے یہی نہیں، اس امر کا یقین ہو جائے کہ ہمارا موجودہ نظامِ معیشت ٹوٹ چکا ہے۔ اور دوسرا کوئی ایسا نظام موجود ہے جو اس کی جگہ لے سکتا ہے تو ہمیں اپنا موجودہ نظام بدلنا پڑے گا۔" (اسٹیٹسمین ۔ ۳۰)

ان اقتباسات میں جہاں ایک طرف صاحب مضمون کی پریشانی فکر و نظر، ان کی بیتابی قلب کی غماز بن رہی ہے دوسری طرف غضب و جستجو کی تڑپ بھی ایک ایک لفظ سے جھلک رہی ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ مسموم فضا کی کثیف ہوا سے دم گھٹ رہا ہے اور کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے دروازوں اور کھڑکیوں کی تلاش میں دیوانہ وار جدوجہد ہو رہی ہے۔ مسٹر موڑ نے جو کچھ اپنے مقالہ کی ان تین چار اقساط میں لکھا ہے (جن کے اقتباسات اوپر دیئے جا چکے ہیں)، اس کا ماحصل چند الفاظ میں یہ ہے کہ

ماحصل

(۱) دنیا کی موجودہ مشکلات و مصائب مغربی نظامِ تمدن کے ثمرات ہیں۔

(۲) وہ نظامِ تمدن جس میں منتہائے نگاہ حیوانی مقتضیات زندگی سے آگے نہیں بڑھتے۔ جو انسان کو سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی سمجھ کر مستقبل کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیتا ہے۔ اور جہاں کامیابی قوت اور عزت کا معیار دولت کا حصول و اکتناز ہے۔

(۳) مجرد اور مسیحی نقطۂ نگاہ اس غیر فطری نظام کے مزاحم ہیں۔ اس لئے اگر انہیں مغلوب بھی کر لیا جائے تو بھی دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔

(۴) دنیا میں امن و سکون کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ایک جدید نظامِ تمدن و عمرانیت کی بنیاد ڈالی جائے۔

(۵) وہ نظامِ جدید جس میں

(۱) انسان کو سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہ سمجھا جائے بلکہ اس سلسلہ کو ممتد تسلیم کیا جائے جس میں انسان کو اپنی تکمیل کے لئے ارتقاء و بلندی کے کئی اور مدارج طے کرنے ہیں۔ یعنی

ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ نسل یا ملک کی تقسیم سے انسانیت کی تقسیم نہیں ہوسکتی۔ اسی ایک عقیدہ سے وہ تمام اقتصادی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، عمرانی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں جو آج انسان کے گرد مار پیچاں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں اور اس کی زندگی کو جہنم بنا رہے ہیں۔ آج ایک نسل دوسری نسل کے ساتھ برسرِ پیکار ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک کے خلاف فوج کشی کر رہا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ یہ سب اس لئے کہ وحدتِ خلق کے بجائے نوعِ انسانی کو غیر فطری امتیازات سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہے۔ دایاں ہاتھ بائیں بائیں ہاتھ کو کاٹ رہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ یہ اپنا ہی دست و بازو ہے کسی غیر کا نہیں۔ معدہ اس فکر میں ہے کہ جو خوراک اس میں جا پہنچی ہے اسے اپنی ہی چار دیواری میں محبوس کر لے۔ اِدھر دل و جگر کی یہ کوشش ہے کہ خوراک کو معدہ تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے۔ بلکہ حلق سے نیچے اترتے ہی جھپٹ لی جائے۔ جس جسم کے نظام میں اس قسم کی نفسا نفسی پیدا ہو جائے۔ اس کا انجام معلوم!

(۲) پھر جیسا کہ ارتقاء سے متعلق مضامین میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اسلام کے نزدیک موجودہ انسان سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں بلکہ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا۔ اس وقت صرف حیوانیت کا ارتقاء تھا۔ اب انسانیت کا ارتقاء شروع ہو گیا۔ انسانیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس پیکرِ حیوانی میں صفاتِ الٰہیہ کا کرشمہ نمودار ہوتا ہے۔ انسان جس قدر ان صفات کو نشوونما دیتا چلا جائے گا اسی قدر اس کی انسانیت مستحکم ہوتی جائے گی۔

(۳) اسلام بتاتا ہے کہ انسانیت کا نشوونما اور زندگی کو ان قوانین کے ماتحت بسر کرنے سے ہو سکتا ہے جو خدائے ربّ العالمین کی طرف سے ملے ہیں۔ ان قوانین کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ یہی حکومتِ الٰہیہ کا ضابطۂ آئین ہے۔ فطرت کے دیگر قوانین کی طرح اس ضابطہ کے قوانین بھی غیر متبدل اور ناقابلِ ترمیم و تنسیخ ہیں اور بلا لحاظ زمان و مکان تمام نوعِ انسانی کے لئے ہیں۔ ان اصولی ضوابط کی روشنی میں ہر زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق فرعی قوانین مرتب کئے جائیں گے اور اس طرح یہ نظامِ زندگی ایک جامد اور ساکن مذہب کے بجائے۔ انسان کی بڑھتی ہوئی

تجربات کے ساتھ ساتھ ہر مقام پر راہ نمائی کرتا جائے گا۔ قرآن ہمارا عقل و بصیرت کو اپیل کرتا ہے۔ اور اس کے علم و شعور کی پرورش چاہتا ہے۔ اس لئے اس میں توہم پرستی یا اندھی تقلید کو کوئی دخل نہیں۔

(۳) اسلام چند افراد کا نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کا عروج و ارتقا چاہتا ہے اس لئے اس کا نظامِ زندگی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ اس کی ہیئت اجتماعیہ کا مرکز خدا کی حاکمیت کا قرار ہے۔ جس جماعت میں یہ نصب العین عملی طور پر متشکل ہوتا ہے اس کا نام ملت اسلامیہ ہے۔ جس کی شیرازہ بندی ختم نبوت کے عقیدہ سے وابستہ ہے۔ یعنی یہ ملت، ملت واحدہ ہوگی۔ مختلف پارٹیوں میں منقسم نہیں ہوگی۔ ختم نبوت کا عقیدہ انسانی عقل و شعور اور فکر و تدبر کے نشو و ارتقا کا بھی حامل ہے۔ وحی کے ذریعے نظام زندگی کے اصول متعین ہو گئے۔ ان اصولوں کے تحت جزئیات کی شکلیں انسانی تفقہ و تدبر کی رو سے ہوں گی۔

(۴) اسلامی ہیئت اجتماعیہ کا معیار، قوت اور عزت کا مدار دولت نہیں بلکہ شرف انسانیت ہے جس میں یہ شرف (استحکام خودی) زیادہ ہوگی وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہوگا۔ دولت اور قوت انسانیت کی نشو و نما کے لئے صرف کی جائے گی۔ افراد یا کسی خاص گروہ کے استبداد و تغلب کا ذریعہ نہیں بن جائے گی۔ اس لئے اسلامی نظام زندگی میں اکتناز کی بھی اجازت نہیں۔ نہ ہی اس امر کی کہ دولت صرف بالائی طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے نیچے کے طبقہ میں آئے ہی نہیں۔ قرآن کریم کی نصوص صریحہ ان امور پر دلالت کرتی ہیں۔

(۵) یہ ہیئت اجتماعیہ۔ جس کی وسعتیں زمان و مکان کی حدود سے محصور نہیں ہوں گی۔ نظام انسانیت کو اپنے ضابطۂ خداوندی کے مطابق چلانے کی ذمہ دار ہوگی اور اس طرح خدا کی بادشاہت بسیط زمین پر قائم ہو جائے گی۔ انسان کو خدا کی مرضی اس کے قوانین کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ سو جب انسان اپنی مرضی کو خدا کے قوانین کے تابع کر لے تو اس کی مرضی عین خدا کی مرضی ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسان ایک طرف مختار بالارادہ اور دوسری طرف مجبور ہوگا۔ مجبور اس لئے کہ اپنے آپ کو ایک آئینی نظام کے اصولوں کے تابع رکھے گا۔ اور مختار اس لئے کہ اس جبر سے جو نتیجہ پیدا ہوگا وہ اسے اس قابل بنا دے گا کہ تمام کائنات کو مسخر کرے۔ استحکام خودی

دگر است آنسوئے نہ پردہ کشادن نظرے	این سوئے پردہ گمان و ظن و تخمین دگر است
اے خوش آن عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست	نور افرشتہ و سوز دل آدم با اوست

اور اس کے بعد فرماتے ہیں ؎

وقت آن است کہ آئین دگر تازہ کنیم
لوح دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم!

یہی "آئین دگر" ہے جسے آج ساری دنیا (New Order) کے نام سے پکار پکار کر ڈھونڈ رہی ہے۔ اس "آئین دگر" کی رہ بتا رہی تھی کہ

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیر جہان دگر است

اُس وقت دُنیا کی نگاہیں تہذیب نو کی تابندگی سے خیرہ ہو رہی تھیں اس لئے وہ "جہان دگر" کو کہاں دیکھ سکتی تھی۔ یہ جہان تو اسے ہی نظر آسکتا تھا جس کی آنکھیں قرآن نے روشن کی ہوں۔ [illegible] اس جہان کو دیکھا اور برملا کہہ دیا کہ ؎

من درین خاک کہن گوہر جان می بینم	چشم ہر ذرہ چو انجم نگران می بینم
دانہ را کہ بآغوش زمین است ہنوز	شاخ در شاخ و برومند و جوان می بینم
کوہ را مثل پر کاہ سبک می یابم	پر کاہے صفت کوہ گران می بینم
انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیر افلاک	بینم و ہیچ ندانم کہ چسان می بینم
خرم آنکس کہ درین گرد سوارے بیند	جوہر نغمہ ز لرزیدن تارے بیند

یہ ہے وہ بصیرت و فراست جو قرآن کریم مسلم کو عطا کرتا ہے۔ کس قدر حسرت انگیز ہے یہ منظر کہ اس مرد حق شناس کو عمر بھر یہ آرزو رہی کہ ؎

(ستمبر ۱۹۵۱ء)

انسان کتنی پُرعظمت ہستی ہے!

اسے عبادت گاہوں میں سر جھکائے دیکھو تو آسمان کے فرشتے اس کی شانِ عبودیت پر نثار ہوتے ہیں اس کی خاک آلودہ پیشانی پر سطوت و ثروت کے ہزار طرہ ہائے کہکشاں گیر قربان ہوتے ہیں۔ اس کے ذوقِ جبین سائی پر جاہ و جلال کی لاکھوں عظمتیں، نازشیں اور شوکت و حشمت کی کروڑوں سلطنت خیزیاں تصدق ہوتی ہیں۔ اس کی جھکی ہوئی نگاہوں کے سامنے حوروں کی معصومیت ہیچ اور اس کے قطراتِ انفعال کے مقابل کوثر و تسنیم کی جر باریاں ناقابلِ التفات۔ اس کا ایک ایک سجدہ زمین و آسمان کو وجد میں لاتا ہے اور اس کے جذبۂ تعبد و تذلل کی مست رعنائی پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ

ترے سنگِ در نے بدل دیے ہیں پستیوں کو فراز میں
کہ ہزاروں عرش جھکا رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اور اگر اسے محبت کے حریمِ تمنا میں دیکھو تو کسی کی یاد میں اس کے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند اپنے بلوریں کٹورے میں بھر لیتا ہے کہ وہ ظلمت کدۂ عالم میں شمعِ کافوری کا کام دیں۔ آفتاب اس کی آتشِ پنہاں سے کچھ حرارت مستعار لیتا ہے کہ اس سے نبضِ ہستی میں تموج پیدا کرے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی تپشِ نفس اور سوز و گداز سے اپنے اندر زندگی محسوس کرتا ہے۔ اس کی آہِ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی اس حقیقت کے آئینہ دار ہوتے ہیں کہ

اپنا آہنی پنجۂ استبداد فریقِ مقابل کے سینے میں گاڑ دیتا ہے اور اپنے دندانِ حرص و آز کو اس کی رگِ جاں میں پیوست کرکے اس کے چشمۂ حیات سے اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس غیظ و غضب کے عالم میں وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ وہ اپنی قوت کے نشہ میں اس قدر بدمست ہوجاتا ہے کہ کوئی معقول بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ دلیل و برہان کا جواب تیغ و سنان سے دینا چاہتا ہے۔ وہ باہمی افہام و تفہیم سے معاملات سلجھانے کی بجائے، فریقِ مقابل کو توپ و تفنگ سے دھمکا کر اپنی بات ماننے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔ وہ کسی کے مشورے کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کسی کی ثالثی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کی ان حرکات پر عقل ہنستی ہے، خرد ماتم کرتی ہے، شرافت شرماتی ہے، انسانیت مارے ندامت کے ڈوبتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اسے ان میں سے کسی کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ عقل و خرد اور شرافت و انسانیت جن جذبات کو پیدا کرسکتی ہے وہ ان سے عاری ہوچکا ہوتا ہے، یا یوں کہئے کہ وہ جذبات، قوت کی بدمستیوں کے نیچے اسی طرح دب جاتے ہیں جس طرح شراب کے نشے سے انسان کے ہوش و حواس پر پردہ پڑ جاتا ہے (کہ خمر کے معنی ہی ڈھانپنے والی شے کے ہیں)

سوال یہ ہے کہ کیا ایسے انسان کو ان حالات میں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جو اس کے جی میں آئے کرے؟ ہمارا خیال ہے کہ دنیا کا بدترین بدترین قانون بھی یہ نہیں کہے گا کہ ہاں! ایسے انسان نما درندے کو کھلا چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ نیستانِ تمدن میں اپنے فتنہ و فساد کی چنگاریاں پھینکتا پھرے اور اس طرح امن عامہ اور فلاحِ انسانیت کو پھونک کر راکھ کا ڈھیر بنا دے۔ انسانی معاشرت کے آئین و ضوابط نے ایسے انسان کے لئے انتظام کر رکھا ہے۔ اگر وہ جنون کی حد تک مختل ہوچکا ہے تو اسے پاگل خانے میں بھیج دیا جاتا ہے اور اگر اس کی عقل و خرد ہی اسے ان فساد انگیزیوں پر ابھارتی ہے تو اسے لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ نوعِ انسانی اس کے دندانِ حرص و آز اور ناخنِ جور و استبداد سے محفوظ رہ سکے۔ پولیس اور عدالت اسی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ایک فرد کے بجائے، ایک قوم (یا مملکت) اس طرح عقلی توازن کھو بیٹھے اور اپنی حقیقی یا مزعومہ قوت کے نشہ میں کسی دوسری قوم یا مملکت کے جائز حقوق کو غصب کرنا چاہے اور اسے جینے تک کا حق نہ دے تو اس کا کیا علاج کیا جائے!

اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس سے وہ قوت چھین لی جائے جو اس کی ان بدمستیوں اور فتنہ انگیزیوں کا باعث بن رہی ہے۔ لیکن قوت، بغیر قوت کے چھینی نہیں جا سکتی۔ ان حالات میں قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ دونوں قوتوں کے اس تصادم کا نام جنگ ہے۔ قوتیں دونوں طرف ہیں۔ لیکن غور کیجئے کہ ایک قوت کس مقصد میں صرف ہو رہی ہے اور دوسری قوت کس مقصد کے لئے!

یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن جنگ کی اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ حکم دیتا ہے۔

قرآن کے نزدیک انسانی زندگی بیش بہا متاع ہے جس کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ وہ اس حفاظت کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ

...من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا (۵/۳۲)

جس نے کسی جان کو قتل کر ڈالا۔ سوا اس حالت کے کہ قتل کی بنا ہو یا ملک میں فساد برپا کرنے والوں کو سزا دی ہو، تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کو قتل کر ڈالا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرتا کہ جب کوئی انسان یا انسانوں کا گروہ (جسے قوم یا مملکت کہا جاتا ہے) وحشت اور درندگی کے اس مقام تک جا پہنچے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور اس کی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو، نوعِ انسانی کی بہبودِ کلی کے لئے، اس انسانیت کے مجرم انسان یا قوم کے خلاف قوت استعمال کرنا اسی طرح (طوعاً و کرہاً) ناگزیر ہو جاتا ہے جس طرح جب کسی انگلی کا ناسور یکسر

متاثر ہو جائے اور اس کا زہر باقی حصۂ جسم کو بھی موت کی طرف لئے جا رہا ہو، تو باقی جسم کو اس زہر سے بچانے کے لئے اس زہر آلود انگلی کا کاٹ کر الگ کر دینا نہ صرف جائز بلکہ جسم کی بہبودی کے لئے لازمی ہو جاتا ہے۔ اگر اس وقت ایسا نہ کیا جائے تو کچھ وقت کے بعد پورے کا پورا جسم مسموم ہو کر قبر میں جا پہنچے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ انگلی بھی ختم ہو جائے گی جسے کاٹ کر الگ نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی پہلے تو صرف ناکارہ انگلی ہی سے خطرہ تھا لیکن اب انگلی کے ساتھ پورا جسم بھی تباہ ہو گیا۔

انسانی معاشرے کو اس قسم کے زہر سے متاثر کرنے کا نام قرآن کی اصطلاح میں فتنہ و فساد ہے جسے وہ (انگلی اور جسم والی مثال کے مطابق) قتل سے بھی زیادہ نقصان رساں اور تباہ کن قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اس کا ارشاد ہے کہ الفتنۃ اشد من القتل۔ یعنی فتنہ و فساد جنگ سے بھی زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ لہٰذا فتنہ و فساد کے استیصال کے لئے قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یعنی فتنہ برپا کر دینے والی قوت کو زیر کرنے کے لئے قوت کا استعمال، تاکہ انسانی معاشرہ اس کی شر انگیزیوں سے محفوظ رہے۔ غور کیجئے قرآن نے اس حقیقت کو کیسے جامع و بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ قوت صرف اس وقت تک استعمال کرنی چاہیئے جب تک وہ شر انگیز اور فتنہ پرور قوت سپر انداز نہ ہو جائے حتیٰ تضع الحرب اوزارھا (۴۷/۴) یہاں تک کہ خود جنگ اپنے ہتھیاروں کو پھینک دے۔ یعنی جس مقصد کے لئے یہ جنگ ناگزیر ہو گئی تھی وہ مقصد حاصل ہو جائے اور انسانی معاشرہ سرکش قوتوں کی فساد انگیزیوں سے محفوظ ہو جائے۔ چونکہ اس تمام عمل میں کسی انتقام یا غصہ کو دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ کارروائی ایک ناگزیر ضرورت کی بنا پر ہوتی ہے اس لئے قرآن نے یہ بھی فرما دیا کہ جونہی اس سرکش قوت کے متعلق دیکھو وہ اپنی تخریبی روش ترک کر کے آمادۂ صلح ہو رہی ہے [illegible] اپنے ہاتھ روک لو [illegible] کہ اس کارروائی کے دوران میں بھی نگاہ اس مقصد کی طرف رہے جس کی خاطر یہ [illegible] کیا گیا ہے یعنی قوت کی سرکشی کو درست کرنے کی طرف۔ اسی لئے قرآن [illegible] ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہے۔

کسی بوڑھے کو، بچے کو اور عورت کو قتل نہ کرو (ابوداؤد)۔ اسی طرح غیر محارب غیر جنگ جو آبادی کو بھی ناحق تنگ کرنے کی بھی ممانعت فرمادی۔ ابوداؤد میں حضرت انس جہنیؓ سے روایت ہے کہ میں کسی غزوہ میں حضورؐ کے ساتھ تھا۔ لشکریوں نے فریق مقابل کے پڑاؤ پر جاکر انہیں تنگ کیا، لوٹا، مارا۔ حضورؐ نے فوراً منادی کرادی کہ جو شخص غیر محارب آبادی کے گھروں میں گھس کر انہیں تنگ کرے یا لوٹ مار کرے اس کا جہاد مقبول نہیں۔ اس طرح کی لوٹ کھسوٹ کا مال بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ ابوداؤد میں ایک انصاری کا بیان ہے کہ ہم حضورؐ کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے لوگوں کو بھوک نے ستایا تو انہوں نے کچھ بکریاں لوٹ کر انہیں ذبح کرلیا اور گوشت کی ہنڈیاں چڑھا دیں۔ حضورؐ کو خبر ملی تو آپ تشریف لائے اور جو کمان ہاتھ میں تھی اس سے سب ہانڈیاں الٹ دیں اور فرمایا کہ لوٹ کی چیز مردار سے بھی بڑھ کر حرام ہے۔ اسی طرح دشمن کے قاصدوں سے کبھی بدسلوکی نہیں کی جاتی تھی۔ اسیران جنگ سے مہمانوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ جب حضورؐ نے اسیران بدر کو صحابہؓ کے حوالے کیا ہے تو تاکید فرمادی کہ انہیں کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ صحابہؓ خود تو کھجوروں پر گزارہ کرتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ اسیران جنگ کے علاوہ دشمن کا جو آدمی مسلمانوں سے پناہ طلب کرتا اس کی پوری پوری حفاظت کی جاتی تھی۔ یہ سب اس لئے کہ جنگ سے مقصود انتقام جوئی یا ہوس خون آشامی کی یا حرص الارض کی تسکین نہ تھی بلکہ انسانی معاشرے میں آئین عدل و احسان کا قیام تھا۔ اس حقیقت کو حضورؐ نے نہایت جامع لفظوں میں بیان فرمایا تھا۔ جب حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ کوئی شخص غنیمت کے لئے، کوئی نام کے لئے، کوئی اظہار شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے۔ کس کا جہاد راہ خدا میں سمجھا جائے گا؟ حضورؐ نے فرمایا کہ صرف [illegible] لتکون کلمۃ اللہ العلیا۔ جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا قانون غالب رہے اس کا لڑنا جہاد ہے۔ اسی بات کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ویکون الدین کلہ للہ

ہم بتا چکے ہیں کہ قوت کے استعمال کی نوبت اس وقت آئے گی جب باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے

تصفیہ معاملات اور مصالحت کی تمام کوششیں ناکام رہ جائیں۔ سوال یہ ہے کہ جب دو افراد کے درمیان جھگڑا یا اختلاف ہو تو عدالت ایک حکم (ثالث) کی حیثیت سے فیصلہ دیتی ہے جس سے وہ جھگڑا طے ہو جاتا ہے۔ لیکن جب یہ جھگڑا یا اختلاف دو قوموں کے درمیان ہو تو اس وقت کیا کیا جائے؟

قرآن نے اس ضرورت کو بھی سمجھ لیا تھا اس لئے اس کا حل بتا دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ دنیا میں کسی ایک جماعت کا وجود نہایت ضروری ہے جو تمام اقوام عالم کی نقل و حرکت اور اعمال و کردار کا محاسبہ کرتی رہے اور اختلافی مواقع پر باہمی طے شدہ آئین و ضوابط کے مطابق فیصلے کرے اور ان کی خلاف ورزی کے اقدامات کو روکے۔ (تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر) قرآن نے اس جماعت کا نام امت مسلمہ رکھا تھا یعنی دنیا میں امن و سلامتی کی ضامن جماعت اور اس کی خصوصیت یہ بتائی تھی کہ وہ اپنے اس فریضہ محاسبہ اعمال امم میں اس انداز سے جادۂ حق و عدل پر قائم رہے گی کہ دنیا کی ہر قوم اس سے برابر کے فاصلے پر (Equidistant) ہوگی۔ اس خصوصیت کی حامل قوم کو عربی الفاظ میں امت وسطی کہتے ہیں۔ چنانچہ اس جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن نے کہا تھا کہ

وکذالک جعلنکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا

اس طرح ہم نے تمہیں "امت وسطیٰ" بنایا ہے تاکہ تمام نوع انسانی کے اعمال و کردار کے نگران رہو اور تمہارے اعمال و کردار کا نگران مرکز نظام خداوندی ہو

ظاہر ہے کہ اس فریضہ کو سرانجام دینے والی جماعت کے پاس اتنی قوت ہونی چاہیئے کہ وہ نہ صرف اپنے آپ کو محفوظ و مامون رکھ سکے۔ بلکہ دیگر اقوام سے اپنے فیصلوں کو منوا بھی سکے۔ جس عدالت کی پشت پر قوت نافذہ نہ ہو۔ اس کے فیصلے قانون کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے، محض وعظ بن کر رہ جاتے ہیں۔ دین اور مذہب میں یہی فرق ہوتا ہے۔ مسلمان صدیوں سے دین سے محروم ہو چکا ہے۔ اور مذہب کے فریب میں مبتلا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نہ صرف یہ خود ہی نکبت

زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور دنیا کی ہر متغلب قوت کے سامنے سپر انداز ہے بلکہ اس کی وجہ سے دنیا "امت وسطیٰ" سے بھی محروم ہو چکی ہے جس کا فریضہ "شہداء علی الناس" تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری دنیا فتنہ و فساد کا جہنم بن چکی ہے۔ سرکش اور بے باک قوتیں جو چاہتی ہیں وہی ہوتا ہے اور کمزور کے لئے رونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ چونکہ دنیا میں امت وسطیٰ کا وجود نہیں رہا اس لئے "شہداء علی الناس" کا فریضہ "کفن چور وں" کے سپرد ہو چکا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ جہاں خدا کا قانون عمل پیرا نہیں ہوتا وہاں ابلیسی نظام کی بساط بچھ جاتی ہے، کیونکہ

خلا محال ہے فطرت کے کارخانے میں

یہ وجہ ہے کہ وہ امت جسے امت وسطیٰ بننا تھا، اپنے فریضہ کو فراموش کر کے نہ صرف اپنے جرائم ہی کی سزا بھگت رہی ہے بلکہ دنیا بھر کے جرائم کی پاداش میں بھی بالواسطہ شریک ہے۔ سو جانے والے چوکیدار کے نہ صرف اپنے کپڑے ہی چوری جاتے ہیں بلکہ وہ صبح اٹھ کر محلہ والوں سے پٹتا بھی ہے۔

لیکن اگر وہ صرف سویا ہوا ہی ہے، مر نہیں چکا، تو اس کی بھی امید کی جا سکتی ہے کہ وہ چوروں کی آہٹ پا کر اٹھ بیٹھے اور اس طرح اپنی متاع بھی محفوظ کر لے اور جن کی حفاظت اس کے سپرد تھی ان کی متاع حیات بھی محفوظ رہے۔

خدا کرے کہ ہم زمانے کے تھپیڑوں سے جاگ اٹھیں اور ہمارے جاگنے سے چور بھاگ جائیں اور شریف انسان اطمینان کی نیند سوئیں۔

(اپریل سنہ ۱۹۴۱ء)

۲۲ / ۲۳ فروری سنہ ۱۹۴۱ء کو مجلس تاریخ و تمدن کی دعوت پر۔ دارالعلوم علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ وقت بہت کم تھا اور مشاغل بہت زیادہ۔ بایں ہمہ ایک سرسری سی نگاہ سے جو کچھ وہاں دیکھ سکا اس سے یہ اندازہ لگایا کہ قوم کے نوجوانوں میں قرآن کریم کی طرف ایک خاص رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ اور اگر انہیں قرآن کی صحیح تعلیم سے روشناس کرا دیا جائے تو ان سے بہت سی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ طلباء اور حضرات اساتذہ کے اجتماع میں پڑھا گیا۔

(پرویز)

کائنات کی ہر شے ایک مقررہ قانون کے ماتحت سرگرم عمل ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ریت کے ذرہ سے لیکر عظیم الشان سیاروں تک۔ اس کرۂ ارض کی ہر شے غیر متبدل قانون کی پابند ہے اور پھر اس نظام شمسی جیسے بے تعداد اور لا تعداد اجرام سماوی۔ سب ایک متعین قاعدہ کے مطابق اپنے فرائض منصبی کی تکمیل میں سرگرداں ہیں۔ اگر زمین اپنے راستہ سے کبھی ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹ جائے۔ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی بھی تبدیلی کر لے۔ اگر ہوائیں بادلوں کو مزرعۂ چمن کے لئے خلاف قاعدہ بدل دیں۔ اگر پانی اپنی فطرت کے خلاف نشیب کی بجائے فراز کی طرف بہنے لگ جائے۔ غرضیکہ اس مشینری کا کوئی ایک پرزہ اپنے فرائض سے روگردانی اختیار کر لے۔ تو یہ عظیم الشان کائنات ایک لمحہ میں درہم برہم ہو جائے اور یہ حیرت خیز کارگہ حیات ہستی کا گھروندا بن کر رہ جائے۔ زندگی اور اس کی تمام رنگینیاں۔ دنیا اور اس کی تمام مسرت آفرینیاں

محض اس بنا پر قائم ہیں کہ فطرت کی ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس حیرت خانہ امروز و فردا کا ہر ایک ذرہ اپنے دائرہ عمل میں پوری مستعدی سے مصروفِ عمل ہے وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ہر شے اس کے احکام کے سامنے سجدہ ریز ہے کُلٌّ لَّہٗ قَانِتُوْنَ

ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے

جب عالم موجودات کی ہر شے اس محکم اور غیر متبدل قانون پر عمل پیرا ہے تو کیا انسان جو اس خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے جو نقشِ کائنات کا حسین مقطع ہے۔ وہ اس قانون سے مستثنیٰ ہو گا؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بزمِ سخن میں ہر شعر عروض و قوافی کی حدود و قیود سے گھرا ہوا ہو۔ لیکن حاصلِ مشاعرہ ربط و ضبط کی ان پابندیوں سے آزاد ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ بیج سے لے کر کونپل تک درخت کا ایک ایک حصہ اپنی زندگی کے ہر مرحلہ میں قاعدے اور قانون کا پابند ہو۔ لیکن پھل ہر اصول سے بے نیاز ہو! ایسا نہیں ہو سکتا۔ جب کائنات

قانون کی اطاعت

کی ہر شے ایک خاص نہج اور اسلوب کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے تو انسان کے لئے بھی ضروری ہے کہ ایک خاص قانون کے مطابق زندگی بسر کرے۔ وہ قانونِ حیات جس کے مطابق انسان کو زندگی بسر کرنی چاہئے تقاضائے فطرت ہے۔ اسلام کہتا ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ
الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۰)

خدا کا وہ قانونِ تخلیق جس کے مطابق اس نے نوعِ انسانی کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی دینِ محکم ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

لیکن انسان اور فطرت کی دوسری چیزوں میں ایک بین فرق ہے۔ دیگر اشیائے فطرت اس قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جو ان کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ انہیں اس قانون کی تعمیل و عدمِ تعمیل میں کوئی اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ انہیں جو حکم دیا گیا ہے اس میں انہیں مجالِ سرتابی نہیں، یارائے سرکشی

نہیں۔ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ لیکن برعکس اس کے انسان کو اس معاملہ میں اختیار وارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اسے آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو فطرت کے اس

انسانی اختیار وارادہ

متعینہ ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس کی خلاف ورزی کرے اسے زندگی کے دوراہے پر کھڑا کر دیا گیا ہے جہاں نہایت جلی حروف میں سائن پوسٹ نصب ہیں۔ سامنے عقل وفکر اور شعور وادراک کی شمعیں فروزاں ہیں جن کی روشنی میں یہ سائن پوسٹ پڑھ کر دونوں راستوں میں تمیز کر سکتا ہے اس کے بعد اسے اختیار دیدیا گیا ہے کہ جس راہ پر چاہے گامزن ہو جائے۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا(۱) اختیار وارادہ کا یہی امتیاز ہے جس سے انسان دیگر مخلوقِ کائنات کے مقابلہ میں شرف و علیٰ ہے۔ یہی قوتِ تمیز اس کی سرفرازی و سربلندی کا باعث ہے۔ اسی سے یہ مسجودِ ملائک و مخدومِ خلائق ہے۔ کشمکشِ حیات میں پُرکیف جاذبیتیں ہیں تو اسی سے اور کشاکشِ زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ بربطِ ہستی کے تاروں میں خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں تو اسی مضراب سے اور جامِ زندگی کے سادہ پانی میں کیف رنگ و تعطّر کی ارغوانی موجیں اٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے۔ سینۂ کائنات میں یہ دھڑکنے والا دل ہے تو اسی کے تموّج سے۔ اور اگر اس دل میں مچلنے والی آرزوؤں کی رسیلی بجلیاں ہیں تو اسی کے تحرک سے۔ غرضیکہ انسان، انسان ہے تو اسی کی بدولت۔ اور یہ دنیا، دنیا ہے تو اسی کے دم سے۔

اگر اختیار وارادہ نہ ہوتا تو انسان پتھر کا بت ہوتا۔ یا زیادہ سے زیادہ فرشتہ۔ مسجودِ ملائک اور مسخّرِ کائنات کبھی نہ ہوتا۔ قصۂ آدم کا پہلا باب اسی اختیار وارادہ کے مظاہرہ سے شروع ہوتا ہے جو معصیتِ آدم کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھتے ہوئے عمل میں آئے۔ اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود سرزد ہو۔ نیازمندی اسی کی قابلِ ستائش ہے جو خود سرِ پندار ہو۔ اسی سر کے جھکنے میں لذت ہے جس کی پیشانی میں دنیا بھر کی سرفرازیاں جھک رہی ہوں۔ جس میں تمرّد کی قوت نہیں، اس کے عجز میں کیا خوبی ہے جس میں ہمسری کی ہمت نہیں اس کا جھک کر سجدہ کرنا خوئے غلامی

جس کے پاؤں کے نیچے تختِ حکومت نہیں۔ اس کا بوریہ نشین ہونا گداگری ہے۔ اختیار میں جبر ہی انسانیت کا شرف بنتا ہے۔ اسی سے اس کی خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور استحکامِ خودی ہی انسانیت کی معراج ہے۔ لیکن اگر یہی اختیار و ارادہ آئین و ضوابط کے ساحلوں میں پابند نہ ہو جن کے اندر رہتے ہوئے زندگی بسر کرنا تقاضائے فطرت ہے تو اس دیوِ بے زنجیر کی حدود فراموش خونیں خیزیوں اور قیود ناآشنا سیلاب انگیزیوں کا کیا ٹھکانہ۔ ذرا سوچئے کہ جو انسان کائنات کی ہر شے کو تابع فرمان کر لینے کی امکانی قوتیں اپنے اندر رکھتا ہو اگر وہ اپنی قوتوں کو آزاد چھوڑ دے تو دنیا کن ہولناک بربادیوں کا عبرت انگیز مرقع بن جائے گی!

یورپ کی سرکشی

یہی وہ خلافِ فطرت آزادی تھی جس نے یورپ کے ان میدانوں کو جن کا ہر گوشہ دامانِ باغبان زمینِ گل فروش و حسین نظارہ در آغوش تھا۔ آج آگ اور خون کا ایک جہنم بنا دیا ہے۔ جس میں انسانیت تڑپتی، پھڑکتی، جلتی، بھنتی، سکراتِ موت کی ہچکیاں لے رہی ہے۔ یہ کیوں ہوا اس لئے کہ یورپ نے اختیار و ارادہ کو بیباکانہ سرکشی تو سکھا دی۔ لیکن ع

عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا

جس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

یہ آئین و ضوابط جن کے تحت زندگی بسر کرنا باعثِ شرفِ انسانیت ہے، وحیِ خداوندی کے بغیر کہیں نہیں مل سکتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ آئین و ضوابط انسانی ذات کی بالیدگی کا باعث ہیں تو انہیں کسی خارجی ذریعے سے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ انہیں خود انسان کے اندر ہی کیوں نہ رکھ دیا گیا؟۔ یہ درست ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان کا دل پتھر کا بنا ہوا نہیں جس پر کوئی خارجی شے اثر انداز نہ ہو سکے جس چیز کو عام طور پر انسانی فطرت کہا جاتا ہے ذرا پوچھئے علم تجزیہ نفس Psycho-Analysis

فردوسِ گم گشتہ

کے۔ پھر دیکھئے کہ اس کی کیفیت کیا ہے اور یہ کن خارجی اثرات و رجحانات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ وراثت کے اثرات ماحول کے اثرات۔ بچپن کی تعلیم و تربیت کے اثرات۔ قومی روایات کے اثرات۔ اور آگے بڑھئے تو ان اخلاط کے اثرات جن سے جسم انسانی ترکیب پاتا ہے۔ ان تمام اثرات کے بعد اندازہ فرمائیے کہ اس کے اندر غیر ملوث آواز کہاں باقی رہ سکتی ہے۔ ان اثرات کا تو یہ عالم ہے کہ طبیعی ضروریات میں بھی انسان کی فطرت صحیح راہ نمائی نہیں کر سکتی۔ مثلاً بکری کا بچہ بھوکوں مر جائے گا لیکن کبھی گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گا۔ مرغی کے بچہ پر ہزار آفت آ رہی ہو وہ پناہ جوئی کے لئے پانی کے حوض کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھائے گا۔ لیکن انسان کا بچہ، سنکھیا کے ٹکڑے کو بھی اسی طرح بلا تکلف منہ میں ڈال لے گا۔ جس طرح شکر کی ڈلی کو۔ وہ بلا تامل آگ میں ہاتھ ڈال دے گا۔ پانی کے حوض کی طرف لپک کر جائے گا۔ آپ کو قدم قدم پر اس کی حفاظت کرنی پڑے گی۔ سو جس متاثر "فطرت" کی آواز کا یہ عالم ہو کہ حیوانی ضروریات میں بھی صحیح راہ نمائی نہ کر سکے۔ اسے انسانی ضروریات کے لئے کافی سمجھ لینا وہی نتائج پیدا کرے گا جو آج یورپ میں ہو رہے ہیں۔ انسان کی راہ نمائی صرف اس مقام سے ہو سکتی ہے جو ان تمام خارجی اثرات سے بلند و بالا ہو اور اس کا تعین وہی ذات کر سکتی ہے جو انسانی جذبات و رجحانات اور میلان و عواطف سے منزہ و مبرا ہو۔ یہ مقام، مقامِ وحی اور یہ ذات، ذاتِ خداوندی ہے۔

مقامِ وحی

وہ ذات جسے انسانی ذات کے خالق ہونے کی حیثیت سے خوب معلوم ہے کہ کس قسم کے آئین و ضوابط اس کے مطابق ہیں اور کن چیزوں سے اسے روکنے کی ضرورت ہے (رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى) اس لئے جب انسان کو اس عالمِ اثرات و جذبات میں بھیجا گیا۔ کشمکشِ حیات اس کے لئے مقدر کی گئی۔ تو ساتھ ہی یہ انتظام بھی کر دیا کہ اس کی صحیح راہ نمائی کے لئے اسے آسمانی ہدایت بھی ملتی رہے۔ اس کے بعد اس سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ اگر اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرتے رہو گے تو تمہیں کسی قسم کا خوف و خطر نہیں ہو گا۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

انسان مدنی الطبع ہے

علاوہ ازیں انسان اور دیگر مخلوق کے اسلوبِ زندگی میں ایک نمایاں فرق اور بھی ہے۔ باقی مخلوق کی زندگی انفرادی ہے۔ ایک کے اعمال کا دوسرے پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ایک کو دوسرے سے کچھ لمبا چوڑا واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اسے مل جل کر زندگی بسر کرنا ہے۔ اس لئے انسانوں کے مقاصد مشترک ہیں اُن کے معاملات باہم گر پیوستہ ہیں یہاں ایک کے اعمال سے قوم کی قوم اثر پذیر ہو جاتی ہے۔ اگر ایک مستبد قوت برسرِ اقتدار آ جائے تو کروڑوں انسانوں پر جہنم کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔ اور اس کے خلاف اگر ان کے مقدرات کسی صاحبِ دل و نیک انسان کے ہاتھ میں آ جائیں تو یہی جہنم جنت سے بدل جاتی ہے۔ یہاں ایک بداخلاق دق کے جراثیم کی طرح پوری کی پوری سوسائٹی کو ہلاکت و بربادی کے نشیب غار میں دھکیل سکتا ہے اور نیک خو انسان، نرگس و لالہ کی طرح ساری محفل کو جہانِ رنگ و بو میں تبدیل کر سکتا ہے۔ یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہزاروں زیر دست انسانوں کے خون کی رنگینی کسی ایک بالادست کے عشرت کدہ کی زیبائش و آرائش کے کام میں لائی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک کی قوتِ بازو لاکھوں کی روزی کی کفیل ہو جائے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ایک کی ہوسِ ستم رانی سے ہزاروں بے گناہ سینے گولیوں کا نشانہ بن جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک کی سپر لاکھوں مظلوموں کے لئے کاشانۂ امن بن جائے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت انسانوں کے لئے صرف وہی ضابطۂ حیات وجۂ امن و سکون اور باعث کامیابی و کامرانی ہو سکتا ہے جس کا دائرۂ عمل، افراد تک محدود نہ ہو بلکہ اس کے پیشِ نظر حیاتِ اجتماعیۂ انسانیہ کی اصلاح ہو۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ افراد کی اصلاح بھی اس لئے کرے کہ جو سوسائٹی ان کے مجموعہ سے متشکل ہوگی وہ از خود اصلاح یافتہ ہو جائے گی۔ وہ مختلف پرزوں کا جائزہ لے۔ ان کے نقائص کو دور کرے تاکہ جو مشین ان کے نظم و نسق اور تدوین و ترتیب سے تیار ہو وہ از خود صحیح و بے خلل ہو۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب انسان کے راستے میں اس قدر خارجی اثرات اور اتنی مخالف قوتیں حائل ہیں تو

انسانوں کی ہدایت کے لئے محض ایک ضابطۂ قوانین ہی کافی نہ ہوگا۔ بلکہ اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے قوت بھی درکار ہوگی۔ کیونکہ قانون بلا قوتِ نافذہ ایک کتاب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تعزیراتِ ہند ہندوستان کے اندر ایک زندہ قانون ہے اس لئے کہ اس کے پیچھے ایک قوتِ نافذہ موجود ہے۔ لیکن یہی ضابطۂ قوانین، سرحد کے آزاد قبائل میں ایک عام کتاب ہے کیونکہ وہ علاقہ اس قوتِ نافذہ کے احاطہ سے باہر ہے۔ اس لئے قانون وہی زندہ کہلا سکتا ہے جس کے ساتھ قوتِ نافذہ بھی موجود ہو۔

قانون کے ساتھ قوت

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

لہذا جس خلاقِ فطرت نے انسانی رشد و ہدایت کے لئے ضابطۂ قوانین عطا فرمایا، اس نے یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ اس قانون کی تنفیذ و ترویج کے لئے قوت کی بھی ضرورت ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۖ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝

یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین (کتاب) اور میزان عدل نازل کی تاکہ نوعِ انسانی توازن پر قائم رہے اور ہم نے ان چیزوں کی حفاظت کے لئے (فولاد کی شمشیر بھی نازل کی۔ جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے منفعت تاکہ اللہ یہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی غائبانہ مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ صاحبِ قدرت و تدبیر ہے۔

اس ضابطۂ قوانین کا نام ہے ہدایتِ خداوندی اور اس قوتِ نافذہ کا نام حکومتِ الٰہیہ۔ اس ضابطۂ حیات اجتماعیہ کی رو سے انسان دو جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ جو اس سوسائٹی کے ممبر بن جائیں جو ذہنیت

قوانینِ خداوندی کے نفاذ کی ذمہ دار ہے۔ اور دوسرے وہ جو اس کے ممبر نہ ہوں۔ آپ ایک سوسائٹی بناتے ہیں۔ اس کے قوانین و ضوابط مرتب کرتے ہیں۔ اب ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے قواعد و ضوابط کا بغور مطالعہ کرے۔ اس کے بعد جی چاہے تو اس سوسائٹی کی ممبری (رکنیت)

دو جماعتیں

قبول کرے اور جی چاہے تو نہ کرے۔ اس پر کوئی جبر نہیں۔ لیکن جب آپ اس کی رکنیت قبول کر لیتے ہیں تو اس کے بعد آپ پر لازم آجاتا ہے کہ اس سوسائٹی کے تمام قواعد و ضوابط کی اتباع کریں۔ آپ کو یہ اختیار کبھی نہیں دیا جا سکتا کہ جس قاعدے کی جی چاہے اتباع کریں اور جس کی جی چاہے مخالفت کریں۔ جب تک آپ اس سوسائٹی کے ممبر ہیں آپ کو تمام و کمال قواعد و ضوابط کی اطاعت کرنی ہوگی۔ اگر آپ ایسا نہیں کرنا چاہتے تو رکنیت سے مستعفی ہو جائیے۔ اب رہے وہ جو اس سوسائٹی کے ممبر نہیں۔ سو ان پر ان قواعد و ضوابط کا تمام و کمال اطلاق نہیں ہوگا۔ لیکن چونکہ یہ مجموعہ قوانینِ حیاتِ اجتماعیہ انسانیہ کی اصلاح کے لئے مرتب کیا گیا ہے اس لئے جن امور کا تعلق عام انسانیت سے ہے ان سے متعلقہ قوانین کا اطلاق ان پر بھی ہوگا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک سوسائٹی تپ دق کی روک تھام کے لئے متشکل ہوتی ہے۔ کچھ قواعد و ضوابط تو ایسے ہوں گے جن کا اطلاق صرف اس سوسائٹی کے اراکین پر ہوگا۔ لیکن اس مرض سے متعلقہ امور کے حفظانِ قوانین کا اطلاق ممبر اور غیر ممبر دونوں پر ہوگا۔ دق کے جراثیم جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے، ان کے استیصال کے لئے ان ضوابط کے ماتحت ضروری کارروائی کی جائے گی۔ اور ان قوانین کا نفاذ کبھی جبر نہیں کہلائے گا۔ یہ ایسا ہی جبر ہے جیسا ایک ڈاکٹر

قانون کا نفاذ

کسی مریض پر آپریشن کرنے میں "زبردستی" کرتا ہے۔ اسے کوئی صحیح العقل زبردستی نہیں کہہ سکتا۔ اگر کسی اندھے کو کنوئیں میں گرنے سے روک لینا اس پر زیادتی نہیں۔ کسی بچے کے ہاتھ سے بجر چاقو چھین لینا اس پر ظلم نہیں۔ کسی خودکشی کرنے والے کو گرفتار کر کے اس سے اس کے اس اختیار کو سلب کر لینا ناانصافی نہیں۔ تو مفاد پرست گروہ کی مسخ شدہ ذہنیت کو راہِ راست پر لانے کے لئے قوانینِ صحیحہ کا نفاذ

بھی جور و تعدی نہیں کہلا سکتا۔ بالخصوص اس لئے کہ اخلاقی قوانین کے خلاف ورزی کے نتائج، قوانینِ
طبعی کی طرح ایسے محسوس اور بدیہی نہیں ہوتے کہ انسان اس سے از خود اجتناب کرنے لگ جائے۔ مثلاً
انسان کی زندگی کا مدار سانس پر ہے ذرا اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے منہ اور ناک بند کر لیجئے
خود بخود سمجھ میں آ جائے گا کہ اس معصیت کوشی کا نتیجہ کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو
یہ بھی اسی طرح خلاف قانونِ فطرت ہے جس طرح سانس روک لینا۔ لیکن اس معصیت کا نتیجہ محسوس طور پر
اس کے سامنے نہیں آتا۔ وہ اس سے کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ بایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ وہ محسوس کرے
یا نہ کرے۔ اس کا نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا۔ یہی وہ نتائج ہیں جن کا مجموعی اثر غیر محسوس طور پر، انسان کی تمدنی
عمرانی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی، سیاسی غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کر دیتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ
ان کی حیاتِ اجتماعیہ کو اسی قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ اس لئے تقاضائے عدل و انصاف یہی ہے
کہ انسانوں کو اس معصیت کوشی سے روکا جائے جس کے اثرات اس قدر دور رس اور عالمگیر ہوں۔ یہ ان
کے اختیارات کو کچل دینا نہیں ہوگا، فقط ان کی تحدید ہوگی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نظامِ معاشرہ تحدید ہی سے
قائم رہ سکتا ہے۔ اگر کسی کا پاؤں زہر آلود ہو جائے تو اس کی پنڈلی کو ایسا کس کر باندھ دیا جاتا ہے جس
سے اوپر کا حصہ اس زہر کے اثر سے فی الجملہ محفوظ ہو جائے اور اگر ڈاکٹر دیکھے کہ زہر کا اثر اس سے بھی نہیں
رکتا اور اندیشہ ہے کہ اس سے رفتہ رفتہ باقی حصۂ جسم بھی متاثر ہو جائے گا تو وہ جسمِ انسانی کے کلی
مفاد کی خاطر پاؤں کاٹ ڈالتا ہے۔ یہی وہ تحدید و تادیب ہے جس سے حیاتِ اجتماعیہ انسانیہ
خلافِ انسانیت اعمال کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ اور یہ تحدید اسی صورت میں ممکن ہے
کہ قانون کے ساتھ قوت نافذہ بھی موجود ہو۔ اس قوت نافذہ کی اطاعت کسی غیر کی غلامی نہیں بلکہ نفسِ انسانی
کے اعلیٰ ترین رجحانات کی اطاعت ہوگی۔ یہ کسی انسان کے سامنے جھکنا نہیں ہوگا جس سے انسانی خودی
کا آئینہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ بلکہ قوانینِ الٰہیہ کی اطاعت ہوگی جس سے خودی کا استحکام ہوتا ہے۔

جبر و اطاعت کی اس ہم کو پیشِ نظر رکھئے اور اس کے بعد دیکھئے کہ اصلاحِ انسانیت کا یہ نظام کس
انداز سے قائم کیا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رشد و ہدایت کا سلسلہ قائم کیا تو اس کے ساتھ ہی یہ التزام
بھی کر دیا کہ جس جماعت کے ہاتھوں اس کے قوانین کا نفاذ ہو، انہیں خلافتِ الٰہی

قرآن اور قوت

سے بھی سرفراز کیا جائے تاکہ اس ضابطۂ الٰہی کو ایک زندہ قوت کی حیثیت
حاصل ہو۔ یہ محض نظری مسائل کا مجموعہ بن کر نہ رہ جائے۔ قوت اس قانون کی محافظ ہو، اور قانونِ خداوندی
اس قوت پر ایسا ضبط اور (Gontrol) رکھے کہ یہ کہیں ناجائز استعمال نہ ہو سکے۔ قرآن اور قوت
نہ صرف لازم و ملزوم ہیں بلکہ ایک دوسرے کے محافظ بھی ہے

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائنات زندگی را محور اند

اگر آپ قرآنی حقائق پر غور فرمائیں یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ خدائے حی و قیوم کا وہ ازلی پیغام
جو حضرات مامورین من اللہ کی وساطت سے دنیا میں آتا رہا اس باب میں اس کا شروع سے ایک ہی اسلوب
اور ایک ہی لائحہ عمل رہا یعنی وہ ان عیوب و نقائص کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو انسانوں میں دولت
و قوت کی زیادتی اور ان کے غلط استعمال سے پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف ضعیف و ناتواں لوگوں کو
ابھار کر انسانیت کی بلند ترین سطح پر لاتے رہے اور اس کے ساتھ ہی انہیں ایسی حیات پرور تعلیم کی طرف متوجہ
کرتے رہے جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں یہ عیوب پیدا نہ ہوں جو قوت کے غلط استعمال سے لازمی طور پر پیدا
ہو جاتے ہیں وہ تو ہمیشہ سے منہ موڑنے والے انسانوں سے قوت چھین کر ان لوگوں کو دے دیتے تھے جو اس کا
استعمال قوانینِ خداوندی کے مطابق کریں اور اس طرح دنیا میں نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کا نظام قائم
ہو جائے۔ بس یہ ہے خلاصہ اس تعلیمِ فطرت کا جو انسانوں کی ہدایت کے لئے زمین پر بھیجی جاتی رہی۔ اور
جس پر عمل پیرا ہونے کا نام دنیا کی فلاح اور عاقبت کی سرخروئی ہے۔ مہران خداوندی کے۔ دو بیڑے ہیں

جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہیئے۔ نظامِ انسانیت کی گاڑی کے دو پہیے ہیں جو ہمیشہ ہموار اور استوار ہونے چاہئیں آزادیوں کی فضائے بسیط میں اُڑنے والے شاہین کے دو بازو ہیں کہ جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو گیا تو وہ زمین سے نہیں اُبھر سکتا اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی حدیں وہ ہیں جہاں پہنچنے سے قدسیوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرامؑ اور امم سابقہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالیئے۔ یہ حقیقت اُبھر کر آپ کے سامنے آجائے گی۔ زیادہ نہیں تو ایک سورۃ اعراف ہی کو دیکھئے

سابقہ انبیائے کرام

حضرت نوحؑ کے بعد جہاں حضرت ہودؑ۔ حضرت صالحؑ۔ حضرت شعیب علیہم السلام کے سلسلۂ رشد و ہدایت کا ذکر ہے۔ وہاں ان کی اقوام کے متعلق بہ صراحت موجود ہے کہ انہیں سطوت و اقتدار اور حکومت و قوت کی نعمتوں سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ سلسلۂ انبیاء کرام میں حضرت ابراہیم علیہم السلام کا گھرانہ خاص طور پر ممتاز ہے۔ اس مقدس گھرانہ کے متعلق تصریح فرمایا کہ انہیں کتاب و حکمت کے ساتھ "ملکِ عظیم" بھی عطا فرمایا گیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کے تمکن فی الارض کا حیات پرور تذکرہ احسن القصص کے تابندہ عنوان سے قرآن کریم کے صفحات پر جگمگاتا نظر آتا ہے۔ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستان ہی قوت و حشمت اور تمکن و تسلط کی مسلسل تاریخ ہے۔ لیکن یہ تمام سلسلہ کچھ اس انداز سے جاری تھا کہ حضرات انبیاء کرامؑ خاص وقت اور خاص اقوام کے لئے تشریف لاتے کچھ عرصہ کے بعد اُن کا پیغام یا تو بھلا دیا جاتا، یا اس میں الحاق و تحریف کر دی جاتی۔ اس کے بعد پھر ایک نئے ایڈیشن کی ضرورت پیش آجاتی۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ دنیا اپنے عہد شعور کو پہنچ گئی۔ انسانیت پر شباب آگیا۔ اب وہ وقت تھا کہ انسانوں کو ایک مکمل ضابطۂ حیات دے دیا جاتا جو ان کی قیامت تک کی ضروریات کے لئے کافی ہو جاتا۔ اور اس ضابطۂ قوانین کو محفوظ و مصئون رکھا جاتا۔ یہ ضابطۂ قوانین ملا اور اس کے ساتھ ہی اس کی حامل جماعت کو ایسی سطوت و اقتدار کی زندگی عطا ہوئی جس کی مثال امم سابقہ میں کہیں نہیں ملتی قدسیوں کی اس

قرآن

جماعت کے ہاتھوں، خدا کی اس حکومت کا تخت جلال اس زمین پر بچھایا گیا اور ان تمام

بندشوں کے طوق و سلاسل توڑ دیئے گئے جن کے نیچے انسانیت صدیوں سے دبی چلی آتی تھی۔ یہی مشیت کا منشا تھا یہی پیغام خداوندی کا مقصود تھا۔ یہی انسانیت کی معراج تھی۔ اس تکمیل نعمت اور اتمام دین کے بعد نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

رسول اللہ کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبوت ختم ہو جانے کے بعد اس نظام کو آگے چلانے کی کیا صورت اختیار کی گئی جو اس سے پہلے حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے چلایا جاتا تھا۔ فرمایا

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ؕ (۳۵/۳۲)

پھر ہم نے اس کتاب کی وراثت کے لئے اپنے بندوں میں سے ایک جماعت کو منتخب کیا۔

اور وراثت کتاب کے ساتھ ساتھ انہیں حکومت و مملکت کا بھی وارث بنا دیا۔ سورۂ احزاب میں ہے کہ "اس نے تمہیں اہل حق کے دشمنوں کی زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور اُن کے اموال کا مالک بنا دیا۔ اور ان زمینوں کا بھی جہاں ابھی تمہارے قدم نہ پہنچے تھے"۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تصریح فرما دی کہ یہ محض اتفاقی حادثہ نہ تھا جس سے تمہیں شوکت و سطوت مل گئی بلکہ یہ ہمارا ٹھیرایا ہوا قانون ہے۔ یہ سورۂ نور میں ہے کہ جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور اعمال صالحہ کریں، اللہ نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انہیں اس زمین کی حکومت عطا فرمائیگا جس طرح ان سے پیشتر اس نے ان شرائط کو پورا کرنے والوں کو، حکومت عطا فرمائی تھی۔ اور ان کے اس دین کو جو ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے، متمکن کر دے گا۔ اور ان کا خوف امن سے بدل دے گا۔ تاکہ وہ صرف اللہ ہی کے محکوم ہوں اور اس کی حکومت میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ وارثین کتاب کی جماعت کا فریضۂ حیات کیا ہوگا؟ فرمایا

كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ

بایں ہمہ اس کے ثبوت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت ہی نہ پڑے کہ اسلام نام ہی جماعتی زندگی کا ہے۔ اجتماعی زندگی سے بغیر اسلام کا تصور ہی غلط ہے۔ لہٰذا ایک دیدۂ بینا کے لئے خون کے آنسو رونے کا مقام وہ نہیں جہاں امتِ مسلمہ کی لٹی ہوئی عظمت اور چھنی ہوئی شوکت کی یاد آئے۔ بلکہ وہ مقام ہے جہاں سے یہ نظر آئے کہ اسلام جیسا حیاتِ اجتماعیہ کا مذہب کس طرح محض انفرادی اصلاح کا نظریہ تصور کر لیا گیا۔

پس چہ باید کرد

جب ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام نام ہی اجتماعی زندگی کا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن ناسازگار حالات میں ہم گرفتار ہیں، ان کے پیشِ نظر کیا ہم مایوس ہو جائیں اور سمجھ بیٹھیں کہ اب کوئی فرشتہ ہی آسمان سے اترے تو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہو سکے؟ یہ خیال بڑا غلط اور حقائق سے چشم پوشی پر مبنی ہوگا۔ اسلام جن تین عناصرِ ترکیبی سے مرکب ہے، ان میں سے ایک اور سب سے اہم عنصر ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ یعنی ضابطۂ خداوندی جسے قرآن کریم کہا جاتا ہے وہ ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطے کے ساتھ اسی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے جس میں اسے اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا تھا۔ اس ضابطۂ الٰہی کی موجودگی میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسری قومیں اس لئے گرفتارِ انحطاط ہوئیں کہ ان سے ہدایتِ خداوندی گم ہو چکی تھی۔ ہماری حالت ان سے اس باب میں مختلف ہے۔ جس حالت میں ہم آج گرفتار ہیں، قرآن کریم اس کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وراثتِ کتاب کی وہ آیۂ جلیلہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے پوری آیت یوں ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ
مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۳۵/۳۲)

پھر ہم نے وراثتِ کتاب سے اپنے بندوں میں سے ایک جماعت کو منتخب کیا۔ ان کے تین مدارج ہو گئے۔ ایک اپنے آپ پر ظلم کرنے والے۔ ایک درمیانی روش والے۔ اور ایک

اللہ کے حکم سے نیکیوں میں سبقت کرنے والے۔

یہ فَظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ کا زمرہ وہی ہے جس سے ہم آج گزر رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کیا وہ لوگ جو اپنے آپ پر ظلم کر لیتے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو جاتے ہیں؟ کیا وہ زندگی سے ابدی طور پر محروم کر دیئے جاتے ہیں؟ کیا ان کے لئے مایوسیوں کی ظلمت ناک گھٹاؤں میں امید کی کوئی کرن باقی نہیں رہتی؟ قرآن سے ان سوالات کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اس جنت ارضی سے نکال دیئے گئے جو ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ تھی۔ اس کیفیت کو قرآن کریم قصۂ آدم میں اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے۔ آدم اپنی لغزش کی وجہ سے جنت کے مقامِ بلند سے نیچے گرا دیئے گئے۔ جب انہیں اس پستی کا احساس ہوا تو عرض کیا کہ

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اگر تو ہماری لغزشوں کی پردہ پوشی نہ کرے گا تو ہم خاسر و نامراد رہ جائیں گے۔

یہ وہی "اپنے آپ پر ظلم کرنا" ہے جس کا ذکر ابھی ابھی آیۂ وراثتِ کتاب میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ ہاں! یہ چھنی ہوئی جنت دوبارہ مل سکتی ہے۔ اور اس کی بازیابی کا طریق یہ ہے کہ

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے۔ تو جو کوئی اس ہدایت کی اتباع کرے گا انہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔

یہ ہدایت آج ہمارے پاس موجود ہے۔ اس لئے ہم اس جہنم کی پستی سے ابھر کر پھر اسی جنت کی بلندی پر

پہنچ سکتے ہیں جہاں سے ہم گر پڑے تھے۔ آدم کی لغزش، ابلیس کی لغزش نہیں جس میں گر کر پھر ابھرنا نہیں۔ ٹوٹ کر پھر بننا نہیں۔ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ لیکن

آخر گنہ گار ہیں کافر نہیں ہیں ہم!

جب ابدی مایوسی نہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فردوس گم گشتہ کی بازیابی کی کیا سبیل ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا جواب بھی کچھ مشکل نہیں۔ جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا گیا ہے۔ ہماری نشأۃ ثانیہ کے دو اجزاء لاینفک ہیں۔ قرآن کریم سے تمسک اور باطنی زندگی کے تخیل کا احیاء۔ قرآن کریم ہمارے پاس موجود ہے لیکن ہماری عملی زندگی میں اس کا حصہ اتنا ہی رہ گیا ہے کہ

از زمین او آسماں بمیری

حالانکہ خدائے زندہ کی یہ کتاب زندہ یکسر زندگی بخش ہے۔ ایسا ضابطہ تو نہیں ہے جس کا ایک ایک لفظ سراپا حق و یقین ہے وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ جس میں کہیں کسی جگہ شک و شبہ اور قیاس و تخمین کی کوئی گنجائش نہیں ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ایسا حق کہ باطل اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ [illegible] ہیں؟ ثابت ہو۔ اٹل ہو۔ [illegible] ہو۔ اپنی جگہ پر ثابت قدم ہو۔ حقیقت کے ہر معیار پر پورا اترے۔ [illegible] کی ہر کسوٹی پر کھرا ثابت ہو۔ اس کے برعکس باطل وہ جو مٹ جانے والا ہو۔ جو باقی نہ رہ سکے۔ قرآن کا دعوے ہے کہ وہ حق ہے۔ باطل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ [illegible] ہے۔ توہم پرستی کا اس میں کوئی شائبہ نہیں۔ کسی خاص قوم اور خاص جماعت کی ہدایت کے لئے نہیں۔ بلکہ نسلی۔ لسانی۔ طبقاتی۔ وطنی۔ قبائلی غرضیکہ تمام غیر فطری حدود و قیود کو توڑ کر تمام دنیا کے لئے یکساں طور پر آئین حیات ہے۔ [illegible] خداوند کے حضور آج قرآن کے علاوہ اور کوئی ضابطہ نہیں جس کے مطابق اقوام عالم کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہوں۔ پھر جس طرح یہ صحیفۂ فطرت مکانی حدود سے بلند ہے۔ اسی طرح زمانی قیود سے بھی ماوراء ہے۔ یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ابدی نہیں تو کسی زمانہ میں بھی یہ [illegible]

(جولائی ۱۹۲۱ء)

قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں بھی اپنے اندر عجیب سامانِ موعظت رکھتی ہیں۔ اُن کے بڑھنے اور اُبھرنے کے زمانہ کو دیکھئے۔ نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم (ایمان) اور اس کے حصول کی خاطر مسلسل (عمل) زندگی کی ساری کہانی دو لفظوں میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ دلوں میں ولولے۔ خون میں حرارت آنکھوں میں چمک۔ سارا ماحول زندگی سے بھرپور۔ خاک کے ایک ایک ذرّے میں نوید حیات درخشندہ۔ مصائب میں مسرت۔ مشکلات میں راحت۔ موت میں حیات کے سامان خوابیدہ۔! فتح و ظفرمندی پاؤں چومتی، سعادت و کامرانی رکاب تھامتی۔ اللہ کی نصرت کے فرشتے جلو میں۔ منزل کی تابناکی شمعِ راہ۔ دل۔ یقین کی دولت سے معمور۔ قدم لذتِ جادہ پیمائی سے محوِ خرام۔ غرضیکہ تمام عمر دریا کی طرح ایک مسلسل روانی۔ غیر منقطع جدوجہد۔ یعنی ایمان و عمل کی زندہ تفسیر۔ یہ تھی مسلمان کے دورِ عروج کی ابتدا۔ نبی اکرمؐ سے عرض کیا گیا کہ مسلمان کی زندگی کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو اُس میں شریک ہو اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ سارا فلسفۂ حیات ایک جملہ زیرِ

مسلمانوں کی تاریخ

مرکوز۔ یہ سپاہیانہ دور سابقون بالخیرات (۳۵/۲۲) کا تھا۔ یعنی حُسنِ عمل میں آگے بڑھنے کا دور۔ اس کے بعد ایک درمیانی دور (مقتصدین) کا آیا۔ جو کچھ بزرگوں سے ترکہ میں ملا اُسے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ مجاہدانہ اعمالِ حیات کی موزون تیزیاں، دربدری تفنّنت

کی بزم خیسہ زیوں میں بدل گئیں۔ دینِ خداوندی کو تمام انسانی ضوابطِ زندگی ادیانِ عالم پر عملاً غالب دیکھنے کی بجائے نظری مباحث اور منطقیانہ دلائل سے اس کی فوقیت و برتری ثابت کرنے ہی کو مقصدِ حیات سمجھ لیا۔ قوانینِ خداوندی، جن کی تفسیر اعمالِ زندگی سے ہوتی تھی۔ حروف و نقوش کے پیکروں میں سجا کر رکھ دیئے گئے رفتہ رفتہ قوائے عملیہ مفلوج ہو گئے۔ ہمتیں پست ہو گئیں۔ ولولے سرد پڑ گئے۔ بایں ہمہ اس دور میں بھی کہیں کہیں برسے ہوئے بادلوں میں بجلی کی چمک اور جلے ہوئے نیستان میں تبسم شرار نظر آتا رہا۔ اس کے بعد تیسرا دور خلفین کا آیا۔ دورِ عمل پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ باقی رہا ایمان سو اس کے متعلق انہیں اسلاف سے کتابوں کے ذخائر ملے جو نظری مسائل کے پیچ در پیچ مباحث سے بھری پڑی تھیں اور یہ مسائل بھی یونان کے فلسفے اور عجم کے تصورات سے مستعار لئے گئے تھے۔ اب اُن کے نزدیک مقصدِ حیات، چند الفاظ کو ایک خاص طریق سے دہرا لینے کا نام رہ گیا۔ اور اعمال؛ چند رسوم کی میکانکی انداز سے ادائیگی! حالانکہ ایمان سے مفہوم تھا۔ اللہ تعالیٰ کے متعین فرمودہ نصب العین کی صداقت پر غیر متزلزل یقین۔ اور اعمال سے مقصد، اس نصب العین کے حصول کی تڑپ۔ لیکن اس آخری دور میں سارا دین سمٹ سمٹا کر چند الفاظ کی ادائیگی کا نام رہ گیا۔ اور چونکہ ضابطۂ خداوندی میں نجات و سعادت ایمان سے مشروط تھی۔ اس لئے سمجھ لیا گیا کہ جو شخص ایک خاص انداز سے چند خاص الفاظ کو دہرا دے گا اس کی کامرانیوں اور شادمانیوں کا اللہ ذمہ دار ہو جائے گا۔ کیونکہ ایمان کے صدقے میں سعادت و نصرت کا عطا ہونا فرمودہ خداوندی ہے اس کے بعد یہ بحثیں چھڑیں کہ کیا اعمال کے بغیر خالی ایمان سے بھی نجات ہو سکتی ہے یا نہیں؟ حالانکہ اگر ایمان اور اعمال کا قرآنی مفہوم سامنے ہو تو اس بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ایمان وہ جذبہ محرکہ ہے جو عمل کا محرک ہوتا ہے۔ یہ وہ بیج ہے جس سے شجرِ حیات شاخ در شاخ کی طرح بڑھتا، پھولتا، اور پھیلتا ہے۔ اس لئے جس بیج سے درخت پیدا نہیں ہوتا وہ بیج ناقص ہے

مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

قرآن کریم کی رُو سے جس طرح وہ اعمالِ زندگی جن کی بنیاد ایمان پر نہیں ہوتی ایسے [illegible]
بن جاتے ہیں جو انسانیت کے امن و سلامتی کے خرمنوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر

ایمان و عمل

کر دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ ایمان جو خالی الفاظ کا مجموعہ سمجھ لیا جائے اور جس کی
تصدیق اعمالِ حیات نہ کریں، برف کا ایسا تودہ بن جاتا ہے جو رگوں میں دوڑنے والے خونِ گرم کے ہر قطرہ کو
منجمد کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس لئے نجات و سعادت اس قسم کے ایمان سے کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ آج
بدبختی سے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ تو پیدا ہو گیا ہے جس نے اسلام میں ایک جدید رہبانیت کی طرح
ڈال دی ہے اور یہ غیر قرآنی خیال پھیلانا شروع کر دیا کہ اصل مقصود عمل ہے۔ ایمان کو اس
سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خیال ایسی کھلی ہوئی گمراہی پر مبنی ہے کہ اس کی تغلیط اور تکذیب کے لئے کسی
زیادہ سعی و کاوش کی ضرورت نہیں۔ لیکن دوسری طرف صدیوں سے یہ عقیدہ عام مسلمانوں کے رگ و
پے میں سرایت کر چکا ہے کہ تنہا ایمان (یعنی چند الفاظ کا دہرا دینا) نجات کے لئے کافی ہے۔ ان کے
نزدیک من قال لا الٰہ الا اللہ فدخل الجنۃ کا مفہوم ہی یہ ہے کہ جس نے ان الفاظ کو زبان
سے دہرا دیا جنت کا وارث بن گیا۔ قریب قریب تمام مسلمان کچھ اسی قسم کی خوش فہمی میں مگن ہیں
اور نہیں سوچتے کہ اس غلط عقیدہ نے کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ آج مسلمانوں پر جس قدر نکبت و ادبار
طاری ہے۔ یہ قوم کتنی [illegible] ذلت و رسوائیوں کے کیسے عمیق گڑھوں میں گر چکی ہے۔ نکبت و
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ایمان بلا عمل

قرآن کریم کے کسی صفحہ پر نگاہ ڈالیے نجات وسعادت، فلاح وبہبود کے لئے جہاں اٰمَنُوْا آیا ہے اس کے ساتھ ہی عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بھی موجود ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر صرف دوسرے ٹکڑے کو ماننے والے یُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَيَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (قرآن کریم کے ایک حصّے پر ایمان لانے اور دوسرے پر ایمان نہ لانے) کے جرم کے مرتکب قرار دیئے جاتے ہیں تو دوسرے ٹکڑے کو چھوڑ کر صرف پہلے ٹکڑے پر ایمان لانے والے اس جرم سے کس طرح بچ سکتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم کا صاف صاف فیصلہ موجود ہے

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوْا أَنْ يَقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝

کیا لوگ یہ گمان کئے بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان پر کوئی آزمائش نہیں ڈالی جائے گی

پھر دوسری جگہ ہے

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ (۳/۱۴۲)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ اللہ نے ابھی تک اس بات کو نہیں آزمایا کہ تم میں سے کون جہاد کرتا ہے اور ثابت قدم ہے

کیا آپ نے سورۂ توبہ میں نہیں دیکھا کہ جب منافق اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتے تھے تو اُن کے ایمان کی شناخت کے لئے کونسا معیار مقرر کیا گیا تھا۔ فرمایا۔

قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۹/۱۰۵)

اُن سے کہہ دیجئے کہ جاؤ کچھ کر کے دکھاؤ، تمہارے اعمال کو خدا، اس کا رسول اور مومنین دیکھ لیں گے

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ سورۂ انعام میں ہے کہ جب خدا کا عذاب سامنے آجائے گا تو اس وقت نہ تو اُس شخص کو نفع پہنچے گا جو اس وقت عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے گا اور نہ ہی اُس شخص کو جس نے ایمان کے ساتھ نیک عمل نہ کیا ہوگا اَوْ كَسَبَتْ فِیْٓ اِیْمَانِهَا خَیْرًا (۶-۱۵۸) سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے زیادہ اور کون سے واضح الفاظ ہو سکتے ہیں جن میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا جاتا؟ یاد رکھئے جس ایمان کے ساتھ اعمال شامل نہ ہوں گے وہ ایمان کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے محبوب ہیں۔ اس واسطے کہ ہم ایمان و اسلام کا دعوٰے کرتے ہیں۔ لیکن جس کے تم محبوب بنتے ہو، وہ تو علانیہ کہہ رہا ہے کہ یہ خدا ہے وہ ایک مسلم کا اُس کے اعمال کی وجہ سے "دوست" ہے نہ کہ اُس کے زبانی دعوؤں کی بنا پر۔

وَهُوَ وَلِیُّهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۶:۱۲۸)

اللہ ان کا دوست ہے بوجہ ان کے اعمال کے۔

کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بُرے اعمال کی سزائیں تجویز کی ہیں وہاں مسلم اور غیر مسلم، مومن و کافر میں کوئی تمیز، کوئی تفریق نہیں کی۔ اُس نے صاف صاف کہدیا کہ

لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ ( )

نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا نہ اہل کتاب کی۔ جو بھی بُرا کام کرے گا اُس کی سزا پائے گا۔

[illegible] ہے۔ جو کوئی بُرائی کرے گا اُس کے جرم اُسے گھیر لیں گے، وہ جہنم میں جائے گا۔ اور وہیں رہے گا (۲:۸۱) [illegible] حکم دیا جاتا ہے کہ ایمان والو سود نہ کھانا [illegible] سے ڈرتے رہنا تاکہ تم تقوٰی شعار بن سکو۔ لیکن اگر تم اس حکم کی خلاف ورزی کرو گے تو اُس آگ سے ڈرو جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ کے ٹکڑے پر نگاہ ڈالئے۔ خطاب یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے کیا جا رہا ہے کہ ایک سود خوار ایمان کا مُدعی ہے لیکن جب اُسے اس کے جرم کی سزا میں جہنم رسید کیا جاتا ہے تو وہ جہنم

گویا اللہ نہیں دیتی ہے جو کافرین کے لئے تیار کی گئی ہے۔ فرمائیے اس شخص کے دعویٰ ایمان نے اس میں کیا امتیاز پیدا کر دیا؟ اس سے بھی آگے بڑھیئے! بدر کا میدان ہے مسلمانوں کی کل کائنات میں تین سو تیرہ[303] نفوس، کچھ مہاجرین، کچھ انصار۔ گھر بار، بیوی بچے، عزیز و اقارب، مال و دولت سب کچھ چھوڑ کر ہتھیلیوں پہ سر لئے خدا کے راستے میں جان جیسی گراں بہا چیز قربان کر دینے کے لئے تیار ہیں

بدر کا میدان

یہ وہ ایمان والے ہیں جنہیں اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کہا گیا ہے وہ ہیں جن کے ایمان لانے والوں کے لئے بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں وہ ہیں جن کے متعلق رسولؐ خدا نے ابھی ابھی دعا میں فرمایا ہے کہ اے اللہ یہ مٹھی بھر جماعت تیری نام لیوا، تیرے نام کی حفاظت کے لئے جانیں قربان کرنے کے لئے میدان میں آئی ہے اگر یہ مٹ گئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔ فرمائیے ان کے ایمان میں کیا شبہ ہو سکتا ہے لیکن اسی مقام پر ان کا خدا ان سے کہتا ہے کہ یاد رکھو

"جو آج کے دن میدان جنگ سے منہ موڑے گا سوائے اس کے کہ وہ لڑائی کے لئے پینترا بدلے یا اپنی جماعت سے ملنے کی خاطر جگہ بدلے تو وہ خدا کے غضب کا مستوجب ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور یہ بُری جگہ ہے رہنے کی" (۸:۱۶)

زبانی اقرار پر جنت میں جانے کے متمنی ذرا آنکھیں کھول کر اس ارشاد مقدسہ کو دیکھیں جو دورِ اوّل کی آخری منزل ہے۔ جو لوگ ایمان لائے تھے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی تھی ان کے متعلق کیسا فیصلہ ہے۔

"اور جو لوگ ایمان لائے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی تو جب تک یہ لوگ ہجرت نہ کریں ان کا ساتھ (مسلمانوں کا) کوئی دوستانہ تعلق نہیں ہوگا۔۔۔۔۔۔" (۸:۷۲)

دیکھئے ان لوگوں کے ایمان کی شہادت خدا دے رہا ہے کیونکہ انہیں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر پکارا ہے لیکن یہ صرف ایمان کے دعویدار ہیں۔ مومن وہ ہیں جو اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا کی تعریف میں آتے ہیں۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (۸ : ۷۴)

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی یہ لوگ اصلی مومن ہیں اُنھی کے لئے مغفرت اور انھی کے لئے عزت کا رزق ہے۔

جو لوگ میدان میں آنے سے ہچکچاتے ہیں اللہ کا ارشاد ہے کہ ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی ہے (۹ : ۸۷) ان کے برعکس

لٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۹ : ۸۸-۸۹)

لیکن رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے اور جہاد کیا اپنے اموال اور جانوں سے یہی لوگ ہیں جن کے لئے سب خوبیاں اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں ان کے لئے اللہ نے ایسی جنات تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں ان میں رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

دیکھئے سب خوبیاں کامیابی و کامرانی کی تمام نعمتیں، دنیا کی سرفرازی اور آخرت کے انعام سب انھی کے لئے ہیں جو ایمان کے ساتھ عمل میں پورے اترتے ہیں۔

یہی نہیں کہ آخرت کی فوز و بہبود ہی عمل کے ساتھ مشروط ہو اس دنیا کی عزت و وقار کی زندگی خوش حالی و خوش بختی کی زندگی، سرفرازی و سربلندی کی زندگی یعنی وہ زندگی جو فی الحقیقت ایک مومن کی زندگی ہونی چاہئے وہ بھی عمل ہی کے ساتھ مشروط ہے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکومت عطا کرنے کے بعد دیکھنے کی بات کہی۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِن بَعْدِهِمْ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۱۰ : ۱۴)

پھر ہم نے تمہیں دنیا میں حکومت دی پہلی قوموں کے بعد تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اگر تم عمل کی دنیا میں پورے نہیں اترتے تو تمہارے ایمان کے الفاظ کوئی قیمت نہیں رکھیں گے وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا (۹ : ۳۹)

اس لئے کہ جہاں اس کا ارشاد ہے کہ :-

وَنُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۷ : ۴۳)

ان سے پکار کر کہدیا جائے گا کہ یہ جنت ہے جس کے تم اعمال کے باعث وارث قرار دیئے جاتے ہو

وہیں اس دنیا کی جنت کے متعلق بھی اس کا فیصلہ ہے کہ :-

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۴ : ۵۵)

اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ جو تم میں سے ایمان لائیں اور عمل صالح کریں تو اللہ ان کو زمین کی بادشاہت عطا فرمائے گا۔

پس اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس دنیا میں آپ کی ہستی قائم رہے تو ایمان محکم کے ساتھ عمل پیہم بھی پیدا کیجے کہ یہی سچے مومنوں کی نشانی ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ

یقیناً مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر ان کے ایمان میں ذرا جنبش نہ ہوئی اور انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے اموال و نفوس سے جہاد کیا یہی لوگ سچے ہیں۔

ورنہ یاد رکھئے کہ خدا کے فیصلے فطرت کی تعزیریں اٹل ہیں غیر جانبدار ہیں ہر چیز کی بنا عمل سے ہے۔ انسان کا تمام تر سرمایہ عمل ہے لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۔ خدا کا اٹل فیصلہ ہے۔ نتائج عمل سے پیدا ہوتے ہیں اور سے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

وہ قول، وہ زبانی دعویٰ، وہ اقرار، وہ اصطلاحی ایمان جس کی تائید اعمال سے نہیں ہوتی جس کی تصدیق آپ کے قلوب اور جوارح نہیں کرتے قرآن کی میزان میں ایک پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا نہیں بلکہ ایسا زبانی دعویٰ ایک جرم عظیم ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ

اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہے کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جو کر کے نہ دکھاؤ۔

اور اگر خدا کے ان کھلے کھلے فیصلوں کے بعد بھی آپ یہی خیال کرتے جائیں کہ چونکہ آپ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں۔ صبح سویرے منہ پر ہاتھ پھیرتے وقت زبان سے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ بھی نکل جاتا ہے اس لئے ضرور آپ جنت کے وارث بن جائیں گے اور ساری دنیا پر غلبہ آپ ہی کا ہو جائے گا اور محض اس لئے ہو جائے گا کہ آپ مسلمان کہلاتے ہیں تو یاد رکھیئے یہ سراسر دھوکا ہے۔ فریب ہے اور فریب خدا کے ساتھ نہیں دوسروں کے ساتھ نہیں بلکہ خود اپنے ساتھ ہے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ یاد رکھیئے آج دنیا میں جہد البقاء زندہ رہنے کی کشمکش، بڑی سخت ہو گئی ہے قوموں میں باہمی منافست ہے مقابلہ کی دوڑ ہے۔ جو قوم، جو ملک، جو شخص اس دوڑ میں پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لئے بھی ٹھہر گیا ہلاک ہو گیا پیچھے سے آنیوالی قومیں اسے بے رحمی سے کچلتی ہوئی نکل جائیں گی اس لئے قرآن حکیم نے فرمایا ہے قاعدین (بیٹھنے والے) اور مجاہدین (دوڑنے والے) کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ کیا یہ قانون آپ پر نافذ نہ ہو گا کیا ارباب قضا و قدر آپ کو اس لئے چھوڑ دیں گے کہ آپ خاص قسم کے نام رکھتے ہیں یا یہ عقیدہ دل میں جمائے بیٹھے ہیں کہ ہمارا زبانی اقرار ہماری کامیابیوں کے لئے کافی ہے یاد رکھیئے فطرت کسی کی سوتیلی ماں نہیں اگر اس نے پہلی قوموں کو تباہ کر دیا تو اس لئے کہ ان میں قوت عمل مفقود ہو چکی تھی نہ اس لئے کہ ان سے

لئے کوئی ضد تھی۔ اور اب اگر آپ بھی وہی کچھ کریں گے جو ان قوموں نے کیا تھا تو وہ آپ کو اس لئے نہیں چھوڑ دے گی کہ آپ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ایسا سمجھنا خدا کے قانون کے متعلق غلط اندازہ لگانا ہے۔ ماقذ دوستی قسط ۲

فنون میں ترقی کر رہی ہیں تو کبھی تم بھی اس میدان کے مرد رہ چکے ہو یہ داستان سنائی جائے اور اس کے خواب آور اثر سے قوم کو تھپک تھپک کر سلا دیا جائے۔ اگرچہ میں بھی کچھ ایسی ہی تفصیلات پیش کروں گا جو عام طور پر پیش کی جاتی ہیں اور مجھے بھی کچھ ایسے ہی سحرکار مناظر سامنے لانے ہوں گے جو تاریخ کے اوراق پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں لیکن میں ان کیفیات و مناظر کو کسی اور زاویہ سے دکھانا چاہتا ہوں اور میرے نتائج مستخرجہ افسون خواب اور ہونے کی بجائے اہل بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھیں گے وَمَا تَوْفِيقِىٓ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِىِّ الْعَظِيمِ۔

برادران! یوں تو دنیا کی جس چیز پر نگاہ ڈالئے وہ تغیر و تبدل کے ایک لامتناہی سلسلہ کی جولانگاہ نظر آئے گی۔ سائنس کی تحقیقات اور اثری انکشافات نے اب یہ حقیقت بے نقاب کر دی ہے کہ مہیب و عمیق سمندر کبھی فلک بوس پہاڑ تھے اور ہمالیہ کی یخ بستہ چوٹیاں بحر اٹلانٹک کی سی گہرائیاں تھیں آبادی کی جگہ ویرانے اور ویرانوں کی جگہ آبادیاں تھیں اور یہی سلسلہ غیر محسوس طور پر آج بھی جاری و ساری ہے لیکن ان انقلابات ارضی و سماوی کا انسان کی عمرانی زندگی پر کچھ ایسا گہرا اثر نہیں پڑتا جیسا ان

داخلی تغیرات

تغیرات کا جو زمین کی بجائے خود اہل زمین کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور جن سے سطح زمین کے نقشے بدلنے کی بجائے انسانی تہذیب و تمدن کے آثار بنتے اور بگڑتے ہیں آج ایک قوم اپنی ترقی کی معراج کمال پر ہوتی ہے اور کل ہی آثار قدیمہ کے کھنڈرات اس کے ابھرے ہوئے کاشانوں اور بنے ہوئے قصروں کے بدلے خواب ہو جاتے ہیں وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہبوط میں سے گزرنے والی قوم اپنی دولت و ثروت ہی نہیں کھو بیٹھتی بلکہ اس کی ذہنیت بھی ایسی پستی کے گڑھے میں گر جاتی ہے کہ اسے اپنے ہاں کی ہر چیز معیوب نظر آتی ہے اور وہ برتر اقوام کی ہر ادا مجذوب وہ سعادت و نجات کا راستہ ڈھونڈتی ہے تو انہی کے نقوش قدم میں اور اسے فلاح و بہبود کی راہیں کھلی نظر آتی ہیں تو انہی کی کورانہ تقلید میں غرضیکہ وہ دیکھتی ہے تو انہی کی آنکھوں سے۔ سنتی ہے تو انہی کے کانوں سے اور سمجھتی ہے

جس کی رو سے زمین اس کائنات کی مرکز اور ساکن تصور کی گئی تھی اور جملہ اجرام سماوی اس کے گرد چکر لگاتے تھے اگرچہ فیثاغورث وغیرہ نے اس نظریہ کی اسی زمانے میں تردید کردی تھی لیکن بایں ہمہ اسے قبولیت حاصل رہی اور یہی نظام بطلیموسی نظام فلکی کے نام سے یورپ میں رائج ہو گیا۔ مسیحیت کے عقیدے کی رو سے جملہ کائنات میں زمین کو خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیئے تھی جس پر خود خدا یا خدا کے بیٹے کی زندگانی ہوئی۔ چونکہ بطلیموسی نظام کی رو سے زمین کو عالم موجودات میں ایک مرکزی اور مخصوص حیثیت حاصل تھی اس لئے مسیحیت نے اس نظام کو اپنے عقائد میں داخل کر لیا۔ ازاں بعد جب علم و تحقیق کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ زمین بھی دیگر اجرام فلکی کی طرح متحرک ہے اور اسے کوئی خاص امتیازی شان حاصل نہیں۔ تو اس سے مسیحیت کے بنیادی عقائد پر زد پڑتی تھی، اس لئے کلیسا نے اس کی مخالفت کی۔ یورپ میں اس جدید نظام فلکی کو کوپرنیکس کا نظام کہتے ہیں چونکہ گلیلیو نے علیٰ وجہ البصیرت اس جدید نظام کی تائید کر دی اس لئے ارباب کلیسا اس کی جان کے دشمن ہو گئے۔ علم و تحقیق کے خلاف یہ اندھیر صرف قدامت پسند کلیسا کی طرف سے ہی نہ تھا بلکہ ان کے روشن خیال اور تجدد پسند طبقہ پروٹسٹنٹ نے بھی اس کے خلاف کافی زہر اگلا ہے جس پر خود لوتھر Luther، کیلون اور میلانختون Melanchthon وغیرہ کی تصنیفات شاہد ہیں۔

یورپ اگر ایسے مذہب کو چھوڑتا نہ تو اور کیا کرتا۔

ہندوستان میں

ادھر ہندوستان میں جب علمی ترقی کا خیال پیدا ہوا تو وہی مظاہر قدرت جن سے ڈرنے والوں کا ہیبت تھے دیوی اور دیوتاؤں کی شکل میں سامنے موجود تھے۔ سورج، چاند، اور وایو، پانی، آگ اور ہوا، جنہیں تابع فرمان بنا کر یورپ نے زمین و آسمان کو مسخر کر لیا تھا۔ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت بجا لانا پڑتا تھا۔ جس آزادی پسند طبقہ نے علمی ترقیوں کو ضروری سمجھا وہ قدامت پسند طبقہ کے احتجاج کی کچھ پروا نہ کرتے ہوئے مستانہ وار آگے بڑھ گیا اور یہاں بھی قدیم مذہب ترک کر دیا گیا۔

صنعتوں میں بھی بہت ماہر تھے۔

جذبۂ محرکہ

لیکن یہ علمی تحقیقات اور سائنس کے انکشافات علمائے اسلام کی ذہنی افتاد یا طبعی رجحان کا نتیجہ نہ تھے بلکہ ایک خاص جذبہ تھا جس کے ماتحت یہ امور سرانجام پاتے تھے وہ جذبہ کیا تھا؟ وہ کون سی قوت تھی جو انہیں علمی کاوشوں پر آمادہ کر دیتی تھی ظاہر ہے کہ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ وہ مخصوص جذبہ وہ قوت محرکہ ان کے دین کی تعلیم تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے نظام حیات میں دین ہمیشہ بمنزلہ دماغ کے رہا جب تک دماغ درست اور قوی ہوتا ہے تمام اعضاء و جوارح اپنی اپنی جگہ بخوبی کام کرتے رہتے ہیں لیکن جب اس سرچشمۂ قوت و اعمال میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے تو اگرچہ اعضاء و جوارح بظاہر صحیح و سالم نظر آتے ہیں لیکن ان کی قوت عمل سلب ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس زمانے میں حرارت دینی نظام حیات میں فی الجملہ موجود تھی اس لئے ہر شعبہ زندگی اپنی اپنی جگہ منزل ارتقاء کے منازل طے کرتا چلا جاتا تھا۔ یہی مذہبی ولولہ اور جوش ہی تھا جس سے کہ وہ اتنی مصیبتیں جھیلتے تھے مگر علمی تحقیقات میں ان کا قدم پیچھے نہ ہٹتا تھا اس لئے کہ وہ اسے بھی ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ وہ زمانہ آج کا نہ تھا جب علمی ریسرچ کے لئے اس قدر آسانیاں موجود ہیں آج کسی سکالر کے دل میں کسی علمی تحقیق کا خیال پیدا ہوا اس کی مدد کے لئے فوراً بڑی بڑی سوسائٹیاں تیار ہو جاتی ہیں۔ فنڈ جمع کئے جاتے ہیں رفقائے کار ہر وقت پابرکاب ہوتے ہیں اگر وہ افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اپنا کیمپ نصب کریں تو بھی ہالینڈ کا مکھن، لندن کے بسکٹ، کشمیر کے سیب اور کینیڈا کی روٹی غرض سب کچھ وہیں ان کو پہنچتا رہتا ہے لیکن وہ زمانہ ایسا تھا کہ امام ابن جریر لکھتے ہیں کہ جب میں تحصیل علم کے لئے گھر سے نکلا تو والدہ نے دو سو کلچے پکا کر باندھ دیئے تھے معمول یہ تھا کہ ہر روز ایک کلچہ دجلہ کے پانی میں بھگو کر کھا لیتا۔ چنانچہ جب یہ کلچے ختم ہو گئے تو دار العلوم کو چھوڑنا پڑا اور جب تک پیٹ روٹی کا انتظام نہ ہوا تحصیل علم کا سلسلہ جاری نہ ہو سکا۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ میں نے تحصیل علم کے لئے دو ہزار میل پیدل سفر کیا ہے

اس آیت نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۳۶:۳۸)

اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے یہ اندازہ بندھا ہوا ہے اس غالب اور علم والے کا۔

غرضیکہ ان اہلِ نظر مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی ہر چیز میں ایک آیت تھی ایک خداوندی نشان۔ ایک راز فطرت مضمر تھا اور وہ ہر ایک چیز کو تجسس کی نگاہ سے دیکھتے اور نقاب برانگندہ عروس حقیقت کو علمی تحقیقات اور عملی تجارب سے جستجو کا مرکز بنا لیتے۔ صبح کی سپیدی میں رات کی سیاہی میں شفق کی سرخی میں قوس قزح کی ہیبت آفرینی میں پہاڑوں کی بلندیوں میں، سمندروں کی گہرائیوں میں، بادلوں کی روانیوں میں، بجلی کی عنبر فشانیوں میں، سورج کے جلال میں، چاند کے جمال میں، غرض صحیفۂ فطرت کے ورق ورق سے انہیں دعوتِ علم و عمل ملتی کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (۲:۱۶۴)

بلا شبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور رات دن کے آنے جانے میں اور جہازوں میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں سمندروں میں لے کر چلتے ہیں اور بارش کے پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے اور ہواؤں کے رخ بدلنے میں اور بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقید و مسخر رہتے ہیں سمجھ رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

ایک مسلمان کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ ان آیاتِ اللہ پر ایمان محکم رکھے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم کی ان شہادات کو دنیا کے سامنے پایۂ ثبوت کو پہنچا دے اور یہ اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ فطرت کے ایک ایک نقش و نگار کو دیکھے اور پیہم تجربات اور مسلسل مشاہدات سے ان کی حقیقتیں دنیا کے سامنے عمل کر کے دکھا دے

کرنا چاہیئے۔ آج تک قرآن کریم کا کوئی اشارہ بھی کسی مشاہدے کے خلاف ثابت نہیں ہو سکا لیکن اس کی تعلیم کو قیاسات کے مطابق ثابت کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیئے۔

یہی غلطی ہم اس سے پہلے بھی ایک دفعہ کر چکے ہیں جب بعض حکمائے اسلام نے قرآن حکیم کو فلسفۂ یونان کے مطابق ثابت کرنے میں اس قدر دماغ سوزی سے کام لیا حالانکہ فلسفہ کے اصول ہمیشہ قیاسات پر مبنی ہوتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس فلسفۂ قدیم کی بنیادیں منہدم ہونے کے ساتھ ہی ان علماء کی تمام کاوشیں بھی اکارت گئیں۔ نہیں بلکہ جن لوگوں نے قرآن کریم کو انہی علما کی وساطت سے سمجھا تھا اور ان کی توضیحات کو عین قرآن خیال کرتے تھے ان کے دلوں میں خود قرآن کے متعلق طرح طرح کے شکوک و شبہات اور ارتیابی کیفیتیں پیدا ہو گئیں۔ جو آیات قرآنی کسی خاص زمانے کے قیاسی نظریوں کے مطابق نہ ہوں ان کے متعلق یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ نظریئے ہنوز قیاس ہیں۔ جب زمانہ کی مزید علمی ترقیوں سے قیاس حقیقت میں بدل جائے گا تو ان آیات کے عین مطابق ہو گا یہی آج تک ہوتا چلا آیا ہے اور یہی اس کے بعد ہو گا۔

آخر میں ایک مختصر سی گزارش حضرت علما کی خدمت میں بھی کرنا چاہتا ہوں اگرچہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن چونکہ بات قرآن کی ہے اس لئے اس کے عرض کرنے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ قرآن کریم نے جس علم کی اس درجہ تاکید فرمائی ہے اس کی تعریف کیا ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت چلو (یاد رکھو) کان، آنکھ اور دل۔ ان سب سے بازپرس ہو

اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک علم وہ ہے جس کی شہادت سمع۔ بصر اور قلب سلیم دیں اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ظن اور قیاس ہے جو علم کے مرتبہ تک نہیں پہنچتا ہمارے مذہبی مکاتب میں جو نصاب تعلیم مقرر ہے غور فرمایئے کہ اس میں کتنا حصہ ظن و قیاس کا ہے اور کتنا علم یقین کا۔

ہمارے مذہبی مکاتب

فلسفۂ یونان منطق۔ علم الکلام (جو فی الحقیقت فلسفۂ یونان ہی کی ایک شاخ

کہنا چاہیئے) تمام ظنی اور قیاسی ہیں اور یہی کہ خود موجودہ نظریات ہیں جن کو کوئی نہیں قبول کرتا۔ یورپ ایک عرصہ تک اپنی قیاسات کی نکتہ آفرینیوں میں الجھا رہا مسئلہ پیش ہوتا کہ "مرغی کے منہ میں دانت ہو سکتے ہیں یا نہیں" ایک جماعت ثبات کی طرف اور دوسری نفی کی طرف ہو جاتی ہے دلائل پر دلائل دئے جاتے ہیں منطقی توجیہات پیش کی جاتی ہیں صغریٰ اور کبریٰ ملائے جاتے ہیں لیکن کوئی اتنا نہ کہتا کہ مرغی کا منہ کھول کر دیکھو کہ اس میں دانت ہیں یا نہیں حتیٰ کہ ان میں بیکن پیدا ہوا اس نے سب سے پہلے یورپ میں علم کی وہ تعریف کی جو قرآن کریم کی معرفت صد آیت میں تیرہ سو سال پیشتر دنیا کے سامنے آچکی تھی اس نے مرغی کا منہ کھول کر دکھا دیا کہ اس میں دانت ہیں یا نہیں آپ حیران ہوں گے کہ علم کی اس تعریف کے بدل جانے سے اس قوم کی ذہنیت بدل گئی اور آج جس قدر بھی تحقیقات اور سائنس کی ترقیاں ہو رہی ہیں سب علم کی اسی تعریف پر مبنی ہیں لیکن ایک ہم ہیں کہ:-

ہوئی لاکھ دنیا اِدھر کی اُدھر ہے
وہی سنگ در ہے وہی اپنا سر ہے۔

ضرورت ہے کہ ہم بھی اپنے زاویۂ نگاہ کو قرآن کریم کی روشنی میں بدلیں حقیقت یہ ہے کہ [illegible] مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اسے زندگی کے تمام مراحل میں شمع ہدایت بنا سکیں اور اس کی روشنی میں منزل مقصود تک پہنچیں لیکن اگر ہم اس شمع کو اپنی کھڑکیوں کی زینت بنا کر بیٹھ جائیں تو ہر چند شمع کے روشن ہونے میں شبہ نہ ہو لیکن ہم منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے وہاں تو وہی پہنچے گا جو مسافت قطع کرے [illegible] [illegible] قرآن کریم [illegible] [illegible] تکمیل [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

یوں تو دنیا میں ہر شکار میں ایک لطف ہے لیکن انسان سب سے زیادہ لذت اس وقت محسوس کرتا ہے جب اس کا شکار خود دوسرا انسان ہو۔ نوعِ انسانی کی تاریخ پر اگر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی سلسلہ صید و صیاد کی ایک مسلسل داستان ہے تہذیب و تمدن، معاشرت و عمرانیت کے بدلنے سے محض جال کی نوعیت بدلتی رہی ہیں لیکن جذبہ ہمیشہ وہی کارفرما رہا ہے اصطلاحات میں تغیر و تبدل ضرور ہوتا ہے لیکن مفہوم ہر جگہ وہی رہا ہے۔

انسان اپنے عہدِ طفولیت میں انفرادیت اور عدمِ تعاون کی زندگی بسر کرتا تھا وہ ایک ایسی جنت میں رہتا تھا جہاں ع

کسے را با کسے کارے نباشد

لیکن یہ زندگی بچپن کی زندگی تھی اس کی معاشرت کسی اور اسلوبِ حیات کی متقاضی تھی ارتقا کی منازل میں انسان تمام مخلوق سے آگے تھا اس کی تخلیق فی احسن تقویم (بہترین ہیئت پر) ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ

دل حق بیند و سود ہمہ　　　در نگاہش سود و بہبود ہمہ

علاوہ ازیں دنیاوی نظام حکومت میں کوئی نہ کوئی منزل ایسی آئے گی جہاں پہنچ کر قوانین کے وضع یا نافذ کرنے والے خود قانون کی حد سے بالاتر ہو جائیں گے یعنی ان کے فیصلوں کی اپیل کہیں نہیں ہو سکے گی۔ ڈکٹیٹرشپ جو انسانی حکومت کے سلسلۂ ارتقاء میں آخری کڑی سمجھی جاتی ہے اسی اصول پر مبنی ہے کہ ڈکٹیٹر کا ہر لفظ قانون ہوتا ہے اور وہ خود قانون سے بالاتر۔ سٹالین اپنی کتاب "لینن ازم" میں خود لینن کے الفاظ نقل کرتا ہے کہ:

"ڈکٹیٹرشپ کے معنی ہیں قوت، بے پناہ قوت، ایک زبردست قوت، جو خود آئین و دستور سے بالاتر ہو اور اس کا ہر لفظ قانون ہو۔"

اٹلی کے ہر مدرسہ کی دیوار پر فسطائیت کے دس اصول جلی حروف میں لکھے جاتے ہیں جن میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ مسولینی کا ہر لفظ قانون ہے اور وہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ جرمنی میں ہٹلر کا ہر ارشاد قانون بن کر نافذ ہوتا ہے۔ شاہ انگلستان کے متعلق بھی دستور و آئین میں یہ شق رکھنی پڑتی ہے کہ وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں ابھی کچھ دن ہوئے مہاتما گاندھی کو بھی تنقید سے بالا قرار دیا گیا۔ وہ منزہ عن الخطا ہیں۔ یعنی ہر جگہ اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ نظام آئین و دستور میں سب سے اونچی کڑی کسی کی مطیع و فرمان بردار نہ ہو۔ اس کے برعکس نظام خداوندی میں کوئی کڑی بھی ایسی نہیں ہوتی جو قانون خداوندی کی اطاعت و اتباع سے باہر نکل جائے بلکہ وہاں تو اطاعت اور بلندی مدارج لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی جتنا بلند ہوتا جاتا ہے اتنی ہی زیادہ اطاعت کرنی پڑتی ہے اور وہ جتنی زیادہ اطاعت کرتا ہے اسی نسبت سے اسے سرفرازی اور سربلندی کے مدارج عطا ہوتے ہیں۔ نظام خداوندی میں ذات رسالت مآب صلعم کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ ظاہر و باہر ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

لیکن خود حضور کے لئے سب سے بڑا شرف انتہائی مقام عبدیت کا ہے۔ خدا کے غلام اس کے مطیع و فرمانبردار اور قوانین خداوندی کی سب سے زیادہ اتباع کرنے والے ہیں۔ ارشاد ہے۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۔

جو کچھ تیرے رب کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے اس کی اتباع کرو۔

نظام کائنات اس نظام کائنات کا ایک ایک ذرہ اطاعت کے اٹل اور بے پناہ قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ اگر سورج کا عظیم الشان کرہ ایک سیکنڈ کے سویں حصے کے برابر بھی اس قانون اطاعت میں تساہل برتے تو یہ تمام نظام شمسی دُھنی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح فضائے آسمانی میں منتشر نظر آئے۔ فضا کے ایک ننھے ذرے سے لے کر ان بڑے بڑے محیر العقول کروں تک تمام کے تمام ایک بندھے ہوئے قانون کے مطیع و منقاد ہیں۔ اسی سے یہ سلسلہ نظم و ضبط قائم ہے جب کائنات کا نظم و نسق ہی یہ ٹھہرا تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ فطرت کا یہ منشا ہو سکتا ہے کہ انسان کے لئے کسی منزل (اسٹیج) پر پہنچ کر اطاعت کا قانون غیر ضروری ہو جائے لیکن انسانوں کے بنائے نظام میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص منزل پر پہنچ کر کسی نہ کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو اطاعت کے قانون سے مستثنیٰ کیا جائے اس لئے کہ یہی جماعت خود قانون ساز ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ دوسرا بنیادی نقص جو دنیا میں انسانوں کے وضع کردہ نظام حکومت میں موجود رہتا ہے اور جس کے دور کرنے کا کوئی طریق نہیں۔ کہہ دیا جا سکتا ہے کہ جمہوری نظام میں مجلس واضعینِ قوانین کا ہر رکن قانون کی اطاعت پر اسی طرح سے مجبور ہے جس طرح دوسرے انسان۔ اس لئے وہ جماعت اطاعت کے قانون سے مستثنیٰ نہیں ہوتی لیکن جس جماعت کے اختیار میں ہو کہ جس وقت چاہے کوئی قانون بنائے اور جب جی چاہے اس میں رد و بدل کر دے یا اسے منسوخ کر ڈالے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جماعت کس وقت تک اطاعت کی مکلف رہے گی؟ صرف اس وقت تک جب تک اس قانون کی اطاعت میں اپنا فائدہ نظر آتا ہو۔ جب اسے اس اطاعت میں نقصان معلوم ہوگا وہ جماعت اس قانون کو بدل ڈالے گی جب یہ حالت ہو تو پھر یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ جماعت قانون کی اطاعت پر مجبور ہے یا یوں کہنا زیادہ درست ہوگا کہ خود قانون اس جماعت کی اطاعت پر مجبور ہے۔ قرآن کریم نے اس دوسرے اہم اور بنیادی نقص کو الگ کر کے رکھ دیا۔ جب اس نے فیصلہ کر دیا کہ:۔

دیکھ لیا کہ "جنت ارضی" اسے کہتے ہیں۔ اس نظام کی تکمیل کے بعد نبی اکرمؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ :-

ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوات والارض۔

آج زمانہ مختلف چکر کاٹ کر اپنی اصلی ہیئت پر پہنچ گیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے تخلیق کائنات کے دن بنایا تھا۔

یعنی آج انسانیت اس فضا میں پہنچ گئی ہے جو فضا اس شرف و تکریم کے عین سازگار تھی۔ ورنہ انسانی جذبۂ تغلب و تسلط کی دسیسہ کاریوں نے اس قدر مکدر کر رکھا تھا یہ فضا کیا تھی۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۔ 30/30

دین قیم اللہ کا وہ قانون جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا اور جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی ہے دین قیم (ایک محکم و مضبوط قانونِ حیات) لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں۔

یہ "دینِ قیم" کیا ہے اسے وعظِ یوسفی کے الفاظ میں سنئے۔ فرمایا۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۔

اے قید خانہ کے ساتھیو! ذرا سوچو تو سہی کہ کیا مختلف اور متفرق خدا (آقا) اچھے ہیں یا ایک خدا جو سب پر غالب ہے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ

تم اللہ سے ورے ہی جن آقاؤں کی محکومی اختیار کر لیتے ہو ان کی حقیقت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے کچھ نام مقرر کر رکھے ہیں (اصطلاحات وضع کر چھوڑی ہیں)۔

مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔

ان خداؤں (آقاؤں) کی محکومی اختیار کرنے کے لئے اللہ کی طرف سے تمہارے پاس کوئی سند نہیں ہے۔

بلاشرکتِ غیرے قابض ہے اور وہ باپ سے بیٹے کی طرف ورثتاً منتقل ہوتی چلی جا رہی ہے اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا شخص ہے جسے سال بھر کے اناج کے لئے زمین کا ٹکڑا نہیں ملتا اس کے لئے وہ زمین کے مالک کا محتاج ہے وہ دن کی چلچلاتی دھوپ اور رات کے کڑکڑاتے جاڑے کی محنت کا ماحصل زمین کے مالک کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا ہے اور اپنے بچوں کی روٹی کے لئے اس کے ہاتھوں کی طرف تکتا ہے

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک

دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

قرآن کریم زمین کی شخصی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتا اس کے نزدیک زمین رزق حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس کی تقسیم لوگوں کی محنت اور ضرورت کے اعتبار سے ہونی چاہیئے اور اس کا نظم و نسق اس جماعت کے ہاتھ میں ہو جو حکومت الٰہی کے قیام کے لئے متشکل ہو سرحد کے آزاد قبائل میں آج بھی یہ حالت ہے کہ گاؤں میں خان ہر تیسرے یا پانچویں برس بندوبست کی تجدید کرتا ہے اور ہر شخص کی ضرورت اور محنت کے مطابق زمین کے ٹکڑے تقسیم کر دیتا ہے زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوتی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کچھ مدت کے لئے فائدہ حاصل کرنے کے لئے دے فرمایا ہے (متاعٌ الیٰ حین) نہ کہ اس پر سانپ بنکر بیٹھ جانے کے لئے۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت　　ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر　　رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

باطنِ الارض للہ ظاہر است　　ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست　　ایں متاعِ بندہ و ملکِ خدا است

صرف زمین ہی نہیں بلکہ رزق کے جس قدر چشمے مبداءِ فیض کی کرم گستری سے حضرتِ انسان کو مفت عطا ہوتے ہیں قرآن کریم انہیں ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھتا ہے تا کہ ہر شخص اپنی محنت کے مطابق اس سے متمتع ہو فرمایا:-

اوپر کے طبقہ میں رہتی ہے روپیہ نیچے نہیں اُترتا۔ قرآن کریم نے آج سے چودہ سو برس پیشتر جب دنیا معاشیات کے جدید اصولوں سے بالکل بے خبر تھی کس قدر واضح الفاظ میں فرما دیا کہ روپیہ کی گردش اس انداز سے مت کرو کہ

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ ۔ ۵۹/۷

وہ تمہارے امراء کے طبقہ میں ہی گردش کرتا رہے۔

---

(۴) سُود

آج دنیا کی مہیب ترین لعنتوں میں سب سے بڑی لعنت سود ہے یعنی اگر روپیہ کسی ایسی جگہ سے جہاں وہ بلا ضرورت پڑا ہے ایسی جگہ آتا ہے جہاں اس کی احتیاج ہے تو وہ سود کی لعنت اپنے ساتھ لاتا ہے ضابطہ خداوندی کی رُو سے سود وہ جرم عظیم ہے کہ جسے خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا گیا ہے۔ ۲/۲۷۹

از ربا آخر چہ می زاید بہ فتن! کس نداند لذتِ قرضِ حسن
از ربا جان تیرہ، دل چوں خشت و سنگ آدمی درندہ بے دندان و چنگ

کوئی بھوکا نہیں رہتا

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ہم نے حکومتِ الٰہی کے اس شعبۂ نظام کے متعلق ارشادات پر اکتفا کیا ہے تفصیل اس اجمال کی طویل ہے لیکن اس نظام کا آخری اور زندہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو اس نظام کی حفاظت میں لے آتا ہے وہ کبھی بھوکا نہیں سو سکتا وہ کسی کا محتاج نہیں ہو سکتا اس کے رزق کی ذمہ داری اس نظام پر عائد ہو جاتی ہے۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے اس عہد کے کیا معنی ہیں کہ۔

وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ۔ ۱۱/۶

روئے زمین پر کوئی بھی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ نے نہ لیا ہو۔

دیکھنے کو تو یہ آیتِ مقدسہ ایک چھوٹا سا جملہ ہے لیکن غور فرمائیے کہ اس کے اندر نظامِ انسانیت کا کس قدر

مہتم بالشان اصول کارفرما ہے۔ کیا انسان اپنے دماغ سے کوئی ایسا نظام وضع کر سکتا ہے جس میں صرف انسان ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اس نظام نے اپنے سر لے لی ہو؟ انسانی حکومت کی تاریخ کے کسی دور میں بھی آپ کو یہ چیز نہیں ملے گی۔ سب سے پہلی مرتبہ اس کا اعلان حکومت الٰہیہ کی طرف سے ہی ہوا اور اسی نے ہمیں بتایا کہ۔

کس نماند و جہاں محتاج کس — نکتۂ شرع مبیں این است و بس

یہ چیز آپ کو صرف اسی نظام میں ملے گی کہ امت کا بلند ترین فرد امیرالمومنین روٹی کا ایک لقمہ اپنے منہ میں نہیں ڈال سکتا جب تک اسے پورا اطمینان نہ ہو جائے کہ جس طبقہ کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد پیٹ بھر کر سکون کی نیند سو گیا۔ آج انسان کی حالت یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ پر ضابطہ خداوندی کی بجائے اپنے خود ساختہ ضوابط کو مسلط کر رکھا ہے اور جب اس نظام کے نتائج بھوک، افلاس، ذلت و نکبت، پریشانی و تباہ حالی کی شکل میں سامنے آتے ہیں تو اس کا الزام خدا پر دھرتا ہے۔ اور اس کے بعد ان مصائب کا حل پھر کسی اپنے ہی متعین کردہ نظام میں تلاش کرتا ہے حالانکہ اگر وہ اپنے آپ کو خدا کے نظام کے حوالہ کر دے تو پھر دیکھے کہ یہ تمام مشکلات کس طرح خود بخود آسان ہو جاتی ہیں۔ نظام اپنے اوپر مسلط کر لینا طاغوتی اور نتائج تلاش کرنا ملکوتی! اگر کھلی ہوئی جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟ زلزلہ میں بوسیدہ مکان کے اندر پناہ لینے والے کا انجام ہلاکت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ خدا کی چھت کے نیچے آئیے اور پھر دیکھئے کہ وہ آپ کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے یا نہیں!

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا ؕ

جو غیر خدا کے سرکش نظام سے منہ موڑ کر اللہ پر ایمان لے آئے تو اس نے ایک بہت محکم اور پائیدار سہارا تھام لیا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

یہ پائیدار سہارا وہ نظام خداوندی ہے جس کے بعد دنیا کے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ انسان کی ذہنیت بدل دیتا ہے۔ ساری دنیا کی کیفیت بدل دیتا ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

---

(۲) قوت POWER. اس عالم کون و فساد میں دوسرا انسانیت سوز فتنہ قوت کا غلط استعمال ہے قوت درحقیقت دولت ہی کے عملی نتیجہ کا نام ہے سرکشی و تمرد. استبداد و ذہنیت بلا گنج قارون کہاں پنپ سکتی ہے پھر جس طرح دولت بجائے خویش بری چیز نہیں بلکہ اس کا غلط استعمال ہلاکت آفریں ہے اسی طرح قوت کے اندر بھی بجائے خود کوئی خرابی نہیں البتہ اس کا بیجا استعمال تباہی و بربادی کا ایسا بلاانگیز طوفان پیدا کرتا ہے کہ

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

حکومت الٰہی میں قوت پر ایسی پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں کہ وہ ایک سرکش طوفان بننے کے بجائے ساحلوں میں بکھرا ہوا دریا بن جاتی ہے جس سے ہزار قسم کے فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں نظام خداوندی میں قوت ظلم و ستمگری کی حمایت کے لئے نہیں بلکہ ظالم و قہرمان کا جور و ستم روکنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے وہ غاصب و سفاک کی شمشیر بے نیام نہیں بنتی بلکہ مظلوم و ستم رسیدہ کے لئے سپر کا کام دیتی ہے سچ ہے کہا گیا ہے کہ قوت.

لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

آزادی مذاہب تاریخ عالم شاہد ہے کہ استبداد کا آہنی پنجہ سب سے پہلے حریت فکر و آزادی مذہب کا گلا پکڑتا ہے ساحرین فرعون نے جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حق و صداقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے تو انہوں نے بلا تامل اپنے ایمان کا اعلان کر دیا اس پر فرعون کی آنکھوں سے جلال کے

عدل و انصاف اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی قوم تمہارے ساتھ دشمنی کرے تو تم ان کے بارے میں عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو یہ نہ ہو کہ ان کی عداوت کی بنا پر تمہارے دل میں انتقام کے جذبات پیدا ہوں اور ان جذبات کی تسکین کے لئے تم بے انصافی پر اتر آؤ۔

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ؕ

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے بے انصافی کرنے لگو۔

آپ اقوامِ گذشتہ کی تاریخ کے اوراق الٹ جائیے سیاستِ عصرِ حاضرہ پر گہری نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ کہیں کسی ایک جگہ بھی آپ کو یہ بلند اصول دکھائی دیتا ہے؟ کیا انسانوں کے وضع کردہ نظام و دستور میں یہ ممکن ہے کہ معاندت و عداوت کا جواب عدل و انصاف سے دیا جائے۔ اس سے بھی آگے بڑھئے۔ دشمن برسرِ پیکار ہے اس کی قوم کا کوئی فرد آپ سے پناہ کا طالب ہے ارشاد ہے کہ اسے پناہ دو۔ خدا کا کلام سناؤ اس کے بعد اگر وہ اپنے ہاں واپس جانا چاہے تو اپنی حفاظت میں اسے اس کی جائے امن تک پہنچا دو۔ (۹/۶)

"جنگ اور قرآن کریم" کے عنوان پر کسی دوسری فرصت میں مفصل لکھا جائے گا[1] اس وقت صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ خدا کی حکومت میں جنگ، فتنہ و فساد کے استیصال کی خاطر ہے نہ کہ فتنہ و فساد پھیلانے کی غرض سے۔ اگر مقصد محض تسخیرِ ممالک ہو، جوع الارض کی تسکین ہو تو وہ جنگ سلطنت کی جنگ ہو جاتی ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا لیکن اگر جنگ کی غرض جور و استبداد کے بجائے حکومتِ الٰہی کا قیام ہو جس میں انسانیت کو صحیح آزادی حاصل ہوتی ہے تو یہ جنگ عین منشائے فطرت کے مطابق ہوتی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ ایک ماہر ڈاکٹر مہلک ناسور کا اپریشن مریض پر ظلم ہے۔

شر گردد چو مقصود است غیر	گر خدا باشد غرض جنگ است خیر
گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند	جنگ باشد قوم را نا ارجمند

جب قوت و اختیار ضابطِ خداوندی کے ماتحت حاصل ہوتا ہے تو وہ جماعت جو قوانینِ الٰہی کے نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے اس انداز کی ہوتی ہے کہ

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "معارفِ القرآن" عنوان جہاد۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ

وہ لوگ جو متمکن فی الارض ہوتے ہیں تو اس لئے کہ نظام صلوٰۃ مستحکم کریں نوعِ انسان کی ربوبیت کا سامان بہم پہنچائیں ہر جگہ عدل و انصاف (نیک امور) کا حکم جاری کریں اور ظلم و تشدد کی بُری باتوں کو روک تھام کریں۔

اس جماعت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف وصل و فصلش بہر اعلی لا یخاف

نہ وہ کسی کے بیجا رعایت کرتے ہیں نہ کسی سے ڈرتے ہیں ان کی صلح اور دشمنی دونوں حق و انصاف پر مبنی ہوتی ہیں۔

یہ ہے اجمالی سا خاکہ اس حکومت الٰہی کا جس کے قیام کے بعد انسان وحشت و درندگی، سبعیت و بربریت کی زندگی چھوڑ کر صحیح آدمیت کی زندگی اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح وہ ارتقائی منازل طے کرتا ہے جن کے بعد وہ اس نصب العین تک پہنچ سکتا ہے جس کا حصول اس کی تخلیق کا مقصد ہے وَذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔

اسلام اور مذہبی رواداری

نوشتہ جون ۱۹۲۹ء

غالباً آپ نے سنا ہوگا کہ ایک مکتب میں جب بچوں کو شرارت سوجھتی اور وہ مولوی صاحب کے پنجۂ استبداد سے کم از کم کچھ وقت کے لئے چھوٹنا چاہتے تو وہ منظم سازش کرتے۔ ایک آتے ہی کہتا ادھر! قبلہ خیریت ہے آج نصیبِ اعدا کچھ طبیعت مضمحل سی نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھائی رات کچھ دیر سے سویا اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ بات گزشت۔ دوسرا آتا اور السلام علیکم کے بعد مولوی صاحب کے چہرے پر متردّدانہ نگاہ ڈال کر پوچھتا کہ مولانا خیریت ہے! آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں چہرے پر کچھ نقاہت کے آثار بھی ہیں مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں کچھ اعضا شکنی سی محسوس ہو رہی ہے۔ تیسرا ابھی آکر بیٹھنے بھی نہ پاتا کہ ایک گہری تشویش سے پوچھتا کہ مولوی صاحب مزاجِ گرامی میں کچھ خرابی سی نظر آرہی ہے۔ اب مولوی صاحب کا دل بھی ڈوبنا شروع ہوا۔ فرماتے کہ ہاں کچھ علالت سی محسوس ہو رہی ہے چوتھا طالب علم ابھی آنے بھی نہ پاتا کہ مولوی صاحب لحاف اوڑھے حجرے میں دراز ہیں اور نبض پر ہاتھ رکھو تو سچ مچ تپ چڑھ رہی ہے۔

پروپیگنڈے کا اثر

مولوی صاحب کے بخار آجانے کا واقعہ افسانہ ہو یا حقیقت لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ پروپیگنڈا اگر منظم

طریقے سے کیا جائے تو فی الواقع قلب ماہیت پیدا کر دیتا ہے۔ اشیاء کی نوعیت اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے زاویے بدل دیتا ہے جو چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے تسلیم کرا لیتا ہے یہی وہ سحرِ سامری ہے جس کی نگاہ بندی سے قوموں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا۔ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی عینک سے ہیں کان اپنے ہیں لیکن سنتے کسی اور کے آلۂ صوت سے ہیں دل اپنے ہیں لیکن سوچتے کسی اور کے دماغ سے ہیں أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ بالکل ہز ماسٹرز وائس ہوتے ہیں۔

اسلام کے ساتھ بھی دنیا میں یہی ہوا اس نے ابھی اپنی تربیت گاہ سے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ یورپ کے ارباب حل و عقد کو اس سے خواہ نخواہ ایک خطرہ محسوس ہوا اور انھوں نے اس کا بہترین علاج یہی سوچا کہ اسلام کو اس کے اصلی خد و خال میں کہیں ظاہر ہی نہ ہونے دیا جائے ارباب سیاست کے پیش نظر کچھ اپنی مصلحتیں تھیں۔ خداوندانِ مذہب اپنی سیادت کا تحفظ چاہتے تھے چنانچہ دونوں گروہ اس مشترکہ مقصد کو لے کر اٹھے اور زبان و قلم کے زور سے اسلام کی ایک ایسی بھیانک تصویر کھینچی کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی جب اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو کانپ کر رہ جائیں جب دولِ یورپ کا تسلط دیگر ممالک پر ہوا تو انھوں نے وہاں بھی اس مقصد کو فراموش نہیں ہونے دیا اور چونکہ قاعدہ ہے کہ حاکم قوم کی ہر ادا میں ایک شانِ خداوندی نظر آیا کرتی ہے لہٰذا قومِ یورپ نے اسلام کی تصویر کے جو ایڈیشن شائع کئے دل و دماغ کے چوکھٹوں میں فریم کرا کے رکھے گئے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیائے تہذیب و تمدن میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے قتل و غارت گری، بربادی، تباہی، ہلاکت و خونریزی، جور و تظلم، ستم و استبداد کے خونی مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں جن میں نظر آتا ہے کہ (معاذ اللہ) وحشی و خون خوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں سیلِ حوادث کی طرح کف بر دہاں بڑھتے چلے آ رہے ہیں جن کے جلو میں سبعیت و بربریت کے مجسمے ہولناک آہن پوش جنات کی شکل میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں میں امنڈتے چلے آتے ہیں اور اس قہرِ خداوندی

اسلام کی تصویر

اس سیلابِ بلا، اس طوفانِ بدتمیزی کے سامنے تہذیب و تمدن۔ علم و عمرانیت۔ عدل و انصاف۔ عفت و عصمت
مذہب و مسلک ایک ایک کرکے جڑ سے اکھڑتے چلے جاتے ہیں۔ مظلوموں کی فریاد، یتیموں کی آہ و بکا، بیواؤں کے نالہ و
فغان آسمان تک پہنچتا اور ٹکرا کر واپس آجاتا ہے گویا (نعوذ باللہ) اس خونخوار قوم کے خدا کا دروازہ ان سب کے لئے
بند ہے جہاں جہاں سے یہ قیامت صغریٰ گزرتی ہے آبادیاں ویرانہ بن جاتی ہیں۔ بستیاں اجڑ جاتی ہیں۔ کتب خانے
جل کر راکھ کا ڈھیر رہ جاتے ہیں تہذیب و تمدن کے آئینہ دار قصر شاہی کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں کہیں ٹوٹی
ہوئی صلیبوں کے انبار نظر آتے ہیں کسی جگہ زنار کا ڈھیر دکھائی دیتا ہے۔ مندر ویران ہیں۔ گرجے مسمار ہیں۔ نہ برہمن
کو کہیں امن ہے نہ کلیسا کے راہب کے لئے امن۔ نہ عورتیں محفوظ ہیں نہ بچے مصئون۔ کچھ قتل کر دیئے گئے جو باقی بچے
وہ ناک میں نکیل ڈلوائے حبشی سرداروں کے کوڑے کھاتے نخاس کی طرف گھسٹتے چلے جا رہے ہیں کہ وہاں لنابت
غلما دو دو ٹکوں میں فروخت کی جائے۔

غرضیکہ یہ ہے وہ "تصویر" جو اسلام کے نام کے ساتھ ہی سامنے آکر آنکھوں کی پتلیوں میں دہشت پیدا کرتی
ہے دیکھنے والے کانوں کو ہلا دیتی ہے۔ حقارت و تنفر انتقام و مواخذہ کے بخارات قلب سے اٹھ کر دماغ پر چھا
جاتے ہیں اور اسے اس عالم سوز تہذیب اور ننگ انسانیت تمدن کو امن و سلامتی کی دنیا سے مٹا دینے کی مختلف
تدابیر و خیالات کی جولانگاہ بنا دیتے ہیں آیئے آج کی مختصر سی صحبت میں دیکھیں کہ جس تصویر کا بیشتر حصہ آپ کے
سامنے ہے اس کے صحیح خطوط کیا ہیں اور جس تہذیب و تمدن کو تلوار اور آگ کی نسبت سے انسانیت سوز سمجھا جاتا ہے
اس کی اصلیت کیا ہے؟ اسلام کی صورت مسخ کرنے والوں کی یہ بے باک جرأتیں فی الحقیقت قابل داد ہیں کہ یہ سب
کچھ ایک ایسے دین کے متعلق پیش کیا جاتا ہے جس کا اصل دستور اساسی ایک ایک حرف اور نقطہ کی صحت کے ساتھ
آج دنیا کے ہر کتب فروش کی دکان سے مل سکتا ہے۔ اس مضمون میں ہم نہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خدا کی اس بادشاہت
میں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے گا۔ ہم اس وقت تعلیمی اسناد کے بجائے
تاریخی اشہاد سے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حکومت الٰہی میں پوری طاقت اور قوت کے ہوتے ہوئے محکوم و مفتوح غیر

کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اور انہیں بالخصوص مذہبی آزادی کس درجہ حاصل تھی اس مضمون میں ہم تاریخی شہادات بالعموم غیر مسلموں اور مورخوں کے حوالوں سے پیش کریں گے تاکہ کسی قسم کے تعصب، جنبہ داری، اور رجحانِ قلبی کا شائبہ نہ رہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ وہ سلطنت جسے ہم خدا کی بادشاہت کے مقدس نام سے منسوب کرتے ہیں قرنِ اولیٰ کے ایک مختصر سے عرصے پر مشتمل تھی اس کے بعد جو حکومت قائم ہوئی اسے آپ مسلمانوں کی سلطنت تو کہہ سکتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں خدا کی حکومت نہیں کہہ سکتے باایں ہمہ اس حکومت میں بھی چونکہ مسلمانوں کے سامنے اسلامی روایات کے کچھ نہ کچھ نقوش موجود تھے اس لئے غیر مسلموں سے رواداری کے باب میں اس زمانہ میں بھی ہمیں ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو دوسرے مذہب کی سلطنتوں میں معدوم ہیں۔

اگرچہ غیر اقوام کے ساتھ ربط و ضبط عہدِ رسالت مآب صلعم ہی سے شروع ہو گیا تھا اور فتح خیبر، یہود مدینہ اور فتح مکہ جیسے مقامات پر جس قسم کی رواداری کی مثالیں ملتی ہیں تاریخ ان کو پیش کرنے سے قاصر ہے لیکن بحیثیت مجموعی عہدِ فاروقی سے اس کا سلسلہ بڑھا ہے اور چونکہ اس عہد کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے ہم شروع ہی اسی عہد کے چند ایک واقعات پر نظر ڈالتے ہیں اسلامی عہدِ حکومت میں غیر مسلم رعایا کو ذمی کہا جاتا تھا جب یروشلم فتح ہوا تو وہاں کے ذمیوں کے ساتھ ایک عہد نامہ ہوا۔ اس کے اقتباسات سے اندازہ فرمائیے کہ بحیثیت فاتح، مغلوب و مفتوح قوم کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا گیا۔

یروشلم کے عیسائی

> یروشلم کی غیر مسلم رعایا کو ان کی جان و مال اور معابد و عبادت گاہوں، صلیبوں اور ہر اس چیز کی جو ان کی عبادت میں ہے حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے ان کی زمینوں اور ان کے مذہب میں کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے گا ان کے گرجاؤں کو نہ تو منہدم کیا جائے گا اور نہ کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے گا۔ ان کے اوقاف و دوسرے حقوق بحال رکھے جائیں گے۔ اہل یروشلم کو اپنے مذہب کی پابندی میں ہر قسم کی آزادی ہوگی اور ان پر کسی قسم کا ظلم و ستم روا نہ رکھا جائے گا۔[1]

---

[1] The Eclips Of Christianity in Asia - by Lawrence

فتح یروشلم کے بعد جب حضرت عمرؓ گرجے کا ملاحظہ فرما رہے تھے تو نماز کا وقت آگیا بطریق نے کہا کہ آپ یہیں نماز ادا کرلیں لیکن آپ نے اس سے اس بناء پر انکار کر دیا کہ مبادا بعد میں آنے والے مسلمان سنتِ عمرؓ کی تقلید میں اس گرجے کو مسجد میں تبدیل کرلیں تالیفِ قلوب۔ بالغ نظری اور مذہبی رواداری کا یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے مروایم میور جیسا متعصب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور اس نے اپنی کتاب The Caliphate-Its Rise Fall میں اس کا ذکر کیا ہے حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب دیگر تمام اقوامِ عالم میں مذہبی تعصب جنون کی حالت تک پہنچ چکا تھا اسی یروشلم میں مسلمانوں کی فتح سے پیشتر ہرقل نے ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ فلسطین، شام، ایشیائے کوچک اور مصر سے تمام یہودیوں کے اخراج کا حکم عام تھا اور ان پر جس قدر مظالم توڑے جاتے ان کی کہیں دادرسی نہ ہو سکتی تھی غیر مذہب والوں سے ہی نہیں بلکہ خود عیسائی جو اس خاص فرقہ(1) سے متعلق نہ تھے جس کا ہرقل پیرو تھا ہر قسم کے مظالم کا شکار ہوتے تھے چنانچہ یعقوبی فرقہ کا ایک بطریق لکھتا ہے کہ:-

> "ہرقل نے اپنی مملکت میں اعلان کر رکھا تھا کہ جو عیسائی اس کے مشرب و مسلک سے متعلق نہ ہو اس کی ناک اور کان کاٹ دیئے جائیں اور اس کا گھربار لوٹ لیا جائے یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں کو ہرقل اپنے سامنے نہیں آنے دیتا تھا ان کی کہیں شنوائی نہ ہوتی یہی وجہ تھی کہ خدائے برتر نے اسمٰعیل کے گھرانے سے ایک ایسی ہستی کو مبعوث کر دیا جس نے ہمیں ظالم رومیوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی چونکہ ان علاقوں کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے کسی عیسائی سے اس کے مذہب کے معاملہ میں تعرض نہ کیا جو معبد کسی کے قبضہ میں تھا وہ اسی کے پاس رہنے دیا اس سے یہ تو نہ ہو سکا کہ ہمارے چند ایک گرجے جن پر ...... قبضہ کر چکے تھے واپس مل جاتے لیکن ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رومیوں کے مظالم سے چھوٹ گئے اور ہمیں عربوں کے ساتھ امن کی زندگی میسر آئی" (2)

مصر میں

یہی حالت مصر میں تھی ایک آرمینین عیسائی بوصالح جو تیرھویں صدی کے شروع میں ہوا ہے لکھتا ہے:-

(1) Chalcedonian
(2) Chronique de Michel le Syrian- II- 412-413

یہ سب وقت تھا کہ شہنشاہ (قیصر) قدیم مذہب کے پرستار عیسائیوں پر بے حد ظلم و ستم کرتا تھا اور انھیں زبردستی اپنے فرقہ میں داخل کرنا چاہتا تھا چنانچہ قبطی اور مقوقس کے ہاتھوں میں حقیقت پسند عیسائیوں سے بے حد تکلیف اٹھاتے تھے جب مسلمان یہاں پہنچ گئے تو ملت حنیفیہ کی ایک قوم تھی جس نے رومیوں کے تخت و تاج کو توڑا اور مصر کو فتح کر کے یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں کو رومیوں کے مظالم سے نجات دلائی۔(1)

چنانچہ فتح مصر کے وقت حضرت عمرو بن عاصؓ نے تمام اہل مصر کو ایک شرائط نامہ لکھ دیا جس کی رو سے ان کے املاک، نفوس اور اولاد سب محفوظ تھیں ان کو کامل مذہبی آزادی حاصل تھی ان کے گرجے و معبد بالکل آزاد تھے اور دشمنوں کے حملوں سے ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ تھی۔(2)

دمشق میں

فتح دمشق کے وقت ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے بڑے بڑے مقنن اور سیاست دان سنتے ہیں اور انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں مسلم افواج دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں ایک طرف حضرت خالدؓ تھے دوسری طرف ابو عبیدہؓ۔ حضرت خالدؓ ایک رات خندق پار کر کے قلعہ کی دیوار پر چڑھ گئے نیچے اتر کر دروازہ کھول دیا اور مسلم فوج دراتی شہر میں گھس آئی عیسائیوں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو فوراً دوسری طرف جا کر چپکے سے حضرت ابو عبیدہؓ سے صلح کر لی چنانچہ ایک طرف سے حضرت خالدؓ بحیثیت فاتح شہر میں بڑھتے چلے گئے اور دوسری طرف سے ابو عبیدہؓ بحیثیت حلیف بڑھتے آئے وسط شہر میں دونوں فریق آملے نصف شہر بہرحال لڑائی میں فتح ہوا تھا اور اس حصہ کے ساتھ ان شرائط کے ماتحت سلوک ہونا چاہیے تھا جو بعد میں اہل دمشق سے بحیثیت فاتح طے ہوتیں لیکن حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا کہ چونکہ انھوں نے اہل شہر سے صلح کر لی ہے اور وہ انھیں امان دے چکے ہیں اس لئے ان سب کو حلیف ہی شمار کرنا چاہیے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اہل شہر سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا۔

اس عہد کے متعلق یونان کے مقنن اعظم سولن نے کہا ہے "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو الجھا لیتا ہے اور اپنے سے قوی کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے"۔

(1) The Churches and Monastries of Egypt- pp. 30-31
(2) The Preaching of Islam- Arnold.

جب مسلمانوں کی افواج وادیٔ جروان میں پہنچیں تو وہاں کے عیسائیوں نے حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا کہ: —

"اے مسلمانو! ہم تمہیں بازنطینی حکمرانوں پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ وہ ہمارے ہم مذہب ہیں اس لئے کہ تم معاملہ میں ان سے کہیں بہتر ہو اور ہم سے ہمیشہ عدل و انصاف سے پیش آتے ہو اور تمہاری حکومت ان سے بدرجہا اچھی ہے کہ انھوں نے تو ہمارے گھر بار ہم سے چھین لئے" [1]

حمص میں

حمص میں مسلمانوں نے کچھ عرصہ تک اپنی چھاؤنی رکھی عیسائیوں کی افواج نے جب دوبارہ حملہ کیا تو حمص کے عیسائیوں نے اپنے شہر کے دروازے بند کر لئے اور ان سے کہدیا جاؤ تم سے ان مسلمانوں کی حکومت ہزار درجہ بہتر ہے چنانچہ جب مسلمانوں کو فوجی ضرورت کے ماتحت کسی دوسری جگہ منتقل ہونا پڑا تو اہل شہر روتے تھے اور التجائیں کرتے تھے کہ خدا کے لئے جلدی واپس آنا کہیں رومن عیسائی پھر ہم پر حکومت کرنے کو نہ آجائیں۔ اللہ اللہ!

تو نخل خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن — ہمہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند

اسی حمص کا واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے ان سے سال بھر کا خراج وصول کیا لیکن چند مہینے بعد انہیں دوسری جگہ جانا پڑ گیا تو حضرت عمرؓ نے حکم بھیجا کہ فوراً خراج اہل شہر کو واپس کر دو کہ جب ان کی حفاظت ہی نہیں تو ان سے خراج کے بدلے میں خرچ کیسا۔ کیا ایسی مثالیں کسی اور تاریخ میں آپ کو مل سکتی ہیں؟

جبلہ کا واقعہ

جبلہ بن ایہم کا واقعہ مشہور ہے کہ جب طوافِ کعبہ کے دوران میں اس کی چادر ایک اعرابی کے پاؤں تلے آگئی تو اس نے اعرابی کے منہ پر طمانچہ مارا۔ اعرابی نے اس کا جواب ویسے ہی طمانچہ سے دیا۔ شہزادہ جبلہ نے حضرت عمرؓ کے سامنے اس کی شکایت کی لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام کے نزدیک ایک شہزادہ اور ایک ادنیٰ دہقانی کا ایک درجہ ہے اس پر اس نے پھر سے عیسائی ہو جانا چاہا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں ہمارے نزدیک تمہارے لئے تینوں راستے کھلے ہیں یا مسلمان رہو یا عیسائی ہو کر جزیہ ادا کرو یا جہاں جی چاہے چلے جاؤ چنانچہ وہ اپنی تیس ہزار فوج کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف چلا گیا [2]

(۱-۲-۳) The Preaching Of Islam- Arnold
Eclips of Christianity

جزیہ

مسلمانوں پر سب سے بڑا الزام جزیہ کے متعلق عائد کیا جاتا ہے اور ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ غیر مسلم رعایا سے یہ جرمانہ ان کے مسلمان نہ ہونے کے جرم کی بنا پر وصول کیا جاتا تھا حالانکہ اس کی حقیقت بالکل جداگانہ ہے۔ مسلمانوں کو اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ حکومت کو ادا کرنا پڑتا تھا اور اس کے علاوہ ہر قسم کی فوجی خدمت بھی ان کے ذمہ تھی۔ غیر مسلم رعایا جو مسلمانوں کے زیر حکومت رہتی تھی ان کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمان حکومت پر لازم تھی وہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھی ان سے فوجی خدمت کے بدلے تھوڑی سی رقم وصول کر لی جاتی تھی جس کی شرح زکوٰۃ سے بھی کم تھی نیز عورتیں، بچے، بوڑھے، اپاہج اور مذہبی رہنما اس سے مستثنیٰ تھے[1]

یہ بھی دیکھئے کہ اس جزیہ کی مقدار کتنی تھی۔ معمولی حیثیت والے سے چار سالانہ متوسط درجہ والے سے چھ اور اس سے آگے دولتمند کروڑپتی سے زیادہ سے زیادہ بارہ روپے سالانہ حالانکہ ایک کروڑپتی مسلمان سے کم از کم ڈھائی لاکھ روپیہ سالانہ بطور زکوٰۃ وصول کیا جاتا تھا۔ صدقات و خیرات اس کے علاوہ تھے اور اس مالی قربانی کے ساتھ ساتھ جب ضرورت آن پڑتی تھی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں بھی شریک ہوتا تھا اور ذمی رعایا کے مال، جان، مذہب، معابد کی حفاظت کرتا تھا یعنی ایک ذمی رئیس بارہ روپیہ ادا کر کے نہایت اطمینان سے چین کی بنسی بجاتا اور اسی حیثیت کا ایک مسلمان اڑھائی لاکھ روپیہ ادا کر لینے کے بعد اس ذمی کے محافظ کی حیثیت سے میدان کارزار میں دشمن کی شمشیر و سنان کا مقابلہ کرتا۔ دشمن کی گولیاں ہوتیں اور مسلمانوں کا سینہ اور غیر مسلم رعایا کی حفاظت کے لئے یہ کام دیتا۔ مسلمانوں سے پہلے ساسانیوں نے عیسائی رعایا پر جو ٹیکس لگا رکھے تھے وہ مسلمانوں کی رعایا سے الگ ہوتا تھا۔ اور اس کے جواز میں شاہ سپور دوم نے کہا تھا کہ لڑائی ہمیں لڑنی پڑتی ہے اور یہ مزے میں بیٹھے رہتے ہیں وہ ٹیکس کیوں نہ ادا کریں[2]۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں جب کوئی غیر مسلم فوجی خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیتا تو اس سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا چنانچہ جراجمہ کے عیسائی قبیلہ نے اس رعایت سے فائدہ اٹھایا۔ اہل حیرہ نے جزیہ دیا تو ان سے یہ شرط تھی کہ ان پر خواہ مسلمان حملہ آور ہوں خواہ غیر مسلم ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہو گی۔ ہم حمص کے واقعہ میں دیکھ چکے ہیں کہ جب مسلمان حفاظت

[1] Khalifs And Their Non-Muslim Subjects - Tritton
[2] Introduction To The History Of The Assyrian Church - Arnold's

صلیبی لڑائیاں

"اگر خلفائے عباسیہ چاہتے، تو جس طرح ازابلا اور فرڈی ننڈ نے ہسپانیہ سے اسلام کو خارج کر دیا تھا یا لوئیس چہار دہم نے فرانس میں پروٹسٹنٹ کے عیسائی فرقہ کو مجرم قرار دے دیا تھا وہ بھی ایشیائے کوچک سے عیسائیت خارج کر دیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔" ط

انہی صلیبی لڑائیوں کا ذکر ہے۔ ایک دفعہ ایک سرہنگ، فرنگی فوج سے ایک شیر خوار بچہ اٹھا لایا اس کی ماں رنج و غم سے بے قرار ہو گئی اور اپنے سرداروں کے پاس جا کر روئی انہوں نے کہا کہ سلطان صلاح الدین ایک سچا مسلمان ہے اس کی خدمت میں جا کر عرض کرو وہ روتی ہوئی آئی اور اپنی داستان سنائی سلطان یہ کہانی سنتا جا رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے وہ اپنی کہانی ختم کر چکی تو سلطان غصہ سے کانپ رہا تھا خود اٹھا ساری فوج میں تلاش کیا معلوم ہوا کہ بچہ بیچ دیا گیا ہے اس کے دام ادا کر کے بچہ کو واپس منگایا اور اس کی ماں کی گود میں دے دیا اور سوار کرا کے عزت کے ساتھ واپس پہنچا دیا۔

جس زمانہ میں سلطان رملہ کے متصل خیمہ زن تھا یافا میں انگلستانی بادشاہ رچرڈ بیمار پڑا رچرڈ کے پاس اس وقت صرف دو تین سو سپاہی تھے سلطان نے حکم دیا کہ بیمار دشمن پر حملہ کرنا کسی صورت میں جائز نہیں رچرڈ کے پاس کوئی انتظام نہیں تھا سلطان اسے روزانہ برف اور میوہ بھیجتا تھا اور بعض مورخ تو لکھتے ہیں کہ سلطان خود طبیب بن کر اسے دیکھنے گیا اور اس کا علاج بھی کیا۔

جب فرنگی بیت المقدس میں سلطان کے محاصرہ سے تنگ آ گئے تو امان کے طالب ہوئے اس نے امان دے دی اور کہا کہ تمام فرنگی چالیس دن کے اندر اندر یہاں سے نکل جائیں جب اسلامی فوج شہر میں داخل ہوئی تو سپاہیوں نے دیکھا کہ فرنگی اشرفیوں کے صندوق بھرے لئے جا رہے ہیں سلطان سے جا کر کہا کہ فاتح فوج بھی غنیمت سے کیوں محروم کی جاتی ہے اس نے کہا۔ درست ہے لیکن بد عہدی ہمارا شیوہ نہیں۔

سلطان مراد ثانی کے مقابلہ میں جب صلیبی لشکر ہونیاد کی قیادت میں جو کیتھولک تھا میدان توصوہ میں سخت ذلت اس وقت ہونیاد کے ساتھی سلطان سربیا نے اس سے پوچھا کہ اگر تم کو فتح حاصل ہو گئی تو کیا کرو گے

ط Eclips of Christianity

اس نے کہا سب کو کیتھولک بنا کر چھوڑوں گا لیکن جب یہی سوال سربیا نے مراد کے پاس بھیجا تو اس نے جواب میں لکھا کہ میں اگر کامیاب ہوا تو ہر مسجد کے پہلو میں ایک ایک کینسہ بنانے کی اجازت دے دوں گا تاکہ جس کا جی چاہے مسجد میں آئے جس کا جی چاہے کنیسہ میں جائے اس کا اثر یہ ہوا کہ شاہ سربیا نے ہونیاد کا ساتھ چھوڑ دیا جس کی وجہ سے صلیبیوں کو شکست اٹھانی پڑی۔

ایک بار ایک عثمانی مفتی سے کسی نے سوال کیا کہ اگر دس مسلمان ایک یہودی یا عیسائی ذمی کے قتل میں شریک ہوں تو کیا وہ سب کے سب قصاص میں مارے جائیں گے مفتی نے جواب دیا کہ بیشک دس نہیں ایک ہزار بھی۔

اگرچہ یہ شہادتیں تاریخی اعتبار سے کچھ کم وقیع نہیں لیکن عہد اسلامی میں غیر مسلم رعایا کی حالت کے متعلق کچھ ایسے بیانات بھی موجود ہیں جن پر کسی خارجی اثر یک طرفہ میلان و رجحان یا کسی دباؤ کا امکان نہیں ہو سکتا۔

دشمن کی شہادت اس زمانہ کے بعض عیسائی بطریق اور دیگر پادری اپنے اسقف وغیرہ کو خطوط لکھتے رہتے تھے اتفاق سے ان میں سے بعض خطوط دستیاب ہو گئے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی رعایا فی الواقع مسلمانوں کے عہد حکومت سے مطمئن اور خوش تھی ورنہ ظاہر ہے کہ اگر انھیں کچھ بھی تکلیف ہوتی تو وہ اس کو بڑھا چڑھا کر لکھتے ہم ان خطوط میں سے بعض کے اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں :۔

بطریق یشوعیب سویم دیوار دشیر (فارس) کے سایمن کے نام ایک خط کے دوران میں لکھتا ہے :—

"یہ طے یا عرب جن کو خدا نے اس زمین کی حکومت عطا کی ہے آپ کو علم ہی ہے کہ اب ہمارے پاس رہتے ہیں لیکن انھوں نے کبھی ہمارے مذہب پر حملہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ہمارے مذہب کی عزت کرتے ہیں ہمارے پادریوں و خدائے مسیح کے اولیاء کی تعظیم کرتے ہیں اور کلیساؤں اور خانقاہوں پر ان کی طرف سے الطاف و اکرام کا سلوک کیا جاتا ہے"[1]

چونکہ اس بطریق کا زمانہ قریباً ۶۵۰ء لغایۃ ۶۶۰ء ہے اس لئے مصرحہ بالا خط حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ

---

[1] Eclips of Christianity Assemani -III. Pt. II

تین سو سال بعد تک کے مورخین کے بیان کے مطابق عراق۔ فارس۔ کرمان۔ خراسان، آذربائیجان میں آتشکدے موجود تھے۔ المعتصم کے عہد میں ایک جرنیل نے ایک امام مسجد اور موذن کو دُروں سے پٹوایا جن کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک پرانے آتشکدے کو مسجد میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ شیراز میں گیارھویں اور تیرھویں صدی تک غیر مسلم رعایا کے تیوہاروں کی تقریب میں شہر کے بازار آراستہ کئے جاتے اور یہ تیوہار بڑی دھوم سے منائے جاتے تھے۔[1]

اسلام کی تعلیم کا کچھ ایسا حیرت انگیز اثر ہے کہ وہ گویا انسان کی فطرت ہی بدل دیتی ہے چنگیز خان اور ہلاکو خان کے چغتائی اور منگول قبائل تاریخ عالم میں وحشت و بربریت کے مجسمے تصور کئے جاتے ہیں ہر زبان میں

منگول

ان کا نام آتش و خون کے حروف میں لکھا جاتا ہے اس سے ان کے مذہبی تعصب و جنون کا اندازہ کیجئے چنگیز خان اور بعض اور خانوں کے عہد حکومت میں یہ حکم عام تھا کہ جو شخص مسلم قوم کے طریق پر کوئی جانور ذبح کرے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اسے قتل کر دے لیکن یہی قبائل جب اسلام کے آغوش میں آئے تو ان کی مذہبی رواداری کی یہ کیفیت تھی کہ ازبک خان نے پیٹر کے اسقف کے نام ۱۳۱۳ء میں ایک منشور لکھا جس میں درج تھا کہ کوئی شخص حدود سلطنت کے اندر کسی عیسائی کے گرجہ کو نقصان نہ پہنچائے گا۔ اس کی جائداد نہیں چھینے گا اور اس کے مذہب سے قطعاً تعرض نہیں کرے گا جو ایسا کرے گا وہ حکومت کی جانب سے سزا کا مستوجب ہوگا اور اپنے خدا کے حضور اس کا جواب دہ۔"[2]

ہندوستان میں

ہندوستان کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں حاصل ہے یہاں مسلمانوں کے عہد حکومت میں مذہبی رواداری کا ثبوت ہندوؤں کی مردم شماری ہے ہندوستان میں قریب ایک ہزار سال مسلمانوں نے حکومت کی اور اس میں ایسے ایسے وقت بھی آئے کہ کشمیر سے میسور تک اور گجرات سے بنگال تک ایک ہی مسلمان بادشاہ کا سکہ رواں تھا لیکن پھر بھی سلطنت مغلیہ کے اختتام پر مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ سے کم تھی[3] اور جب تلوار ہاتھ سے نکل گئی تو اس تھوڑی مدت کے عرصہ میں وہ تین گنا ہو گئی ان اعداد و شمارات

(1) The Caliphs And Their Non-Muslim Subjects (2) Arnold

[3] ڈاکٹر ہنیٹ کے ایک بیان کے مطابق جب ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں گئی تو مسلمانوں کی آبادی کا دسواں حصہ تھی۔ دیگر گورنمنٹ آف انڈیا کی مردم شماری کی رپورٹ بابت ۱۸۹۱ء کی رو سے مسلمانوں کی آبادی کا پانچواں حصہ یعنی ۵ کروڑ ہیں ۔۔۔ کی مردم شماری کی رو سے ۸ کروڑ

دینے والا ہے اور کسی حالت میں بھی رشتۂ عدل و انصاف کو ہاتھ سے چھوٹنے کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے خدا کا اعلان یہ ہے کہ :-

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۔ (۵:۸)	کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو۔ عدل کرو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

اور انہی واقعات کو دیکھنے کے بعد ایک عیسائی مصنف یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ :-

"تاریخ (کے واقعات) جو پہلے اس کتاب کے صفحات پر بے نقاب کئے ہیں ظاہر کر رہے ہیں کہ اسلام ایشیا کے عیسائیوں سے "بزور شمشیر" نہیں منوایا گیا بلکہ اس کی اشاعت مسلمانوں کی روز افزوں ترقیوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔"

برعکس اس کے۔

"صلیبی لڑائیاں لڑنے والوں کے دل میں سب سے پہلے آرزو یہ تھی کہ وہ جناب مسیح کے لئے "بزور شمشیر" ایک سلطنت حاصل کر لیں۔"

The Eclips of Christianity In Asia. PP. 183-184 & 143

(نوشتہ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء)

بلا کی کالی رات تھی سامنے پہاڑ کی ٹیا سے دو آدمی نیچے اتر رہے تھے ایک کے پاس روشنی تھی اور انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ دوسرے شخص کو راستہ دکھانے کی غرض سے ساتھ ہے۔ دوسرے آدمی نے کہا بھائی! روشنی میرے آگے آگے رکھو تاکہ راستہ روشن ہو پیچھے رکھنے سے تو الٹا خود میرے ہی سایہ سے راستہ تاریک تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی تھوڑی دیر میں وہ دونوں نظر سے اوجھل ہو گئے پھر وہی تاریکی اور وہی سناٹا تھا لیکن اس جانے والے کا فقرہ ابھی تک میرے دماغ میں گونج رہا تھا میں نے سوچا کہ روشنی کا مقصد یہ ہے کہ وہ تاریکیوں کے پردے کو چاک کرتی چلی جائے لیکن یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ روشنی کو اس کے صحیح محل پر رکھا جائے اللہ تعالیٰ نے جب دنیا میں اس قوم کو بھیجا جس کے متعلق خود فرما دیا:۔

آسمانی روشنی

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

تم بہترین قوم ہو جو نوعِ انسان کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

تو ان کو ہلاکت و تباہی کے عمیق غاروں سے بچانے کے لئے یک مشعلِ ہدایت، ایک سراجِ منیر، یک نورِ مبین،

لہٰذا اپنی زندگی میں قرآن کریم کو اس کی صحیح جگہ پر نہ رکھنا ہر معاملہ و ہر مسئلہ میں خالی اللہ تعالیٰ ہدایت کی روشنی میں قدم نہ اٹھانا قرآن کی نظر میں کفر ہے، ایمان نہیں۔

کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دینا

اب سوال یہ ہے کہ کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دینے سے مطلب کیا ہے۔ آپ کو کوئی مسلمان ایسا نہیں ملے گا جو اس بات کو تسلیم کرے کہ اس نے قرآن کریم پس پشت ڈال رکھا ہے یا اس کا قرآن پر ایمان نہیں۔ لیکن قرآن صرف اسیقدر اعتراف کو کوئی وقعت نہیں دیتا اس کے نزدیک ایمان و ایقان کی صداقت کا ثبوت یہی ہے کہ انسان کے اعمال اس اعتراف کی شہادت دیتے ہوں مثلاً دیکھئے اہل ایمان کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ اگر تم خلاف ارشاد خداوندی ربٰو میں بڑھ گئے تو تمہارے لئے وہی جہنم ہے جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا	اے ایمان والو ربوا مت کھاؤ دونے پر دونے کئے
مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ وَ	ہوئے۔ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔
اتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۱۳۰-۱۲۹-۲	اور اس آگ سے ڈرو جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے

عام طور پر آپ کو دو قسم کی جماعتیں ملیں گی ایک تو وہ لوگ جو دنیا میں صحیح اور غلط ہونے کا معیار خود اپنی عقل کو ہی سمجھتے ہیں ہر معاملہ کا اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں اور اپنی فیصلوں کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں چونکہ یہ لوگ عقل کا بے محل استعمال کرتے ہیں اس سے ان کو ظالم کہا گیا اور ان کے متعلق ارشاد ہوا:۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُم	لیکن ان ظالموں نے بلا علم و دلیل اپنی
بِغَيْرِ عِلْمٍ فَمَن يَهْدِي مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ	خواہشات (نفسانیت) کا اتباع کر رکھا ہے سو
وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ۔	جسے خدا گمراہ کرے اسے کون راہ راست پر لائے
۳۰-۲۹	اور ان کا کوئی مددگار نہیں ملے گا۔

چونکہ تنہا عقل کے فیصلے یقینیات پر مبنی نہیں ہوتے[1] اس لئے قرآن کریم نے یقینی اور حقیقی علم علم کتاب کو کہا ہے اور جو علم الکتاب نہیں رکھتا اس کے متعلق یہی کہا کہ وہ محض قیاس آرائیاں کرتا ہے وہ ذہن انسانی کی ابلہ فریبیوں سے طرح طرح کی منطقی موشگافیوں اور قسم قسم کی فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں کے حلقۂ دام فریب میں الجھا رہتا ہے اور عروسِ حقیقت اس کے سامنے کبھی بے نقاب نہیں ہوتی:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ۔ (۲: ۷۸)

اور ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو کتاب کا علم تو کچھ نہیں رکھتے سوائے اس کی لفظی تلاوت کے یہ لوگ محض قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں

لیکن ظن حقیقت کے مقابلہ میں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ - ۳۶-۱۰

اور ان میں سے اکثر محض ظن کا اتباع کرتے ہیں اور یقیناً ظن حق کے مقابلہ میں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا اور اللہ ان کے اعمال سے واقف ہے:

دو قسم کی جماعتیں

یہ جماعت کبھی سعادت و نجات کی راہ نہیں پا سکتی کیونکہ انھوں نے اپنے رجحانات ہی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے لیکن ان کے علاوہ ایک اور جماعت بھی ہے جس نے قرآن کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور یہ جماعت اس پہلی جماعت سے بھی زیادہ خطرناک وادیوں میں سرگرداں ہے۔ مقدم الذکر جماعت کی خطا و لغزش کا راز ان کے کیرکٹر کی کمزوری ہے۔ قوتِ ایمان کا فقدان ہے۔ وہ

---

[1] تنہا عقل انسانی راہنمائی کے لئے کیوں ناکافی اور ناقابل اعتبار ہے اس کی تفصیل اس موضوع سے خارج ہے اور ایک مستقل عنوان کی محتاج۔ اس وقت اس باب میں جوڈ کے بیان کا مختصر سا اقتباس پیش کرنا کافی ہوگا۔ لکھتا ہے۔ عقل فی الحقیقت ہماری خواہشات کی لونڈی یا بعض ہوتے کا ملانے کا ایک آلہ ہے عقل کا کام یہ ہے کہ وہ ان مقاصد کو ہمارے لئے مہیا کر دے جنہیں ہمارا نفس ہمارے لئے تجویز کر رہا ہے اور اس اندازے کو جو ہمارا نفس غیر شعوری طور پر کرنا چاہتا ہے اس کے جواز میں دلائل و براہین تراش دے:

ادھر اور ہم جنت کی دعوت دیں گے وہ تڑپ اٹھیں گے کہ ان کے معتقدات ان سے چھن رہے ہیں اور معتقدات
(غلط ہوں یا صحیح) قلب انسانی کے لئے گرانبہا متاع ہوتے ہیں اور وہ انہیں یوں لٹتے نہیں دیکھ سکتا وہ معتقدات
بھی ایسے جو نسلاً بعد نسلٍ آباؤ اجداد سے ترکہ میں متوارث چلے آ رہے ہوں ان کے ہاں نہ صرف معتقدات ضائع ہونے
ہی کا صدمہ ہوتا ہے بلکہ آباؤ اجداد کی تنقیص و تحقیر ہو جانے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے جب یہود نے یہ کہا تھا کہ ہم اپنے
آباؤ اجداد کے طریقوں پر ہی چلیں گے تو آباؤ اجداد سے مراد نبی اسرائیل نہیں تھے بلکہ ان کے متقدمین احبار و رہبان
ہی تھے اس لئے کہ قرآن کریم میں جب یہ آیت نازل ہوئی کہ انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدا بنا رکھا تھا تو نبی
اکرم صلعم سے عرض کیا گیا کہ وہ انہیں خدا بنا کر پوجتے تو نہیں تھے تو آپ نے فرمایا کہ وہ اس چیز کو حلال سمجھتے تھے جسے
ان کے علماء حلال کہہ دیتے تھے اور اس کو حرام جسے وہ حرام قرار دیتے تھے ظاہر ہے کہ جس طریق پر یہ لوگ چل رہے
تھے وہ بھی شریعت مذہبی قوانین تھے اور یہ صرف یہود و نصاریٰ تک ہی محدود نہیں۔

تقلیدِ اسلاف

قرآن کریم نے امم سابقہ میں سے ہر امت کے متعلق فرمایا:-

> اور تجھ سے قبل کوئی رسول کسی بستی میں نہیں آیا جس سے وہاں کے راحت پسند لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ
> ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک طریق پر پایا اور ہم انہیں کے نشانات کی تقلید کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں
> پیغمبر نے کہا کہ خواہ میں تمہارے پاس اس سے بہتر مقصود پر پہنچانے والا راستہ جس پر تم نے اپنے آباؤ کو پایا ہے کیوں نہ
> لے آؤں (تو تم اسی پر چلو گے) کیا؟ انہوں نے کہا کہ ہم تو اس سے انکار کرتے ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے
> گئے ہو۔ (۴۳ : ۲۳-۲۴)

آج مسلمانوں کی مجموعی جماعت کی حالت پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ بعینہٖ یہی حالت ان کی ہو رہی ہے
یا نہیں۔ یہ وہ جن باتوں کو عین دین سمجھ رہے ہیں ان میں سے بہت کم کی سند کہیں قرآن تک جا کر رک
جاتی ہے۔ بشرطیکہ خداوندی شریعت ہی کا کہیں نام نہیں آتا۔ کیا یہی وجہ انکار نہیں؟ کیا ایک عقیدہ،
ایک فیصلہ، ایک قانون محض اس لئے تجربی طرح مستقیم اور منزہ عن الخطا ہو سکتا ہے کہ اسے اسلاف میں سے کسی

کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا جائے۔ مسلمان قرآن کریم کو خدائے حی و قیوم کا ابدی قانون مانتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ صراطِ مستقیم وہی ہے جو اس سراجِ منیر کے اندر چمکتا ہوا نظر آتا ہے لیکن باایں ہمہ کیا ان لوگوں نے کبھی اس کی ضرورت بھی سمجھی ہے کہ جو باتیں اسلاف کی کتابوں میں لکھی گئی ہیں انہیں اس صراطِ مستقیم سے مطابقت دے لی جائے؟ قرآن کریم میں تو یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر زمانہ کی ضروریات کے لئے روشنی دیتا جائے لیکن جو باتیں انسان کی پیدا کردہ ہیں وہ تو بہرکیف ماحول سے متاثر اور اپنے اپنے زمانہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ انسانی خیالات کا تو یہ عالم ہے کہ ایک شخص زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف خیالات قائم کرتا اور ان میں ترمیم و تنسیخ کرتا رہتا ہے۔ جب ایک انسان کی مختصر سی زندگی میں اس کے خیالات قابلِ تغیر ہو سکتے ہیں تو حیرت ہے کہ اس کے بعد زمانہ خواہ کہاں سے کہاں چلا جائے اس کے خیالات وحی الٰہی کی طرح ناقابلِ تغیر سمجھے جائیں گے۔ قرآن کریم صحیفۂ فطرت ہے۔ فطرت کی کسی چیز کو دیکھئے وہ کسی خاص زمانہ سے مقید نہ ہوگی۔ یہ کبھی نہ ہوگا کہ اس شے کے متعلق جو کچھ تجارب و مشاہدات کسی ایک زمانہ میں عمل میں آ چکے ہوں اس کے فوائد و خصائص جو کسی وقت معین کئے جا چکے ہوں ان پر مہر لگ جائے اور آنے والی نسلیں گزشتہ محققین کی تحقیق و تفتیش کو نقشِ آخر سمجھ لیں۔ فطرت کی ہر شے ہر زمانہ کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے رہی ہے۔ آج تک کسی شے نے یہ نہیں کہا کہ بس میں اب تھک چکی۔ اب میں زمانہ کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ لیکن تعجب ہے کہ کتابِ الٰہی کو صحیفۂ فطرت ماننے والے اس کے متعلق یہ یقین کئے بیٹھے ہیں کہ اس کے متعلق جو کچھ معلومات ازمنۂ گذشتہ میں بہم پہنچائی گئی ہیں وہ آخری باب ہیں اور اس کے بعد یہ کتابِ مقدس خود بخود ایک بیکار شے بن گئی ہے اور اس کی جگہ ان معلومات نے لے لی ہے جو انسانوں نے اس کے متعلق بہم پہنچائی ہیں۔ قرآن کریم کا تو یہ دعویٰ تھا کہ:-

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ۔ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ ۔ ۳۸ — ۸۷ — ۸۸

یہ قرآن تمام اہلِ عالم کے لئے یادداشت ہے اور کچھ وقت کے بعد تم اس کے متعلق خود بخود جان لو گے۔

لیکن اس کے حاملین کا یہ ایمان ہے کہ "حین" سے مراد محض ازمنۂ گزشتہ و اقوامِ سابقہ ہیں۔ ب

چونکہ باب تحقیق بند ہو چکا ہے اس لئے اگر عہد حاضر کی قومیں اپنے حوائج و ظروف کے مطابق اس سے درس عبرت و
موعظت لینا چاہیں اور اپنی ارتقائی منازل میں اسے شمع ہدایت بنانا چاہیں تو جب تک وہ اپنے آپ کو ہزار پانچسو سال
پیچھے نہ لے جائیں اس سے مستفیض نہیں ہو سکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے جو یہ فرمایا کہ کچھ وقت کے بعد تم اس حقیقت
کو جان لو گے کہ قرآن واقعی تمام اقوام عالم کے لئے درس موعظت ہے تو جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا حقیقت بے نقاب
ہوتی جائے گی۔ انسان جس قدر ترقی کرتا جائے گا اس کی عمرانیت و مدنیت جتنی وسیع ہوتی چلی جائے گی قرآن کریم
کی یہ پیشین گوئی پوری ہوتی جائے گی لیکن اسے کسی خاص زمانہ سے مقید کر دینا اس کی امکانی وسعتوں کو پابہ زنجیر کر دینا
ہے۔ قرآن کا ساری دنیا کو چیلنج ہے کہ "اپنی عقلوں کی حد پرواز کو آزماؤ اور دیکھو کہ قرآن کریم تم سے کتنا آگے آگے
چلتا ہے" لیکن ہم یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ قرآنی کمالات کی جس قدر تکمیل ہونی تھی ہو چکی اب اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ
نہیں کہا جاسکتا۔

نفس کی حیلہ جوئی

ماضی پرستی کا یہ جذبہ بظاہر بڑا مقدس اور بہ عقیدت بڑی مومنانہ نظر آتی ہے کہ اسلاف
کی عزت و تکریم اور اپنے عجز و انکسار کی آئینہ دار ہے لیکن اگر ذرا بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو
اس کے اندر نفس انسانی کی ایک بڑی حیلہ جوئی بھی نظر آئے گی۔ ظاہر ہے کہ تدبر و تفکر، تفحص و تجسس کچھ آسان کام
نہیں اس کے لئے بڑی ذہنی کاوش، دماغ سوزی اور جگر کاوی کی ضرورت ہے اسلاف میں جن حضرات نے تحقیق و
تدقیق کے میدان میں قدم رکھا ان کی روئداد حیات پر نگاہ ڈالئے یکسر مجاہدانہ و سپاہیانہ زندگی نظر آئے گی برعکس
اس کے بے سوچے سمجھے کسی بات پر چلے جانا بڑی تن آسانی کا کام ہے۔ قرآن کریم نے جن لوگوں کے متعلق کہا ہے
کہ وہ آباء و اجداد کی کورانہ تقلید پر مصر تھے ان کے متعلق ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ مترفین تھے یعنی وہ لوگ آسائش و
آرام، سہل انگاری اور تن آسانی کی زندگی بسر کرنے کے خوگر ہو چکے تھے۔ مختصر یہ کہ جس چیز کو ہمارا نفس عدم طلب
بہ عقیدت و عظمت کے خوش آیند لباس میں پیش کرتا ہے وہ اکثر و بیشتر ہماری دوں ہمتی اور کوتاہی کی پردہ پوشی
ہوتی ہے ورنہ ایک مسلم کی زندگی، ذہنی، بدنی اور قلبی ہر حیثیت سے سراپا سعی و عمل کی زندگی ہے۔ مگر وہ کی

زندگی ہے۔ اضطراب و سیمابیت کی زندگی ہے۔ یکسر جہاد کی زندگی ہے۔ تعقل و بصیرت اور غور و فکر کی زندگی ہے جمود و تعطل کی زندگی نہیں اور ان دونوں زندگیوں کو قرآن کریم نے برابر قرار نہیں دیا:۔

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ	کیا وہ شخص جو یہ جانتا ہے کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف
رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ	سے نازل ہوا ہے حق ہے اس شخص کے مانند ہو سکتا
أُولُو الْأَلْبَابِ۔ (۱۹ : ۱۳)	ہے جو اندھا ہے نصیحت تو سمجھدار لوگ ہی قبول کر سکتے ہیں

تدبر و تفکر

دیکھئے یہاں یہ نہیں کہا کہ أَفَمَنْ يُؤْمِنُ یعنی وہ شخص جو اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ جو کچھ نبی اکرمؐ کی طرف سے نازل ہوا ہے حق ہے بلکہ أَفَمَنْ يَعْلَمُ کہا گیا ہے یعنی وہ شخص جو علی وجہ البصیرت اس بات کا علم رکھتا ہے اسی لئے آخر میں کہا گیا کہ نصیحت صرف سمجھدار لوگ قبول کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایک قدم پر تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے اس کا فیصلہ یہ ہے کہ:۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ	اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو گونگے
الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ۔	اور بہرے بنے بیٹھے رہتے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے۔

یوں ہی جو لوگ محض عادۃً یا اس روش کی بنا پر جو اسلاف سے متوارث چلی آ رہی ہے نیک کام کرتے ہیں اور اس سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھتے کہ ان کاموں کو ان کے آباء و اجداد نیک سمجھتے اور قرار دیتے چلے آئے ہیں ان سے ان کی ذات کی نشو و نما اور ذہنی اور قلبی ارتقاء نہیں ہو سکتی بلکہ یہ خیال کہ اب نبوت کی طرح باب تدبر بھی بند ہو چکا ہے کبھی قرآن کریم کا منشا نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے تدبر و تفکر کو کسی خاص قوم یا خاص زمانے کے ساتھ مقید نہیں رکھا۔ اس لئے اگر یہ سمجھا جائے کہ جس قدر تدبر و تفکر قرآن میں ممکن تھا ہو چکا تو وہ تمام احکام جو قرآن نے تدبر و تفکر کے متعلق دیئے ہیں بیکار ہو جائیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ جس قوم سے تدبر و تفکر کی قوت سلب ہو جائے اس کا کیا حشر ہوا کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے یہ احکام آج بھی اسی طرح قائم و باقی ہیں جس طرح اس سے پہلے تھے مگر ہمارے دماغوں پر روایات کے تودے جمے ہوئے ہیں وہ نہیں غور کرتے کہ قرآن کا [illegible]

کیا فیصلہ ہے۔ اس نے کہا ہے کہ:۔

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں میں قفل لگے ہوئے ہیں تو جو لوگ پیٹھ پھیر کر ہٹ گئے بعد اس کے کہ سیدھا راستہ ان کو معلوم ہو گیا شیطان نے ان کو بہکا دیا اور انہیں مہلت دی گئی ہے ۔۔۔۔۔"

دوسری جگہ ہے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (۲۱ / ۴۵)

یہ لوگ جو برے کاموں میں لگے ہوئے ہیں کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو ان جیسا رکھیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح کئے ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے گا یہ بہت برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔

اس آیت پر ذرا گہری نظر ڈالئے قرآن کریم کا فیصلہ ہے کہ کافر و مومن کی زندگی برابر نہیں ہو سکتی —

مسلمانوں کی حالت

لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ مومنین کی زندگی کفار سے بدرجہا پست و ذلیل ہو چکی ہے مسلمانوں کی کسی مجلس میں جائیے۔ کسی انجمن کی روداد پڑھئے۔ کسی کانفرنس میں شریک ہوئیے ہر جگہ ہر وقت یہی مرثیہ خوانی ہو گی کہ مسلمان ذلیل و خوار ہو رہے ہیں ان کی رسوائیوں کی حد ہو چکی ہے حالانکہ ذلت و مسکنت وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا انتہائی غضب قرار دیا ہے کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ یہود پر جب ان کے خدا نے اپنا غضب نازل کیا ہے تو ان الفاظ میں کہ:۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ

اور ان پر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے۔

مسلمانوں کی اس تباہی و بربادی کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے تحقیقاتی کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں مفکرین قوم سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور اپنے حل مختلف طرح طرح کی تجاویز پیش کرتے ہیں کئی ہنگامی تحریکیں ابھرتی

ہیں اور بیٹھ جاتی ہیں لیکن باینہمہ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی ان کی پستی و ذلت کے اسباب تلاش کرنے کے لئے ہمیں اس قوت کے سرچشمہ کا سراغ لگانا چاہیئے جو ان کے عہد خوش بختی میں کارفرما تھی ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ قوت، یہ روح، قرآنی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کی بدولت تھی اس لئے کہ قرآن کریم دنیا میں زندگی کی قوتیں سلب کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ زندگی اور قوت کا پیغام بن کر آیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ	اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کی دعوت پر
اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۲۴ : ۸	لبیک کہو جب وہ تمہیں اس چیز کیلئے بلائیں جو زندگی بخشنے والی ہے

یہ پیغام حیات اس راہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو دنیا میں اَقْوَمْ ہے وہ ہر اس قوم کو جو اس راہ پر گامزن ہوتی ہے شادکامی و کامرانی کی بشارت دیتا ہے۔

"یقیناً یہ قرآن اس روش کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے سیدھی راہ ہے (اقوم) اور مومنوں کو بشارت دیتا ہے کہ اگر انھوں نے عمل صالح کئے تو ان کے لئے اجر کبیر ہو گا۔" (۹ : ۱۰)

ظاہر ہے کہ جب یہ قوم تمام دنیا کی نعمتوں کی مالک بنی تھی تو اس راہ نجات پر جادہ پیما ہونے سے بنی تھی اور اگر یہ آج نکبت و افلاس کے ذلیل ترین گڑھوں میں پڑی ہوئی ہے تو اس کی ایک اور صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے یعنی یہ کہ اس نے قرآن کریم کو دامن کو چھوڑ رکھا ہے حالت آج یہ ہے کہ قدم چلتے ہیں اور مسافت طے نہیں ہوتی ہاتھ اٹھتے ہیں لیکن بلاؤں کا بڑھتا ہوا سیلاب نہیں رکتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ	یہ اس لئے کہ انھوں نے قرآن کریم سے منہ موڑ لیا
فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ۔	سو اللہ نے ان کے اعمال غارت کر دیئے

اس باب میں وہ لوگ جو دانستہ قرآن کریم سے اعراض برتتے ہیں اور وہ جو غلط تعلیمات کو حسن عقیدت کی بنا پر قرآنی تعلیمات سمجھتے ہیں اور باوجود متنبہ کئے جانے کے پھر بھی اپنے آپ کو راہ راست پر سمجھتے ہیں دونوں برابر ہیں اس لئے کہ اگر سنکھیا کو زہر قاتل سمجھ کر کھا لو اور تریاق سمجھ کر نگل جاؤ تو ہلاکت دونوں صورتوں میں لازمی ہے

یہی وہ ہلاکت ہے جس کی طرف قومیں بتدریج غیر محسوس طور پر کھنچی چلی جاتی ہیں۔

"اور جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں انہیں ہم بتدریج (تباہی کی طرف) لئے جا رہے ہیں اس طرح کہ ان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی" (۷ : ۱۸)

قرآن کا کس قدر واضح حکم ہے۔ جس کی مسلمان اس دیدہ دلیری سے مخالفت کرتے ہیں۔

اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّھُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا۔	تو کیا اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں حالانکہ وہ ایسا ہے کہ اس نے ایک مفصل کتاب تمہارے پاس بھیج دی ہے۔
(۶ : ۱۱۵)	

یہی وہ وقت تھا جس کے لئے قرآن نے کہہ دیا تھا۔

"کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی اور جو آپ سے قبل نازل کی گئی ہیں (اور) اپنے مقدمات شیطان کی طرف لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کو یہ حکم ہوا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں اور شیطان ان کو بہکا کر گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے" (۴ : ۶۰)

یہی وہ واقعات ہیں جن کی رو سے قرآن کریم کے فیصلے کے مطابق ایک مومن مومن کہلاتے ہوئے بھی مشرک ہو سکتا ہے۔

وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ۔ ۲ : ۱۰۶	اور اکثر لوگ خدا کو بھی مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر اور کیا شرک ہوگا کہ آپ اپنے متنازعہ فیہ امور میں احکامِ خداوندی کے مقابلہ میں روایاتِ قدیمہ کو ترجیح دیں کہ رواج اور روایات اسلاف کے نقوشِ قدم پر بلا تحقیق و بلا تصدیق چلے جانے کا نام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اتباع صرف قرآن کی جائز ہے اور بس۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا	اس کا اتباع کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل

تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا	کیا گیا ہے اور اس کو چھوڑ کر دوسرے رفقاء کا
مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○	اتباع مت کرو تم لوگ بہت ہی کم نصیحت قبول
(۷:۳)	کرتے ہو۔

ایک مسلمان کے لئے یہ اتباع و اطاعت بجبر و اکراہ نہیں بلکہ بطیب خاطر ہونی چاہئے قرآنِ کریم کا تو ارشاد ہے کہ یہ نہیں کہ قوانینِ الٰہی کے فیصلوں کو (کافر تو ان شدنا چار مسلمان شو) کی حیثیت سے مانو بلکہ اس فیصلے کے بعد اگر تمہارے دل میں ذرا سی تنگی بھی محسوس ہوئی تو ایمان جاتا رہا۔

"پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہیں ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ باہمی اختلافات میں یہ لوگ آپ سے فیصلہ کرایا کریں اور پھر آپ کے اس فیصلے کے خلاف دل میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پورے طور پر تسلیم کرلیں" (۴:۶۵)

یہ ظاہر ہے کہ جو بات قرآن کے خلاف ہوگی وہ بہرحال کھلی ہوئی گمراہی ہوگی خواہ آپ اسے آباء و اجداد میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کردیں اسی قسم کے فیصلوں کو قرآنِ کریم نے "زمانہ جاہلیت کے فیصلے" قرار دیا ہے۔ (۵:۵۰)

قرآن اختلاف مٹانے کیلئے آیا ہے

قرآنِ کریم نے اپنے نازل ہونے کی غرض یہ بتائی ہے کہ اقوامِ عالم میں جس قدر اختلافات موجود ہوں ان کو مٹا دیا جائے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ	اور ہم نے آپ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ
لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً	جن باتوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کو واضح کردیں
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (۱۶:۶۴)	اور یہ ہدایت و رحمت ہے مومنین کے لئے۔

تاکہ نوعِ انسانی باہمی نزاعات و مجادلات کی وجہ سے جس سبعیت و بربریت میں الجھ رہی ہے باہمی تشتت و افتراق کے باعث جس وحشت و درندگی کا ثبوت دے رہی ہے اس سے نجات حاصل کرکے ایک صراطِ مستقیم (ایک،

راہِ سعادت پر گامزن ہو جائے جو وحدتِ انسانی کا راستہ ہے اور جس میں کوئی کجی نہیں، کسی قسم کی کوئی الجھن نہیں۔

"سب تعریف اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی" (۱-۱۸)

لیکن واحسرتا کہ جو قوم اپنے آپ کو حاملِ قرآن کہہ رہی ہے تمام دنیا کو ایک مرکز پر لانا تو ایک طرف، خود ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ ہزاروں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے یہ حالت صرف عوام کی نہیں بلکہ جنہیں عوام کے رہنما ہونے کا دعویٰ ہے وہ خود اسی تشیع و تحزب کی آگ بھڑکانے میں ہمہ تن مصروف ہیں اور اسی چیز کو خدمتِ دین بتلاتے ہیں ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسروں کو ناری بتاتا ہے حالانکہ ہر ایک گروہ اپنے سامنے قرآن کو لے کر بیٹھا ہوا ہے یہود و نصاریٰ پر قرآن کریم نے الزام عائد کیا تھا، کہ

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ	یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا طریقہ غلط ہے اور نصاریٰ
شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ	کہتے ہیں کہ یہود کا طریقہ غلط ہے اور دو فرقے تماشہ کہ
عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ۔	دونوں کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہیں۔

کیا بعینہٖ یہی حالت آج مسلمانوں کی نہیں ہو گئی۔ ذرا غور سے دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس علت کے اندر قدرِ مشترک کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے قرآن کا اعتراض تھا کہ انھوں نے ..... اپنے رہبان و احبار کو خدا بنا رکھا تھا یعنی حلت و حرمت، جائز و ناجائز میں بجائے کتابِ الٰہی کے انسانوں کی طرف رجوع کرتے تھے اب دیکھئے مسلمانوں کی کیا حالت ہے جب تک مسلمانوں کا کتابِ خداوندی سے تمسک رہا دین کے معاملہ میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہوا لیکن اس کے بعد انھوں نے اختلافی امور میں کتاب اللہ کی جگہ انسانوں کو مرکز بنایا تو وہی حالت ہو گئی جو یہود و نصاریٰ کی تھی اور ملت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ کسی مسئلہ کو سامنے لیجئے ہمارے زعمائے علمِ دین سے کبھی متحدہ آواز نہ اٹھے گی ایک کچھ کہے گا اور دوسرا کچھ اور سند میں ہر ایک کسی نہ کسی بزرگ کا نام پیش کر دے گا۔ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں تحریفِ لفظی بھی کی تھی اور اس کے ساتھ تحریفِ معنوی بھی کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن کے الفاظ کے تحفظ کی ذمہ داری تو خود لے لی لہٰذا اس میں تو کسی انسان

کا کچھ اختیار ہی نہ رہا کہ کوئی کمی بیشی کر سکے۔ لیکن تحریفِ معنوی کا دروازہ تو ہر ایک کے لئے کھلا تھا۔ چنانچہ دانستہ یا نادانستہ یہ تحریف اس انداز سے ہوئی کہ جو لباس کسی کے جی میں آیا قرآن کو پہنا دیا اور وہی لباس نفسِ قرآن سمجھ لیا گیا۔ اب اگر قرآن کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک کہرام مچ جاتا ہے۔ شور اٹھتا ہے اس لئے کہ اس سے انسانوں سے تعلق چھوڑ کر خدا سے تعلق وابستہ کرنا پڑتا ہے اور انسانوں کی محبت کحب اللہ اشد حباً دلوں کی انتہائی گہرائیوں میں سمائی ہوئی ہے کعبۂ دل سے اس بتکدے کو نکالنا بڑے کرتے جینے کا کام ہے۔ دل کے اس مرض کا علاج قرآن کے سوا اور کہیں نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ	اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے
مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ	ایک موعظت کی کتاب آئی جس میں تمہارے
وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۔	سینے (کے روگ) کی شفا ہے اور وہ مومنین کے
(۱۰:۵۷)	لئے ہدایت و رحمت ہے۔

یعنی جس طرح پیرنا اسے ہی آئے گا جو پہلے پانی میں اترے قرآن کریم کا یہ نسخۂ مقدسہ شفا اسے ہی دے گا جو دل کو تمام غیر قرآنی خیالات سے صاف کر کے قرآن کی طرف متوجہ ہو جائے اس کے برعکس ایسے قلوب کا خدا حافظ جن کے متعلق قرآن نے خود کہہ دیا ہے۔

"اور وہ کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں ہمارے دل اس کی طرف سے پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگ رہے ہیں۔ اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب ہے سو آپ اپنا کام کئے جائیں۔ ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔ (۴۱:۵)

ان معروضات سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ماضی سے بے نیاز ہونا چاہتے ہیں۔ حال کے استحکام اور مستقبل کی درخشندگی کے لئے ماضی سے وابستگی ضروری ہے ماضی گزرے ہوئے حال ہی کا تو نام ہے لیکن

ماضی پرستی

ماضی سے وابستہ ہونا اور ماضی کی پرستش کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے علمائے سلف نے اسلام کی جو خدمات کی ہیں وہ ہمارے لئے باعثِ افتخار و مایۂ ناز ہیں اگر ہم آباؤ اجداد کے دنیاوی ترکہ کے وارث بننے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے بلکہ اسے باعثِ عزت سمجھتے ہیں تو ان کے علمی ترکہ کو ہم باعثِ ننگ و عار کیوں سمجھیں۔ اس ترکہ سے ہمارا وقار قائم ہے لیکن ہر چیز کو اس کی اپنی جگہ پر رکھنا بھی ضروری ہے جیسے کسی کی تحقیر نا روا ہے ویسے ہی اس کی شان میں غلو و افراط سے کام لینا بھی مستحسن نہیں۔ حضراتِ متقدمین علم و بصیرت رکھتے تھے لیکن تھے تو انسان ہی خدا تو نہیں تھے انہیں خدا کا مرتبہ دینا نہ ان کے حق میں اچھا ہے نہ اپنے حق میں۔ جس درجۂ امامت و اجتہاد میں وہ پہنچے تھے اس تک آج بھی پہنچا جا سکتا ہے اور جو مسائل انہوں نے اپنے ماحول کو مدِ نظر رکھ کر قرآن کی روشنی میں مستنبط کئے تھے آج کے ماحول کے مطابق ویسے ہی دساتیرِ قوانین آج بھی مرتب کئے جا سکتے ہیں جن کا سرچشمہ وہی اصولِ دین ہوں گے۔ لہٰذا سب سے پہلے علما حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اس بات کو محسوس کریں کہ زمانہ کہاں سے کہاں چلا گیا اور وہ امتِ مسلمہ کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں رسولِ اکرمؐ نے تو فرمایا تھا کہ ایک مومن کی زندگی کی شان ہی یہ ہونی چاہیئے کہ اس کا آج گزشتہ کل سے ترقی یافتہ ہو لیکن یہاں ہمیشہ یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے زیادہ بدبخت تر ہے۔ ایسی قوم کا خدا حافظ۔

اس کے دل سے پوچھئے اس کے جگر سے پوچھئے
آج جس کی منزلِ مقصود کل سے دور ہے!

اس میں شبہ نہیں کہ آج الحاد و دہریت پرستی کا سیلاب امنڈے چلا آ رہا ہے لیکن اس میں سب سے بڑا سبب خود ہمارے علما حضرات کا بے وجہ تشدد اور بے معنی تنگ نظری ہے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اسلام کے احکام دو قسم پر مبنی ہیں ایک وہ جن میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ لیکن دوسری قسم ان احکام کی ہے جو امت کے عام حالات سے تعلق رکھتے ہیں چونکہ زمانہ کے بدلنے کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں

اس لئے ان کے متعلق احکام بھی اٹل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ قرآن نے یہی کیا کہ ان کے لئے اصول تو وضع کر دیئے لیکن ان کی روشنی میں جزئیات ترتیب دینے کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا رکھا۔ اس دروازہ کو بند کر دینا دین میں خلاف منشاء خداوندی سختی پیدا کر دینا ہے ارباب عقل و فکر کا فرض ہے کہ وہ قوم کی اقتصادی، معاشرتی، اخلاقی، سیاسی، معاشی ضروریات پر غور کریں اور انکی اس دین کا راستہ بتائیں جو ان کے لئے اُن ضروریات کا حل پیش کر سکے۔

آج مسلمانوں کی ترقی و بہبود کے لئے طرح طرح کی تحریکیں پیدا ہو رہی ہیں، انجمنیں، کانفرنسیں، جلسے، ریزولیشن، کمیٹیاں، تحریریں، تقریریں، غرضیکہ ہر ایک دوا اور ہر ایک دعا بروئے کار لائی جا رہی ہے لیکن نہ دوا میں شفا نہ دعا میں اثر، قوم کی حالت روز بروز افسوسناک ہوتی چلی جا رہی ہے اس کی آخر وجہ کیا ہے؟

اکاس بیل

اسلام تو ایک شجر مقدس ہے جس کی جڑیں زمین میں اور شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں پھر یہ شجر طیب ہمیں بھی وہ پھل کیوں نہیں دیتا جو اس کی فطرت کا خاصہ ہے اس کا جواب واضح ہے اس کی علت بالکل عیاں ہے آپ نے عام طور پر دیکھا ہوگا کہ بیری کے درخت پر بالخصوص اور دیگر درختوں پر بالعموم ایک خاص قسم کی بیل پیدا ہو جاتی ہے جسے اکاس بیل کہتے ہیں وہ آہستہ آہستہ تمام درخت پر چھا جاتی ہے آپ اس درخت کو کتنا سینچئے۔ اس کی کتنی پرورش کیجئے وہ کبھی برومند نہیں ہو سکتا۔ اس درخت کو آپ جتنی غذا پہنچانے کی کوشش کریں گے اکاس بیل اتنی ہی بڑھتی چلی جائے گی اور درخت سوکھ کر زرد پڑتا جائے گا جب تک اس بیل کو اتار کر پھینک نہیں دیا جاتا درخت سرسبز نہیں ہوگا۔ قرآن کے شجر مقدسہ پر ایک مدت سے منافی تعلیمات کی اکاس بیل چڑھی ہوئی ہے۔ ہم آپ اپنی دانست میں شجر اسلام کی تقویت کی جس قدر کوشش کر رہے ہیں وہ دراصل اس بیل۔ اثر جنس کی تقویت کا موجب ہوتی جاتی ہے۔ اسلام کی برومندی و بار آوری کے لئے سب سے پہلے اس بیل کو اتار کر پھینک دینا ضروری ہے۔ اس کے بعد اصل درخت کی پرورش خود بخود ہو جائے گی۔

ان گزارشات کے بعد کیا باادب دریافت کرنے کی اجازت حاصل کی جا سکتی ہے کہ۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۔ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

(۵۷ : ۱۶)

کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت اور اس چیز کے لئے جو حق کے ساتھ نازل کی گئی ہے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے قبل کتاب ملی تھی پھر ان پر ایک زمانہ گزر گیا پھر ان کے دل سخت ہو گئے اور بہت سے ان میں فاسق ہیں۔

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

(نوشتہ اگست سنہ ۱۹۴۱ء)

کچھ عرصہ سے دنیائے مذاہب میں ایک خاص رسم سی پیدا ہو گئی ہے مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً اجتماعات منعقد کئے جاتے ہیں جن میں مختلف ادیانِ عالم کے نمائندے اپنے اپنے مذہب کے محاسن بیان کرتے ہیں ان تقاریب سے مقصد بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اہل مذاہب ایک دوسرے کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں اور ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے جو لاعلمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اگرچہ اس مقصد کی عمدگی اور ان اجتماعات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن میں نے جب کبھی ان اجتماعات کی روئداد کو پڑھا ہے مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان میں (کم از کم) اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں بہت کم پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام امن و سلامتی کا پیغامبر اور نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت ہے اس لئے اس میں غیر مذاہب سے رواداری، حسنِ سلوک اور وسعتِ نظر کی تعلیم عام ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کے مقابلہ میں ایک خاص فضیلت کا مدعی ہے اس کا دعویٰ ہے کہ خدا کا پیغام اپنی اصلی شکل میں آج صرف قرآن کریم کے اندر ہے جو خدا کا آخری پیام اور ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو قیامت تک کے لئے انسانی زندگی کی ہر شاخ میں قانونِ فطرت کے مطابق ہدایت کے سامان اپنے اندر رکھتا ہے ان اجتماعات میں اسلام کی وسعتِ نظر، کشادگیٔ ظرف، رواداری، حسنِ سلوک کا چرچا تو عام کیا جاتا ہے

لہ اسلام کے لئے، مذہب کا لفظ دوسروں سے تقابل کی خاطر لکھ دیا گیا ہے ورنہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔

لیکن اس کی اس خصوصیت یعنی اس کی فضیلت و اکملیت، برتری اور فوقیت کے متعلق ایک حرف زبان تک نہیں آتا کیونکہ اسلام خود پر یہ بھی واجب کرتا ہے کہ اس طرح دیگر مذاہب کی دلشکنی ہوگی اور وہ اسلام کے نمائندوں کو متعصب و تنگ نظر خیال کریں گے۔ علاوہ دوسری طرف لوگوں کے اس غلط مفہوم سے متاثر ہو کر اسلام کے نمائندوں کو اسلام کی بے تبدیلی کا حوصلہ نہیں پڑتا اور وہ ان اجتماعات میں کچھ سہمے سمٹے، ہچکچاتے لجاتے سے آتے ہیں۔

چو زاہدے کہ بہ بزم شراب می آید!

اس تفصیل سے یہ ظاہر ہے جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس قسم کی کانفرنسیں کسی بہتر نتیجہ کی طرف منتج نہیں ہوتیں بلکہ میں تو ایک عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ یہ چیز بجائے فائدے کے نقصان کا باعث ہو رہی ہے ان اجتماعات کے نیک نیت منتظمین کا مقصد خواہ کچھ ہو لیکن اس کا نتیجہ یقیناً یہی مرتب ہو رہا ہے کہ رفتہ رفتہ اسلام کی اس مابہ الامتیاز خصوصیت کو پس پشت ڈال کر اسے دوسرے مذاہب کی سطح پر کھڑا کیا جا رہا ہے چنانچہ واقعات آہستہ آہستہ بتا رہے ہیں کہ یہ خدشہ موہوم و خیالی قیاس نہیں۔

وسط جون سنہ ۱۹۲۱ء میں شولاپور کے مقام پر اسی قسم کی تمام مذاہب کی کانفرنس منعقد ہوئی جس کے صدر ہندو قوم کے مشہور کارکن پنڈت سندر لال جی تھے۔ اس کانفرنس میں اسلام کے نمائندے نے جو کچھ کہا اس کی تفصیل تو معلوم نہیں ہو سکی لیکن جناب صدر نے اپنے خطبہ میں پورا زور اس بات کے ثابت کرنے میں لگا دیا کہ اسلام خود تسلیم کرتا ہے کہ نجات و سعادت کی راہیں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں اصل مذہب خدا پرستی و نیک عملی کی زندگی ہے اور یہ اصل ہر مذہب میں موجود ہے فرق صرف شرع و منہاج (ذرائع) میں ہے اور یہ فرق کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ پنڈت جی نے اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں اپنی طرف سے

جنابِ آزاد کی تفسیر

کچھ نہیں کہا بلکہ شروع سے آخر تک جناب ابوالکلام صاحب آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ (ترجمان القرآن جلد اول) سے شرح و بسط سے اقتباسات پیش کر دیئے جن سے

حرفاً حرفاً ان کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے (آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ ہندوؤں کی طرف سے اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوا اور پنڈت جی نے اپنے خطبہ میں اس کا حوالہ پیش کیا ہے مجھے نہ تو ان امیال و عواطف سے کچھ بحث ہے جو اس تفسیر کے محرک ہوئے اور نہ ان مقاصد سے واسطہ جو اس کے ہندی ترجمہ اور اس کی عام اشاعت سے پیش نظر ہیں مجھے تو قرآن کریم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ دیکھنا ہے کہ یہ خیالات قرآن کریم کی رو سے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر اس سے پیشتر بھی تحمناً بہت کچھ لکھا ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر تفصیلی طور پر لکھا جائے تاکہ ان خیالات کو عام کرنے والے یہ کہکر فریب خوردگی اور فریب دہی کے مرتکب نہ ہو سکیں کہ اسلام خود اس تعلیم کا مؤید ہے اس تفصیلی بحث کی ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب یہ محسوس کیا جائے کہ ہمارے نوجوان طبقہ پر اس تعلیم کا کیا اثر پڑ رہا ہے "تمام مذاہب یکساں ہیں" "عالمگیر سچائیاں سب میں ایک جیسی ہیں خدا پرستی اور نیک عملی ہی ذریعہ نجات وسعادت کی ضامن ہے ہدایت خدا کی رحمت ہے جو کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہو سکتی" وغیرہ وغیرہ خیالات ایسے نظر فریب اور خوش آیند ہیں کہ سطح بین نگاہیں فوراً اس سحر سے مسحور ہو جاتی ہیں اور جب اس سعی کشش و جاذبیت کو جناب آزاد جیسے مفسر قرآن کی تائید بھی حاصل ہو جائے تو اس سحر کے سحر حلال بن جانے میں کون سی شے مانع ہو سکتی ہے۔

اکبر کا دین الٰہی

رواداری کے اس نظر فریب مفہوم اور وسعت نگاہ کی اس سراب آشنا تفسیر کی پہلی جھلک ہمیں شہنشاہ اکبر کے دین الٰہی میں ملتی ہے جس طرح وہ جذبات و مقاصد جو اس تحریک کے محرک تھے تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں اسی طرح وہ مساعی جمیلہ بھی ان کی نگاہوں سے مستور نہیں جو اس اسلام سوز نظریہ کے ابطال و استیصال کے لئے مجاہدانہ انداز سے معرض وجود میں آئیں۔

برہمو سماج فرقہ کی تحریک بھی قریب قریب انہی بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے لیکن چونکہ یہ تحریک مسلمانوں کی طرف سے وجود میں نہیں آئی اس لئے وہ ہمارے دائرۂ تنقید سے باہر ہے۔

اس کے بعد یہی نظریہ موجودہ سیاسی کشمکش کے طوفان میں سطح کے اوپر لایا گیا اس نظریہ کی اشاعت کی

موجب جناب آزاد کی تفسیر ہوئی اور اس طرح سے یہ چیز مسلمانوں میں دین کی حیثیت سے پھیل گئی جناب آزاد
مسلمانوں میں ایک عالم دین و مفسر کی حیثیت سے امتیاز حاصل کر چکے تھے اور ان کی زبان و قلم کا مسلمانوں کے
دلوں پر گہرا اثر تھا اس لئے اس تفسیر کا ایک عرصہ سے انتظار ہو رہا تھا چنانچہ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ
اس کا استقبال ہوا لوگوں نے اسے آنکھوں سے لگایا سر پر اٹھایا اور مختلف گوشوں اور متنوع حلقوں سے اس کی
تعریف و توصیف میں غلغلہ انداز نعرے بلند ہوئے اس میں شبہ نہیں کہ جناب آزاد کے ترجمہ میں ایک خصوصیت ہے
جس کی تعریف نہ کرنا بخل ہوگا لیکن بحث تو ان کے اس نظریہ سے ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے چنانچہ ہوا یہ کہ کتاب
کی اشاعت کے زمانہ میں وفور شوق اور جوش عقیدت کے اس والہانہ ہجوم میں کسی کی نگاہ اس طرف نہ اٹھی بربنگِ
خود بینی نہیں بلکہ اظہار واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس ازدحام مدح و ستائش میں یہ توفیق اللہ تعالیٰ نے
راقم الحروف کو عطا فرمائی کہ جناب آزاد اور اہل نظر حضرات کی توجہ اس بنیادی غلطی کی طرف مبذول کرائی جائے
جو اس تفسیر کے ذریعہ سے عام ہونے والی تھی چنانچہ مجلہ معارف (بابت جنوری ۱۹۳۲ء) میں میرا وہ مضمون شائع
ہوا جس میں تفسیر کے اس حصہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی تھی اس مضمون کو ارباب نظر کے حلقہ میں مقبولیت حاصل ہوئی
اور اس کے بعد مختلف گوشوں سے اس نظریہ کی مخالفت میں آوازیں بلند ہوئیں اس وقت آٹھ نو برس ہو چکے ہیں چونکہ
وہ تنقیدی مضامین جو اس نظریہ کے خلاف شائع ہو چکے تھے لوگوں کی نگاہوں سے ذرا دور پڑ گئے ہیں اس لئے
ان کی یاد محو ہوتی چلی گئی (متفرق مضمون کا اثر ہوتا بھی وقتی ہے) اور تفسیر چونکہ مستقل کتاب کی شکل میں ہے اس
لئے وہ ہر وقت سامنے رہی۔ اس کے بعد جب کبھی اس نظریہ کا چرچا عام ہونے لگا تو اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا
جاتا رہا۔ تین برس ادھر سے کبھی کبھی مجلہ طلوع اسلام میں بھی اس کا تذکرہ چھڑتا رہا لیکن ہمیں یہ وقتی کوششیں ایک
مستقل تصنیف کے مقابلہ میں زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ تاوقتیکہ انہیں تسلسل جاری نہ رکھا جائے بالخصوص
جب کہ اس نظریہ کی اشاعت میں غیر مذہب کے لوگ بھی کوشاں ہوں میرے نزدیک اسلام کے لئے یہ نظریہ بہت بڑا
خطرہ اپنے اندر رکھتا ہے اس لئے کہ جب آپ ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیں کہ اسلام بھی دیگر مذاہب کے مقابلہ میں کوئی

حاملِ امتیازی خصوصیت نہیں تو اس کے بعد اسلامی نظامِ زندگی سے شیفتگی اور اس کی سرفرازی کے لئے تمام جدوجہد اور کوششیں سب ختم ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ آپ کی تمام سیاسی جدوجہد بھی اسی قدر بے روح ہو جاتی ہے۔ یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ قوموں کی زندگی کا راز ان کے عقیدہ (نصب العین حیات) سے وابستہ ہے۔ جس قدر کسی قوم کا مطمحِ نظر بلند ہو اور اس کے افراد کو جس قدر اس سے عشق ہوگا اتنی ہی وہ قوم زندگی کی دولت سے بہرہ یاب ہوگی۔ نظریہ حیات (عقیدہ) کی ایک ذرا سی غلطی قوم کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔ گاڑی جب کانٹا بدلتی ہے تو دونوں لائنوں میں ایک انچ کا ہی فرق ہوتا ہے لیکن اس کانٹا بدلنے میں اگر ایک انچ کی بھی غلطی ہو جائے تو تھوڑے عرصہ کے بعد وہ گاڑی نہ صرف یہی منزل ہی سے کوسوں دور ہو جائے گی بلکہ اسے ہر قدم پر ہلاکت اور تباہی کا سامنا ہوگا۔ میرے نزدیک جناب ... کا نظریہ ایک ایسی ہی ہلاکت آفریں غلطی ہے جو اگر بدستور قائم رہی تو نہ معلوم کسی وقت کیا رنگ لا کر رہے۔ یہی وہ احساس ہے جو مجھے بار بار اس موضوع پر لکھنے کے لئے آمادہ کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ صاحب! آج کل دوسرے مذاہب کے پیرو اس روش پر آ گئے ہیں کہ وہ اپنے ہی مذہب کو سب سے اعلیٰ و ارفع نہیں بتاتے بلکہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا مذہب بھی باقی مذاہب جیسا ہے۔ اس طرح سے وہ رنگ خود بخود بدل رہا ہے جس میں مباحث و مناظرات کے گرم رہتے تھے اور ہر مذہب والا اپنے مذہب کی اولیت و افضلیت ثابت کرنے میں نبرد آزمائی کرتا تھا۔ دوسرے مذاہب والوں کا

تنگ نظری کا طعنہ

تو یہ مسلک ہے اور ادھر یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کو پھر سی مقام پر پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے! اس میں شبہ نہیں کہ بحث و جدل عمدہ نتائج کی حامل نہیں ہوتی۔ اور میں اس سے ہمیشہ مجتنب کرتا ہوں لیکن معترض حضرات ذرا سوچیں تو سہی کہ وہ کیا فرما رہے ہیں؟ جس چیز کو وہ دیگر اہل مذاہب کی وسعت اور مسلمانوں کی تنگ نظری قرار دے رہے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ مثلاً زید ایک بچہ ہے بڑا غبی نالائق۔ عمر کا ایک بچہ اس کے مقابلہ میں بڑا ذکی و ذہین ہے۔ زید ہر مقام پر شکست کھاتا ہے کہ صاحب! میں تو کبھی ...

کہتا کہ میرے بچے کو کوئی خاص فضیلت حاصل ہے میرے نزدیک تو میرا اور عمر کا بچہ بالکل یکساں ہیں دونوں میں کوئی فرق نہیں یہ تو عمر کی خود ستائی ہے کہ اپنے بچہ کے برابر کسی دوسرے کو سمجھتا ہی نہیں!

ظاہر ہے کہ یہ اصول زید کی وسعتِ نظر اور عمر کی تنگ دلی کا آئینہ دار ہے یا کسی اور حقیقت کا غماز؟

دورِ حاضر میں زمانے کے تقاضوں سے ہوا یہ ہے کہ اسلام کے سوا باقی تمام ادیان کو دقت پیش آرہی ہے کہ نہ ان کے معتقدات علم و عقل کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے ہیں نہ ان کے اصول و ضوابط انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور زندگی کے تقاضوں کے لئے کوئی حل پیش کر سکتے ہیں چنانچہ انہیں آئے دن اپنی عملی ضروریات کے لئے ادھر ادھر سے حل یا قوانین مستعار لینے پڑتے ہیں اس لئے وہ مذاہب انسان کی برق رفتار ترقی کا ساتھ دینے سے قطعی قاصر ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کے مذہب کے ماننے والوں کی حالت یہ ہوتی جا رہی ہے کہ انہیں نہ اپنے عقائد پر یقین رہا ہے اور نہ ہی اپنے مذہب سے وابستگی وہ مذہب سے برگشتہ ہوتے ہیں اور ان کی یہ برگشتگی بعض صورتوں میں سرکشی اور بغاوت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے قوم کی زندگی کا راز عقائد سے وابستگی میں مضمر ہے اس لئے ان مذاہب کے ارباب حل و عقد کو خطرہ ہے کہ کہیں اس طرح رفتہ رفتہ یہ شیرازہ ہی منتشر نہ ہو جائے اس کے مقابلہ میں وہ خود دیکھ رہے ہیں کہ دینِ اسلام کس طرح انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دیتا ہے انہیں خطرہ ہے کہ ان حالات کے پیشِ نظر ان کے مذہب کے پیروؤں کا بیشتر حصہ اسلام کی طرف مائل نہ ہو جائے ان حالات کے ماتحت وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے اپنے مذہب گزیدہ نتیجہ دل سے یہ کہنا کہ ان کا مذہب تمام مذاہبِ عالم سے اعلیٰ و افضل ہے کس قدر بے نتیجہ اور بے معنی ہے اس لئے انہوں نے اس خطرہ سے بچنے کی وہی راہ نکالی ہے جو زید نے اپنے بچے کے متعلق اختیار کی تھی انہوں نے یہ کوشش شروع کر دی ہے کہ اگر ان کا مذہب اتنا اونچا نہیں جا سکتا جتنا اسلام ہے تو یہی کیا جائے کہ اسلام کو اس کی سطح سے نیچے اتار کر اپنے مذہب کی سطح پر لا کھڑا کیا جائے اور اس طرح ان کے اپنے مذہب سے برگشتہ ہونے والوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ مذہب سب ایک جیسے ہیں اس لئے اپنے مذہب سے یہ سمجھ کر بیزار ہو جانا کہ

اس سے بہتر مذہب بھی دنیا میں موجود ہے وہ کہتے ہیں کہ مذہب کا دائرہ پرستش اور عبادت تک محدود ہے اس

اعتبار سے سب یکساں ہیں ہی۔ اور نظامِ زندگی سو وہ مذہب سے الگ شے ہے اسے قوم کی اجتماعیت تشکیل دیتی ہے اس لئے اس اعتبار سے **قومیت** ہی وہ نقطہ ہے جس سے متمسک ہونا ہے۔ یوں یہ حضرات جس زیرکی نے اس طرح اس آنے والے خطرہ سے اپنی قوم کو بچا لیا ہے یعنی اپنے مذہب کی کمزوری کو وحدتِ ادیان کے نقاب میں چھپا لیا۔ اور قومی اجتماعیت کے لئے ایک دوسرا محاذ (قومیت) تلاش کر لیا۔

یہ ہیں وہ مقتضیات و عواطف جن کے ماتحت "یکسانیتِ مذہب" کی یہ تحریک وجود کوش ہوئی ہے۔ آپ مختار ہیں کہ اس کا نام جو جی میں آئے رکھ لیجئے لیکن ذرا اس کی کیفیتِ قلب کا بھی تو احساس کیجئے جو یہ مانتا ہو کہ یہ زمانہ آنا تھا جس میں تمام مذاہب والے اپنے اپنے مذہب کے ناقص ہونے کے اعتراف پر مجبور ہو جائیں۔ یعنی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات انہیں اسلام کے اعتراف پر مجبور کر دیں کہ ان کا مذہب واقعی زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں اسلام کے دینِ حقیقی ہونے کا دعویٰ علیٰ وجہ البصیرت دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا۔ اور یوں اس کی افضلیت و اکملیت کا اقرار لیا جا سکتا ہے یہی وہ حالت ہے جس میں قرآن کے اس دعویٰ کو ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آنا تھا کہ

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ حیات و نظامِ حقیقی دے کر بھیجا تاکہ وہ نظام تمام نظام ہائے عالم پر غالب آ جائے۔ خواہ یہ چیز مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

جو شخص قرآن کی اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان رکھتا ہو کیسے کہ جب وہ دیکھے کہ عین اس زمانہ میں خود اسلام کے نام لیواؤں کی طرف سے یہ نظریہ پیش ہو رہا ہے کہ تمام مذاہب یکساں ہیں تو وہ کس طرح اس عقیدہ کو مبنی بر حقیقت اور اس کی اشاعت کو خدمتِ اسلام قرار دے لے؟

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم یہ دعویٰ کرو گے کہ ہمارا مذہب تمام مذاہب سے ارفع و اعلیٰ ہے اور نجات و سعادت اس سے باہر اور کہیں نہیں، تو اس کا دعویٰ دوسرے اہل مذاہب بھی کرنے لگ جائیں گے اور پھر وہی تقابل و وزن

کا سوال پیدا ہو جائے گا۔ سوال تو اب مقابلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ دن گئے جب نظری مسائل کی بنا پر مباحثات و مناظرات کی بزم آرائیاں ہوا کرتی تھیں اب تو حالت یہ ہے کہ ساری دنیا اپنے اپنے نظریاتِ زندگی سے تنگ آچکی ہے اور اسے اس تلاش ہے کہ کہیں سے ایسا نظریۂ حیات مل جائے جس کے ماتحت انسان امن و سلامتی کی زندگی بسر کر سکے جن اقوام نے قومیت کو امن و سکون کا ضامن بتایا تھا وہ اب محض

دست تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

کے مطابق طوعاً و کرہاً نباہ کر رہے ہیں ان حالات میں تقابل کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے اب تو صرف صحیح اسلام کو اجاگر کرنے کی دیر ہے تشنہ لب دنیا خود بخود اس چشمۂ حیات کے گرد جمع ہو جائے گی لیکن اگر مقابلہ کے سوال کو تسلیم ہی کر لیا جائے تو بھی مقابلہ سے گھبراتا ہے کون؟ عمر کے لئے تو یہ چیلنج نوید مسرت ہے کہ اس کے اور زبیدہ کے بیٹے کو مقابلہ کے امتحان میں بٹھا دیا جائے اگر دنیا پوچھنا چاہتی ہے تو بڑی خوشی سے پوچھ لے ہم بتائیں گے کہ ان کے نظریاتِ زندگی کہاں کہاں اور کیوں ناکام رہے اور ان کے مقابلہ میں اسلام کون سا ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے جو ان تمام اسقام و عیوب سے پاک ہے لیکن اس وقت میرا تخاطب غیر مذاہب والوں سے نہیں اس وقت میں صرف انہیں مخاطب کرنا چاہتا ہوں جو مسلمان کہلانے کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تمام مذاہب یکساں ہیں اس تخصیصِ تخاطب سے مقصد یہ ہے کہ ہم اس نظریہ کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھیں گے۔ غیر مذاہب والوں سے بات کرنے میں طریق استدلال اس سے مختلف ہو جاتا ہے ان کے نزدیک قرآن حجت نہیں ہوتا لہٰذا میرا تخاطب ان سے ہے جو قرآن کو حجت مانتے ہیں لہٰذا اگر قرآن کریم سے یہ ثابت ہو جائے کہ شرفِ انسانی کی تکمیل، حال اور مستقبل کی سرفرازی و سربلندی، ہر قسم کی فلاح و بہبود اور نجات و سعادت صرف اس نہجِ زندگی (دین) سے حاصل ہو سکتی ہے جس کا ترجمان قرآن کریم اور جس کے عملی پیکر محمد رسول اللہؐ ہیں تو دنیا اسے کتنی ہی تنگ نظری پر کیوں نہ محمول کرے آپ کو دوسروں کے پیمانوں کے مطابق، نگاہ کی ہزار وسعتیں اور قلب کی لاکھ کشادگیاں "اس تنگ نظری پر" قربان کر دینی چاہئیں اگر آپ اس کے لئے تیار ہیں تو دامنِ خداوندی کے سایۂ رحمت میں آپ کیلئے جگہ ہے۔

اور اگر آپ اسے (معاذاللہ) فی الواقع تنگ نظری اور کوتاہ ظرفی خیال کرتے ہیں تو اپنی نگاہ کی وسعتوں کے لئے ایسا آسمان تلاش کر لیجئے جہاں جھوٹے کو جھوٹا کہنا تنگ نظری قرار پائے جہاں ناقص کو ناقص کہنا رواداری کے خلاف سمجھا جائے جہاں سچ سے اس لئے اجتناب کیا جائے کہ اس سے جھوٹے کی دل شکنی ہوتی ہے جہاں حق کو اس لئے چھپایا جائے کہ ان کے بے نقاب ہو جانے سے مصنوعی نگوں کے چہرے کا رنگ فق ہو جانے کا ڈر ہے۔ سو ہمیں تو حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا ہی پڑے گا ولو کرہ المشرکون۔ جب یہ حقیقت ثابت ہے کہ آج اس آسمان کے نیچے خدا کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام اپنی اصلی اور مکمل شکل میں قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں تو اس حقیقت کے اعلان سے اس لئے ہچکچاہٹ پیدا ہو کہ اس سے دوسرے تنگ نظری کا طعنہ دیں گے اگر خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو راضی رکھنے کا عمل شرک نہیں تو اور کیا ہے؟

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینٰت والھدٰی من بعد ما بینٰہ للناس فی الکتٰب اولٰئک یلعنھم اللہ و یلعنھم اللّٰعنون ۝ (۲/۱۵۹)

جو لوگ ان باتوں کو چھپاتے ہیں جو ہم نے سچائی کی روشنی اور ہدایت سے نازل کی ہیں باوجودیکہ ہم نے لوگوں کے لئے انھیں کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنتیں بھی ان کے حصے میں آتی ہیں۔

جنابِ آزاد کے معتقدات

جناب آزاد کی طولِ صد تفسیر تقریباً اپنے دو صد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس کے آخر میں انھوں نے ان طولانی مباحث کو چند صفحات میں سمیٹا ہے یہی وہ خلاصہ بحث ہے جس سے پنڈت سندر لال جی نے اپنے دعویٰ کے ثبات میں اقتباسات پیش کئے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے ان مقامات کو درج ذیل کیا جاتا ہے آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

(۱) قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔

یہ محض مذہب کی عملی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ ہے لیکن روح درحقیقت ان سے بالاتر ہے اور وہی
اصل دین ہے یہ اصل دین کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی
میراث نہیں ہے کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے (صفحہ ۱۲۷)

متعدد دیگر مقامات پر بھی انہی خیالات کو دہرایا گیا ہے (بہتر ہو کہ تفسیر مذکور کا آپ خود مطالعہ کریں اور سیاق و سباق کو ملا کر ملاحظہ کر لیں کہ جناب آزاد کا نظریہ کیا ہے) اس کے بعد یہ دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے نجات و سعادت کے لئے صرف خدا پرستی (اللہ کو مان لینے) اور "نیک عملی" کی ضرورت ہے یا ان کے ساتھ رسالتِ محمدیہ پر بھی ایمان کی ضرورت ہے (جس کے ساتھ ہی قرآن کریم پر ایمان بھی لازم آجاتا ہے اور رسالت نبی اکرمؐ اور قرآن پر ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ شریعتِ قرآنی کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ اسی کا نام "نیک عملی" ہے) یعنی ساری بحث کا نقطہ یہ ہے کہ ایمان بالرسالت یعنی قرآنی شریعت کی اتباع بھی ضروری ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں کفار و مشرکین کے علاوہ اہل کتاب کا بھی ذکر آیا ہے یہ وہ لوگ تھے جو اللہ پر ایمان رکھنے کے علاوہ نبی اکرم سے پیشتر کسی نہ کسی رسول اور قرآن سے پہلے کسی نہ کسی کتاب پر ایمان رکھتے تھے لہذا اگر بحث کو اور مختصر کر دیا جائے تو وہ اس نقطہ میں سمٹ کر آجائے گی کہ کیا قرآن کریم کی رو سے اہل کتاب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ رسالتِ محمدیہ اور اتباعِ قرآن پر بھی ایمان لائیں یا اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر پختگی سے عمل پیرا ہو جائیں اگر قرآن کریم اہل کتاب سے بھی رسالتِ محمدیہؐ اور اتباعِ قرآن کا مطالبہ کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس کے سوا نجات و سعادت کی کوئی راہ اور نہیں تو بات صاف ہو جائے گی اس لئے کہ جب اہل کتاب سے بھی ان چیزوں کا مطالبہ ہو تو غیر اہل کتاب سے یہ مطالبہ اور بھی شدید ہو جائے گا۔

دین سے کیا مراد ہے

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآن کریم جس چیز کو دین یا اسلام کے نام سے پیش کرتا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ قرآنی تعلیم کا اس باب میں مفہوم یہ ہے کہ خدا کی طرف سے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف اقوام و ملل میں حضرات انبیائے کرامؑ کی

رسالت سے پیغامات آتے رہے ان پیغامات کی اصل و بنیاد ہمیشہ ایک رہی یعنی خدائے واحد کی عبودیت اس کے سوا کسی اور کو اس قابل نہ سمجھنا کہ اس کے حکم کی اطاعت کی جائے لیکن اس اصل کو بروئے کار لانے کے لئے عملی نظام کی تشکیل میں مقتضیات زمانہ کے اعتبار سے مختلف ہوتا رہا یہ پیغامات آتے کچھ عرصہ تک اپنی شکل میں قائم رہتے اس کے بعد یا تو آفاتِ ارضی و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتے یا خود انسانوں کی دستبرد سے ان میں تحریف و الحاق ہو جاتا کہیں یہ فراموش ہی کر دیئے جاتے لہٰذا کچھ وقت کے بعد ان پیغامات کی پھر سے تجدید ہو جاتی اپنی جیسے پیغامات (آیات اللہ) کا پھر نزول ہو جاتا اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت بھی تھی یعنی انسانیت خود اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی ہے اس کے مقتضیات اور ضروریات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا اس لئے ہر زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق نظامِ خداوندی کی تشکیل کے عناصر میں بھی ارتقائی اضافہ ہوتا رہتا تھا یعنی ہر رسول کے وقت کچھ تو گزشتہ رسول کے فراموش کردہ یا ضائع شدہ پیغامات (سچائیوں) کی تجدید ہو جاتی تھی اور کچھ ان پر اضافہ بھی ہو جاتا تھا اور ترمیم و تنسیخ بھی لیکن یہ ترمیم و تنسیخ ہمیشہ ارتقاء و عروج کی طرف لے جاتی تھی۔ تنزل و ہبوط کی طرف نہیں جاتی تھی ذیل کی آیت مقدسہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے فرمایا:-

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (۲/۱۰۶)

(ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے ہیں یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں۔

یعنی منسوخ شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس سے بہتر اور فراموش شدہ حکم (آیت) کی جگہ اس جیسا حکم آ جاتا تھا چنانچہ قرآن میں کتب سابقہ میں الحاق و تحریف کی تصریحات متعدد مقامات پر مذکور ہیں وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ (ہم نے موسیٰ کو کتاب دی۔ سو اس میں اختلافات ڈالے گئے) يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (وہ کلمات کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اور جو کچھ انہیں یاد دلایا گیا تھا اس میں سے ایک حصہ انہوں نے بھلا ہی دیا) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (افسوس ہے

ان پر جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔)

اس قسم کے متعدد مقامات ہیں تحریف، الحاق، فراموشی، دانستہ تغیر و تبدل کی تصریحات موجود ہیں اور پھر اس حقیقت پر خود ایک دنیا شاہد ہے آج دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس دعویٰ کو بدلائل ثابت کر سکے کہ جس کتاب کو وہ صحیفۂ آسمانی سمجھتے ہیں وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو ان کے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی اس کے برعکس اس امر کے بے شمار تاریخی شہادات موجود ہیں کہ ان کتابوں کے اصل نسخوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا بہرحال یہ سلسلۂ رشد و ہدایت یونہی جاری رہا تا آنکہ دنیا اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر سنِ رشد و بلوغ کو پہنچ گئی اب مشیتِ ایزدی کے اندازے کے مطابق وہ وقت آگیا کہ ان تمام حقائق کو جو اس سے پیشتر حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے دنیا میں بھیجے گئے تھے اور جو یا تو بالکل ضائع ہو چکے تھے یا ان میں تحریف واقع ہو چکی تھی ان کی اصلی شکل میں یک جا جمع کیا جائے پھر ان تمام احکامات کی جگہ جو وقتی طور پر آئے تھے ایسے احکامات بدل دیے جائیں جو قیامت تک کے لئے انسانی ضروریات کے لئے کافی ہوں اس طرح ان تمام حقائق و اصولات کو یکجا کر کے اسے محفوظ طریقے پر دنیا کو دے دیا گیا اور اسے قیامت تک کے لئے محفوظ رکھنے کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا اس مجموعۂ حقائق، ضابطۂ خداوندی کی (LATEST) اور آخری ایڈیشن کا نام قرآن ہے اب ساری دنیا میں اعلان کر دیا گیا کہ ہماری نعمتیں مکمل ہو گئیں۔ ضابطۂ حیاتِ انسانی کو آخری ترتیب دے دی گئی۔ تمام سابقہ سچائیاں اس کے اندر آگئیں اب نوعِ انسان کے لئے صرف یہی ضابطہ قولِ فیصل ہے اس کے علاوہ جو کچھ جہاں ہے ساقط العمل ہے یہ دین ہے جو یہی اسلام سب خدا ہی کا نام ہے۔ ایمان ہے تو اس پر، اس کے باہر نہ کہیں دین ہے نہ اسلام، نہ شریعت ہے نہ منہاج۔ یہ اس خدا کا ہے جس نے ان پیغامات کو بھیجا جو اس سے پہلے نافذ العمل تھے اسی نے ایک کی جگہ دوسرے کو بھیجا اسی نے ان تمام کو حذف کر کے اس ایک میں جمع کر دیا اور ان تمام کی جگہ اب صرف اسی ایک کو اپنا ضابطۂ قوانین قرار دیا اسی نے اس بات کا حکم دیا کہ اس حقیقت پر ایمان لاؤ کہ اس سے پیشتر جتنے انبیاء کرام تشریف لائے وہ اللہ کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے جو پیغامات انہوں نے دیئے وہ بھی خدا کی طرف سے نازل شدہ تھے نبی ہونے کی حیثیت سے ان حضرات

انبیاء کرام میں کوئی فرق ہے۔ پیغامات خداوندی ہونے کی جہت سے ان پیغامات میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی اس نے فرما دیا کہ اب اتباع و اطاعت صرف اسی مجموعۂ قوانین کی ہو گی جس کا نام قرآن کریم ہے یہی ہے الدین اور یہی ہے الاسلام اسی کا ہر انسان سے مطالبہ ہے اور اسی سے نجات و سعادت وابستہ ہے۔ یہ تو درست ہے کہ سچائیاں اپنے اپنے وقت میں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود تھیں لیکن یہ کہنا سراسر خلاف حقیقت اور خلاف قرآن ہے کہ اصل دین ہر مذہب میں یکساں موجود ہے (ترجمان القرآن جلد اول صفحہ ...)

"موجود تھیں" اور "موجود ہے" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور یہی فرق ہے جس پر اس جدید نظریہ کے حق و باطل ہونے کا انحصار ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔

ایمان کا مفہوم

اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن کا بنیادی مطالبہ ایمان کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایمان سے مراد صرف ایمان باللہ (خدا پرستی) ہی ہے یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی۔ سو قرآن نے بڑی تصریح کے ساتھ اس کے پانچ اجزاء بتائے ہیں:-

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (۲)

بلکہ نیکی اس کی ہے جو اللہ، آخرت کے دن، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان لائے۔

انہی اجزائے ایمانیہ کا انکار صریح گمراہی ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (۴)

اور جو اللہ، اس کے ملائکہ، اس کی کتب، رسل اور یوم آخرت سے انکار کرے تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

لیکن قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ بعض مقامات پر تو ان اجزاء کو بالتفصیل بیان کرتا ہے اور دیگر مقامات پر اس کی تفصیل کی بجائے اجزائے ایمانیہ کا اجمالی تذکرہ کر دیتا ہے اور سیاق و سباق اور نفس موضوع کے اعتبار سے جس جزو پر زور دینے کی ضرورت ہوتی ہے صرف اسی کو بیان کرتا ہے مثلاً ایک جگہ صرف اللہ پر ایمان کا ذکر ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ (۴۱/۳۰)

یقیناً جن لوگوں نے اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر فرشتے نازل ہوں گے۔

متعدد مقامات پر صرف اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان ہی کا ذکر ہے۔

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ (۲/۶۲)

جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لے آیا اور اس نے عمل صالح کئے تو ان کا اجر ان کے اللہ کے ہاں ملے گا۔

کہیں خدا اور رسولوں پر ایمان کا ذکر ہے فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ (۴/۱۷۱) پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ کہیں ان کے ساتھ ایمان بالکتاب کا بھی ذکر ہے فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنزَلْنَا (پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا)

غرضیکہ مختلف مقامات پر مختلف اجزائے ایمان کا ذکر آ گیا ہے لیکن اس سے یہ مقصود نہیں کہ ایمان کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ کئے جا سکتے ہیں اور صرف ایک یا دو اجزاء پر ایمان لے آنا مومن ہونے کے لئے کافی ہوتا ہے مطالبہ تمام اجزائے ایمانیہ کا مشترک ہے ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ یہ شق اول ہے۔

ایمان باللہ سے مراد اب شقِ دوم کی طرف آئیے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ، رسل، کتب پر ایمان لانے سے مفہوم کیا ہے؟ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان سے مقصود اطاعت ہے اللہ پر ایمان لانے سے مفہوم یہ ہے کہ اس کے احکامات کی اتباع کی جائے (اطیعوا اللہ) محض اللہ کی ہستی کا اقرار کر لینا ایمان نہیں کہلا سکتا۔ دنیا میں چند دہریوں کے سوا کون ہے جو اللہ کی ہستی کا قائل نہیں ہے ہیں اختلاف ہوگا، تصور میں اختلاف ہوگا تعینِ صفات میں اختلاف ہوگا لیکن اس کی ذات کا اقرار تو ہر جگہ ملے گا سو اگر ایمان سے مراد فقط اللہ کی ذات کا اقرار ہوتا تو قرآن کریم ان لوگوں کو کافر کیوں کہتا جو خدا کی ہستی کا اقرار کرتے تھے قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر اس کی تصریح موجود ہے کہ جب ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟

بارش کون برساتا ہے؟ ہوائیں کون چلاتا ہے تو یہ جواب میں کہیں گے کہ اللہ! لیکن اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ حیرت ہے کہ اس اقرار کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اس سے ظاہر ہے کہ ایمان کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔ ذات باری تعالیٰ کا ان تمام تفصیلات کے ساتھ اقرار جو قرآن میں مذکور ہیں اور اس کے ساتھ اس کے احکامات کی اطاعت یہ ہے ایمان باللہ کا قرآنی مفہوم چونکہ خدا کے احکام حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے ملتے ہیں اور خدا کی وحی میں محفوظ ہوتے ہیں اس لئے اللہ پر ایمان کے ساتھ اس کے انبیاء اور کتب پر ایمان کا بھی مطالبہ کیا گیا اس سے بھی یہی مفہوم ہے کہ احکامات خداوندی کی اطاعت کی جائے خود قرآن کریم کے متعلق فرمایا:۔

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ

جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء کی پیروی مت کرو۔

دین کا مدار ہی اطاعت پر ہے خالص اور بے لوث خدا کی اطاعت۔ قرآن سے پیشتر کی کتابوں کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی وہ کتابیں ضائع ہو گئیں محرف ہو گئیں یا ساقط العمل قرار پا گئیں لہٰذا ان کی اطاعت بھی ختم ہو گئی اور جب کتاب ہی اپنی اصل شکل میں نافذ العمل نہ رہی تو ان کے لانے والے رسول کی رسالت کا زمانہ بھی ختم ہو گیا۔ ان سب کے بعد نبی آخر الزمان تشریف لائے جن پر نازل شدہ کتاب (قرآن کریم) اپنی اصلی شکل میں قیامت تک کے لئے نافذ العمل ہے اس لئے اب اللہ اور اس کے رسول پر ایمان (یعنی اطاعت) قرآن کریم کی اتباع میں مضمر ہے اب نبی اکرمؐ سے پیشتر رسولوں اور قرآن کریم سے پہلے کی کتابوں پر ایمان سے مفہوم یہ رہ گیا کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کے سچے پیغامبر اور ان کے پیغامات خدا کے سچے احکام تھے اب وہ تمام احکام قرآن کریم کے اندر آچکے ہیں۔

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ

اور ہم نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو پہلی کتابوں (کے دعاوی) کو سچ کر کے دکھانے والی اور ان

جو لوگ اس نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کی عزت کریں گے اور اس کی مدد کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو اس کے ساتھ نازل کیا جائے گا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے"۔

غور کیجئے کہ فلاح و سعادت کے لئے قرآن کریم نے کیا شرط لازم قرار دی ہے۔ نبی اکرم پر ایمان اور قرآن کریم کی اتباع اسی کا نام اسلام ہے۔ یہاں صرف حضرت موسیٰ کے متعلق ارشاد ہے دوسرے مقام پر تمام انبیاء کرامؑ کے متعلق بھی ایسا ہی فرمایا ہے :-

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ ......

.... وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ○ (۳ / ۸۰-۸۴)

جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب و حکمت عطا فرمائی ہے پھر جب تمہارے پاس وہ رسول آئے جو مصدق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی تائید کرنا۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا۔ انھوں نے کہا بیشک ہم اقرار کرتے ہیں اس پر اللہ نے کہا کہ اس پر گواہ رہنا اور دیکھو تمہارے ساتھ میں بھی اس پر گواہ ہوں تو اب جو کوئی اس عہد و قرار کے بعد اس سے روگردانی کرے گا تو یقیناً ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسری راہ ڈھونڈھ نکالیں؟ حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی ہے طوعاً و کرہاً سب اللہ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ اور بالآخر سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اے رسول تم کہدو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ اور یعقوبؑ کی اولاد پر نازل ہوا ہے اور اس پر بھی جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور تمام انبیاء کو دیا گیا ان کے رب کی طرف سے۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفرقہ نہیں کرتے اور ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔

تو دیکھو جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کی طلب کرے گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا

اور آخرت میں اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے۔

انبیاء سے عہد لینے سے مطلب یہ ہے کہ ان کی وساطت سے ان کی امتوں سے عہد لیا گیا تھا۔ چنانچہ کتب سماوی کے جو بچے کچے حصے کہیں آج بھی موجود ہیں ان میں اس امر کی طرف اشارات ملتے ہیں کہ وہ انبیاء رشد و ہدایت کے اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی (یعنی نبی آخر الزمان) پر ایمان لانے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ یہی اس نظام خداوندی کا تقاضا تھا۔ لہٰذا نبی اکرمؐ کے تشریف لے آنے کے بعد حضورؐ پر ایمان کے بغیر نجات و سعادت کی کوئی راہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تفریق بین الرسل (رسولوں میں ایک دوسرے میں فرق کرنے) کو کفر قرار دیتا ہے (ﷺ)

شقِ دوم سے ظاہر ہے کہ:۔

(۱) رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے سے مفہوم صرف انہیں مان لینا نہیں بلکہ ان کی اطاعت کرنا ہے۔

(۲) تفریق بین الرسل کفر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام رسول اپنے اپنے وقت میں خدا کی طرف سے پیغامِ رشد و ہدایت لاتے رہے اور اپنے اپنے وقت میں ان کی اطاعت فرض تھی۔

(۳) نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کے یہی معنی ہیں کہ قرآن کی اطاعت کی جائے اور چونکہ حضورؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا اس لئے قرآن کی اطاعت قیامت تک کے لئے ہے اور تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے۔

(۴) اب جو کوئی خدا، اس کے رسولوں اور کتابوں پر اس طرح ایمان لائے گا جس طرح نبی کریمؐ نے بتایا تو وہی ہدایت پر سمجھا جائے گا۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ (۲/۱۳۷)

پس اگر یہ لوگ اس پر اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ راہِ ہدایت پر ہوں گے اور اگر یہ اس سے پھر جائیں گے تو پھر یہ مخالفت کی راہ ہوگی۔

ایمان بالرسالت سے مفہوم

کہا جاتا ہے کہ جو لوگ تمام مذاہب کو یکساں قرار دیتے ہیں وہ محمد رسول اللہ کی سچائی کا بھی اقرار کرتے ہیں اس لئے یہ تفریق بین الرسل نہیں ہوئی۔

حضورؐ کو بھی خدا کا سچا رسول مانتے ہیں چنانچہ خود جناب آزاد نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے خدا کی توحید کے ساتھ حضورؐ کے درجۂ رسالت و عبودیت کا اقرار بھی ضروری ہے صفحہ؟!!۔

یعنی جناب آزاد کے نزدیک۔

(۱) دوسرے انبیاء کرام کی طرح نبی اکرمؐ پر ایمان تو ضروری ہے۔

لیکن

(۲) نجات و سعادت کے لئے اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر کاربند ہونا ہی کافی ہے۔

یعنی ان کے نزدیک صورتِ حال یوں ہوئی کہ جس طرح مسلمان حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ و دیگر انبیائے کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ تھے لیکن اتباع صرف اس کی کتاب کی کرتے ہیں جو محمد رسول اللہ کو ملی تھی اسی طرح اگر عیسائی اور موسائی حضرت محمد رسول اللہ کو منجانب اللہ سمجھ لیں لیکن اتباع اپنے ہی مذہب کی کرتے رہیں تو اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اس غلط فہمی کی بنیاد اس اصل پر ہے کہ ان حضرات کے نزدیک محمد رسول اللہ پر ایمان سے مفہوم فقط اتنا ہے کہ آپ کے متعلق یہ اقرار کر لیا جائے کہ آپ منجانب اللہ رسول تھے اور بس۔ حالانکہ شق دوم میں قرآن کریم کی نصوص صریحہ سے واضح کیا جا چکا ہے کہ جب انبیائے سابقہ (علیہم السلام) اور نبی کریمؐ (یا کتب سابقہ یا قرآن کریم) کے متعلق ایمان کا لفظ بولا جائے گا تو اس کے قرآنی مفہوم میں ایک بنیادی فرق ہوگا یعنی ایک نئے نبی کے آنے کے بعد سابقہ نبی یا نئی کتاب کے نازل ہونے کے بعد پہلی کتاب پر ایمان کے معنی فقط اتنے ہوں گے کہ وہ نبی یا وہ کتاب اپنے وقت میں منجانب اللہ تھی اور اس نئے نبی اور نئی کتاب کے متعلق ایمان سے مفہوم یہ ہوگا کہ انہیں منجانب اللہ مانا جائے اور ان کی اطاعت بھی کی جائے جس طرح ایک جدید وائسرائے کے آنے کے بعد اس کے پیش رو کے متعلق فقط اتنا ماننا ضروری رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں بادشاہ کا جانشین تھا لیکن اطاعت اس جدید وائسرائے کے ذریعہ دیئے ہوئے احکام ہی کی لازم ہوگی لہٰذا جب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم تمام انبیائے سابقہ پر ایمان لاتے ہیں تو اس سے مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہم اس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ تمام حضرات اپنے اپنے وقت

میں اللہ کے پیغامات کے حامل اور باذن اللہ مطاع تھے۔ لیکن نبی آخر الزمانؐ کی تشریف آوری کے بعد اطاعت فقط قرآن کریم کی باقی رہ گئی اس لئے اس کے اندر تمام سابقہ کتب کی سچائیاں جمع کر دی گئی ہیں اور ان پر مزید احکامات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے لہٰذا التفریق بین الرسل سے مراد اتنا ہی مفہوم نہیں کہ اس امر کا زبانی اقرار کر لیا جائے کہ تمام انبیائے سابقہ (مع نبی کریمؐ) منجانب اللہ رسول تھے بلکہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمام انبیائے سابقہ کی رسالت کے اقرار کے ساتھ ساتھ اطاعت خدا کی آخری کتاب کی کی جائے اگر نبی کریمؐ کی رسالت کا زبانی اقرار ہو اور اطاعت اپنے اپنے مذہب کی کی جائے تو یہ قرآنی ایمان نہیں ہے کفر ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَكُمْ وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (۴/۱۷۰)۔

اے نوع انسان! یقیناً تمہاری طرف اللہ کا رسول حق کے ساتھ آیا ہے سو اگر تم ایمان لے آؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم کفر کرو تو (تمہارے کفر سے خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا) جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب اسی کا ہے اور ...

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ ایک شخص مانتا ہے کہ نبی کریمؐ ایک راستباز اور حق گو انسان تھے وہ خدا کی طرف سے سچے رسول تھے۔ لیکن اطاعت اپنی مذہبی کتاب کی کرتا ہے جو اس کے اسلاف سے اس کے پاس چلی آتی ہیں اور جن کی نسبت کسی سابقہ رسول کی طرف کی جاتی ہے تو سوچئے کہ اس کے اس زبانی اقرار ایمان سے مفہوم کیا ہے۔ یعنی وہ مانتا ہے کہ خدا کی طرف سے حضورؐ پر قرآن کریم نازل ہوا اور اس قرآن میں یہ لکھا ہے کہ ہدایت و سعادت قرآن کے اتباع ہی سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن وہ اتباع و اطاعت کے لئے اور گوشے تلاش کرتا ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ وہ حضورؐ کو اللہ کا آخری رسول اور قرآن کو خدا کی کتاب نہیں مانتا ورنہ قرآن کی اطاعت کیوں نہ کرتا۔

برہمو سماجی مسالک

جو لوگ اس قسم کی "رواداری" اور وسعت نظر کی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو خود فریبی میں مبتلا ہیں یا فریب دیتے ہیں اور جو مسلمان بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ازروئے قرآن اس بات کا بھی امکان ہے کہ رسول اللہ کو خدا کا سچا رسول مانتے ہوئے پیروی کسی اور مذہب کی کی جائے

تو وہ ان کے اس مذہب پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ خود ہندوستان میں برہمو سماجیوں کا فرقہ موجود ہے جن کے مخصوص عقائد یہ ہیں:-

(۱) خدائے واحد کی اور صرف اسی کی پرستش کی جائے۔ خدا کا کوئی اوتار نہ مانا جائے بت پرستی کی مذمت کی جائے۔

(۲) صحیفۂ فطرت کو مذہبی معتقدات کا بنیادی اصول مانا جائے۔

(۳) اگرچہ اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد کسی خاص کتاب پر نہ رکھی جائے لیکن ہر الہامی کتاب کی صداقت و حقانیت کو تسلیم کیا جائے۔

(۴) ہر مذہب کے بڑے سچوں کو عقائدی اصول مانا جائے۔

(۵) ظواہر و رسوم پر عقیدہ نہ رکھا جائے بلکہ مقصد اصلی قلبی صفائی کو قرار دیا جائے۔

(ملخص از انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا و انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس)

زرتشتی اور بدھ مت کے تمام گوشے اسی تعلیم کے اندر سمٹے ہوئے ہیں لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس کے باوجود برہمو سماجی حضرات بدستور ہندو ہی رہے ہیں۔ ان حضرات کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی الہامی کتاب کی "حقانیت و صداقت" کے اقرار کے معنی فقط اتنے ہی ہیں کہ زبان سے اقرار کر لیا جائے کہ وہ بھی کتاب ہے ان کے اس ایمان میں اطاعت شامل نہیں ہے۔ قرآنی نقطۂ خیال سے یہ حضرات ایک کھلی ہوئی غلطی پر ہیں مگر چونکہ ان کے سامنے قرآن کریم نہیں اس لئے ان کا یہ عقیدہ چنداں درخورِ اعتنا نہیں۔ لیکن جو شخص قرآن کریم کو اپنے سامنے رکھنے کا مدعی ہو اگر وہ بھی اس عقیدہ کا ہمنوا ہو جائے تو اس کے متعلق کیا کہا جائے وہ قرآن جو کھلے کھلے الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ۨالَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۱۵۸/۷)

(اے رسول! ان سے کہہ دو کہ) اے نوعِ انسانی! میں تم تمام کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی مارتا اور وہی جلاتا ہے پس ایمان لاؤ تم اللہ پر اور اس کے رسول نبیِ اُمّی پر۔ جو خود اللہ پر اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

لہٰذا کوئی شخص رسولِ اکرمؐ کو خدا کا سچا رسول اور قرآن کریم کو خدا کی سچی کتاب ماننے کے دعویٰ میں سچا نہیں ہے۔ تاوقتیکہ وہ قرآن کی اتباع نہ کرے اور یہ خطاب تمام نوعِ انسانی سے ہے کسی خاص فرقہ یا گروہ سے نہیں۔

اب شقِ سوم کی طرف آیئے۔ یعنی کیا اتباع میں احکامِ کتاب کی اتباع بھی ضروری ہے یا محض اپنے اپنے مذہب پر خدا پرستی اور نیک عملی ہی نجات و سعادت کے لئے کافی ہے اس باب میں جناب آزاد کے نظریہ پر ایک دفعہ پھر نظر ڈال لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

(۴) اس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے۔ تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(۵) اس نے بتایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ .... ترجمان القرآن (صفحہ ۲۳/۱۰)

ان تصریحات کے ساتھ سورۃ البقرہ کی آیت ۶۲ کا حسب ذیل تشریحی نوٹ بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

(۱) دینِ حق کی اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ یہ نہیں ہے کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا

معاملے بیٹے کی کوئی خاص پابندی۔ اسی طرح کی کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے بلکہ وہ تو خدا پرستی
اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔ (صفحہ ۲۲۹ تفصیل اصل کتاب میں دیکھئے)

یہی اقتباسات پنڈت سندر لال جی نے اپنے خطبہ صدارت میں پیش کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ چونکہ خدا پرستی اور نیک عملی کی تعلیم تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے اور یہی اصل دین ہے اس لئے ایک ہندو جو اپنے طور طریقہ پر اپنے مذہب کی شریعت کا پابند ہے اسی طرح نجات و سعادت کا مستحق ہے جیسے ایک مسلمان قرآنی شریعت کے اتباع سے نجات کا مستحق۔

قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ قرآن کی رو سے شرع و منہاج کو کتنی اہمیت حاصل ہے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جناب آزاد نے اپنے اس نظریہ کی رو سے اسلام کی جڑ پر ایسی ضرب کاری لگائی ہے کہ اس نظریہ کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ شجر مقدس پورے کا پورا اکھڑ کر باہر آ جاتا ہے۔

قرآن عالمگیر ہے

قرآن کی رو سے نبی اکرمؐ سے پہلے جتنے انبیاء کرام تشریف لائے وہ ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوئے۔ اور ایک خاص وقت کے لئے ان کا پیغام نافذ العمل رہتا یعنی ان کی رسالت کا دائرہ زمان و مکان کی حدود سے گھرا ہوا تھا اس لئے ان کی وساطت سے جو احکامات نافذ ہوتے وہ اس خاص قوم کے حالات کے پیش نظر دیئے جاتے جن کی طرف وہ مبعوث ہوتے نبی اکرمؐ کی تشریف آوری سے یہ نظام بالکل بدل گیا۔ حضورؐ کی بعثت کسی خاص قوم ملک، قبیلہ، گروہ یا کسی خاص وقت کے لئے نہیں بلکہ آپ کا پیغام ہمہ گیر اور آپ کی مخاطب تمام نوع انسانی ہے سارا قرآن اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے حضورؐ کی رسالت کا دائرہ زمان اور مکان کے حدود سے محدود نہیں بلکہ دنیا کے ہر ملک میں ہر زمانہ میں قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لئے حضورؐ کی رسالت یکساں ہے اس لئے جو شرعی احکام قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ کسی خاص قوم کے حالات خاص کو سامنے رکھ کر وضع نہیں کئے گئے بلکہ وہ عالمگیر ہیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کریم کے تشریعی احکام نبی اکرمؐ کے زمانہ کے اہل عرب کے حالات و مقتضیات کے مطابق نافذ ہوئے تھے تو اسلام کی عالمگیریت کا دعویٰ خود بخود باطل ہو جاتا ہے اس صورت میں اسلام کے احکامات نہ ہر زمانہ میں نافذ العمل ہو سکتے ہیں نہ ہر قوم پر ان کی پابندی

لازم قرار دی جا سکتی ہے اس لئے قرآن کریم کے تشریعی احکام کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ

"ہر عہد اور قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اس کے لئے اختیار کئے جائیں اسلام کے دعوائے آفاقیت (عالمگیریت) کی کھلی ہوئی تردید ہے اسلام نوعِ انسانی کا دین ہے اور اس کے احکام و اعمال کسی خاص قوم اور خاص عہد کی حالت کو سامنے رکھکر متعین نہیں کئے گئے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ مذہب کے ظواہر و رسوم کو میکانکی طریق سے ادا کر لینے کا نام اتباعِ احکام نہیں یہ ظواہر و رسوم جسم کی مثل ہیں جس میں روح کا ہونا نہایت ضروری ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کے احکام حضور کے زمانے کے حالاتِ زندگی کے پیش نظر اختیار کئے گئے تھے اور آج انھیں کوئی اہمیت حاصل نہیں اور آج نجات و سعادت میں ان کو کوئی دخل نہیں کوئی جاہل ہوتا تو اسے ہم سمجھانے بھی، حیران ہیں کہ جناب آزاد جیسے سمجھدار انسان کو ہم کیسے سمجھائیں کہ اسلام ایک نظام کا نام ہے اور نظام کا ہر جزو کل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ احکام قرآنی اس نظام اسلامی کے بنیادی اجزا ہیں اور دنیا کے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے یا اسلام کے دعوی کے ساتھ ساتھ یہ بھی جائز قرار دے کہ نجات و سعادت "ان اعمال و احکام کے علاوہ اور طرح سے بھی حاصل ہو سکتی ہے نجات و سعادت" اسلامی نظام کا فطری نتیجہ ہے اس نظام کے جزئیات کو بدل دیجئے یہ نتیجہ خود بخود بدل جائے گا جب قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام کے سوا کوئی اور دین قابل قبول نہیں تو اس سے مقصود اسلامی نظام ہے نہ کہ "خدا پرستی اور نیک عملی" کے مبہم اور غیر متعین الفاظ۔ قرآن کریم کھولئے اور دیکھئے کہ اس میں ان نظامی پابندیوں کو کتنی اہمیت دی گئی ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اہلِ کتاب خدا کو بھی مانتے تھے اور اپنے خیال کے مطابق نیک اعمال بھی کرتے تھے بایں ہمہ مسلمانوں کو خاص حالات کے تحت، جس طرح کفار و

ابتلاعِ الہام

مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا اسی طرح اہلِ کتاب سے بھی قتال کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کی رو سے اہلِ کتاب کے خلاف جو فردِ جرم (چارج شیٹ) عائد کی گئی ہے اسے ملاحظہ فرمائیے:۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا

يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ - ۹/۲۹

اہل کتاب جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا اور رسول نے حرام ٹھہرایا ہے اور نہ سچے دین کو ہی قبول کرتے ہیں ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر جزیہ دینا قبول کریں

اس آیۂ جلیلہ سے حسب ذیل امور کی تصریح ہو گئی۔

(۱) اہل کتاب ہر چند خدا اور آخرت پر ایمان کے مدعی تھے (اور ہیں) لیکن قرآن کریم ان کے اس ایمان کو ایمان ہی قرار نہیں دیتا اس لئے کہ جیسا کہ شق اول میں بتایا جا چکا ہے قرآن کریم کی رو سے ایمان وہی ایمان ہے جو اس طریق پر لایا جائے جو قرآن نے بتایا ہے۔

(۲) اہل کتاب کو اس طرح پر ایمان نہ لانے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرام اور حلال میں ان پابندیوں کو ملحوظ نہیں رکھتے جو قرآن کریم نے عاید کی ہیں اس سے واضح ہو گیا کہ ایمان صرف "خدا پرستی" اور "نیک عملی" (بزعم خویش) کا نام نہیں۔ بلکہ قرآن کریم کے تشریعی احکام کی پابندی بھی ضروری ہے۔

(۳) تیسرے ٹکڑے میں اس امر کی وضاحت بیان فرمائی کہ ان لوگوں کا اپنے اپنے طریقہ پر خدا پرست بن جانا کچھ معنی نہیں رکھتا ان کے لئے دین الحق قبول کرنا نہایت ضروری ہے یعنی اسلام میں داخل ہونا ضروری شرط ہے دین الحق اس مذہب کا نام ہے جو نبی کریمؐ کی وساطت سے دنیا میں بھیجا گیا ہے قرآن میں جہاں جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اسی دین کے لئے استعمال ہوئے ہیں ملاحظہ ہو ۹/۳۳ ، ۴۸/۲۸ ، ۶۱/۹

مندرجہ صدر آیت کا مطلب بالکل واضح ہے لیکن چونکہ یہ حقیقت جناب آزاد کے نظریہ کے خلاف جاتی تھی اس لئے انہوں نے اپنے ترجمہ میں ایسا اضافہ فرمایا ہے جس سے اس کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے۔ وہ اس آیت کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:-

اہل کتاب میں سے جن لوگوں کا یہ حال ہے کہ نہ تو خدا پر (سچا) ایمان رکھتے ہیں نہ آخرت کے دن پر نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرا دیا ہے نہ سچے دین پر عمل پیرا ہیں ... (ترجمان [illegible])

ذرا غور فرمائیے ترجمہ میں چار لفظوں کے اضافے نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی قرآن تو یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے" یعنی قرآن کریم میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یہ لوگ انہیں حرام نہیں سمجھتے لیکن جناب آزاد نے یہ کہکر کہ جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے (ان کی کتاب میں) حرام ٹھہرایا ہے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن صرف یہ چاہتا ہے کہ یہ لوگ ان چیزوں کو حرام سمجھیں جو ان کی کتاب میں حرام ٹھہرائی گئی ہیں اندازہ فرمائیے قرآن کریم پر یہ کتنا بڑا اضافہ ہے اور اس اضافہ کی کتنی بڑی جرأت! یہ ہے تفسیر کا وہ طریق جس سے یہ حضرات اپنے نظریوں کو قرآنی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور نہیں ڈرتے کہ یہ جرأت کس قدر بے باکی ہے!

گزشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) قرآن کریم کی رو سے اجزائے ایمانیہ پانچ ہیں قرآن میں کسی جگہ خواہ ان میں سے ایک کا ذکر ہو یا ایک سے زیادہ کا مقصود اس سے پانچوں اجزاء ہیں ان میں سے ایک کا انکار بھی کفر ہے۔

(۲) ان پانچ اجزائے ایمانیہ میں نبی اکرمؐ کی رسالت اور قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان بھی جزو لاینفک ہے۔

(۳) ایمان سے مفہوم صرف اقرار کر لینا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اطاعت بھی ہے۔

(۴) ہر رسول اور ہر کتاب کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی اور نبی اکرمؐ کے بعد اطاعت خدا کی آخری کتاب قرآن کریم کی ہوگی نہ کہ پہلی کتابوں کی۔

(۵) قرآن کے تشریعی احکام نظام اسلامی کا ضروری جزو ہیں اور ان کی اطاعت لازمی ہے۔

ان تصریحات کو سامنے رکھنے کے بعد اس آیت کا مطلب سمجھئے جو اس باب میں اس جدید نظریہ (یکسانیت مذاہب) کے مؤیدین کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

تحقیق جو لوگ ایمان والے ہیں اور یہود و نصاریٰ اور صابئین اور جو شخص بھی اللہ اور آخرت پر ایمان
لائے اور عمل اچھے کرے ان کا اجر ان کے اللہ کے پاس ہے۔ اور ان کو کسی قسم کا خوف و حزن نہیں۔

ایک اہم آیت

اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور صابئین سے صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا مطالبہ ہے قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں جو کچھ ہم اس وقت تک لکھ چکے ہیں اس کے پیش نظر اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے میں دقت نہ ہوگی پہلی چیز تو یہ کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت صرف انہی دو اجزاء پر ایمان مقصود نہیں بلکہ ان کے اندر پانچوں اجزائے ایمانیہ شامل ہیں قرآن شریف میں جہاں بھی ایمان کا تذکرہ ہے مکمل ایمان کا ہے اور اس مکمل ایمان کے متعلق تصریحاً ارشاد موجود ہے کہ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا (اگر یہ لوگ بھی ایمان لائیں جیسا تم لائے ہو پھر یہ ہدایت پر سمجھے جائیں گے)۔

دوسرے یہ کہ اگر اس سے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان ہی کا مطالبہ ہو تو آیت میں یہود و نصاریٰ کے علاوہ خود مسلمانوں کا بھی ذکر ہے تو کیا مسلمانوں سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ وہ فقط اللہ اور آخرت پر ایمان رکھیں! اگر ان سے بھی یہی مطالبہ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن پر ایمان کا مطالبہ کن سے ہوگا۔

آیت کا مطلب واضح ہے۔ اسلام سے پہلے لوگوں نے مذہب کو نسلوں (قوموں) کے اندر مقید کر رکھا تھا تورات، قوم بنی اسرائیل (یہود) کے لئے مذہب عیسوی بھی انہیں کے لئے۔ کیونکہ انجیل میں یہ قول حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے آیا ہوں بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہیں ڈالی جا سکتی، ہندوؤں کے ہاں انسانوں کی تقسیم ہی پیدائشی درجوں کی رو سے ہوتی ہے اور درجوں کی یہ کیفیت کہ نچلے درجہ کا ہندو اوپر کے درجہ میں جا سکتا ہے اور نہ ہی خدا کے حریم قدس میں اس کے لئے باریابی کی کوئی راہ کھلی ہے پھر اس کے ساتھ یہ بھی مذہبی عقائد میں داخل ہو چکا تھا کہ ایک شخص محض یہودی کے ہاں پیدا ہو جانے سے (ابناء اللہ) (خدا کی اولاد میں) داخل ہو کر نجات کا مستحق ہو جاتا ہے عیسائی کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کی نجات کے ذمہ دار حضرت مسیح علیہ السلام بن جاتے ہیں ایک پیدائش کی رو سے برہمن ہے یعنی مذاہب عالم میں یہ عقیدہ موجود تھا کہ:-

(۱) نجات و سعادت محض ایک خاص فرقہ کے گھر میں پیدا ہو جانے سے مل جاتی ہے۔ اور

(۲) اس فرقہ کے باہر کا انسان چونکہ اس فرقہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ (کیونکہ فرقہ میں داخلہ تو صرف پیدائش کی رو سے ہوتا ہے) اس لئے اس پر نجات کے سب دروازے بند ہیں (واضح رہے کہ ہندوؤں اور یہودیوں میں تبلیغ کا تصور ہی نہیں اور عیسائیوں کے ہاں بھی تبلیغ بعد کی چیز ہے)

قرآن نے آکر ان نظریات کی تردید کی اور اعلان کر دیا کہ نجات کو پیدائش سے کوئی تعلق نہیں کوئی کسی کے گھر میں پیدا ہو (یہودی، نصرانی، صابی وغیرہ) وہ ایمان لانے سے اسلام کے دائرہ میں کھلے بندوں داخل ہو سکتا ہے۔ اور اعمال صالحہ کرنے سے جنت کا اہل بن جاتا ہے۔

(مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝)

باقی رہے مسلمان سو انہیں بھی اس زعم باطل میں نہیں رہنا چاہیئے کہ وہ محض اس لئے کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں نجات کے حقدار بن جائیں گے انہیں بھی اپنے آپ کو صاحب ایمان ثابت کر کے اعمال صالحہ کے ذریعہ جنت کا مستحق بننا ہو گا خود مسلمانوں سے ایمان کا مطالبہ صرف اسی ایک مقام پر نہیں بلکہ اور آیات میں بھی ہے مثلاً سورۂ نساء میں بھی ہے:-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ

اے مسلمانو! (ایمان والو!) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس کے رسول پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر جو اس سے پیشتر نازل کی گئیں۔

سورۂ توبہ میں ایمان کی اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا ایمان محض زبان تک تھا نہ دل کی گہرائیوں میں اس کا سرچشمہ تھا اور نہ اعمال حیات اس کے مصدق (انہیں منافقین کہا گیا ہے) زندگی کے باقی شعبوں میں تو خیر پھر بھی یہ نقاب پوشانہ روش کسی نہ کسی طرح نبھ جاتی تھی لیکن میدانِ جہاد ایمان کی بہت

بڑی کسوٹی تھی۔ اس موقع پر یہ لوگ اِدھر اُدھر کی بہانہ تراشیوں سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اصطلاحی مسلمان تھے ایمان کا اقرار زبانی ہی زبانی تھا۔ ان کے مقابل میں وہ پکے مسلمان تھے جو مشکل سے مشکل مقام پر اپنے ایمان کا زندہ ثبوت پیش کرتے تھے۔ ان ہر دو فریق کے متعلق فرمایا:۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَن يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۝ إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ (۹/۴۴-۴۵)

"جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال و جان سے جہاد کرنے کے بارے میں تم سے اجازت نہ مانگیں گے اور اللہ متقین کو جانتا ہے (جہاد میں نہ جانے کے لئے) صرف وہی لوگ تم سے اجازت مانگیں گے جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں سو وہ اپنے شک میں حیران متردد ہیں۔"

اس آیت مقدسہ سے دو باتیں واضح طور سے سامنے آگئیں۔

(۱) ظاہر ہے کہ وہ اہلِ ایمان (پکے مسلمان) جو جہاد میں مال و جان سے شریک ہوتے تھے اللہ اور آخرت کے علاوہ ملائکہ، کتب اور رسل پر بھی ایمان رکھتے تھے لیکن یہاں صرف ان کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہی کا ذکر کافی سمجھا گیا ہے۔

(۲) منافقین وہ لوگ تھے جو زبان سے تمام اجزائے ایمان کا اقرار کرتے تھے مسلمان کہلاتے تھے، ہم میں رہتے تھے لیکن قرآن ان کے ایمان کو ایمان نہیں تسلیم کرتا اور واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔"

(۳) لہٰذا جب مسلمانوں سے کہا جائے گا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لاؤ اور نیک اعمال کرو تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا پیدائشی مسلمان ہونا محض زبان سے ایمان کا اقرار کر لینا کافی نہیں ایمان دل سے ہونا چاہیئے اور اعمال

زندگی سے اس کی تصدیق ہونی چاہیئے۔ یہ ہیں سچے مومن۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ○ (۴۹/۱۵)

(مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور پھر اس ایمان میں انہیں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جان سے جہاد کریں یہ لوگ ہیں سچے مسلمان)

ان تصریحات کی روشنی میں اب ذرا فریق مقابل کے نظریہ کا تجزیہ کیجئے یعنی ایک مسلمان کے لئے "نجات و سعادت" حاصل کرنے کے لئے ایسی کڑی شرطیں ہیں کہ وہ اس انداز کا ایمان لائے جیسا قرآن کریم نے متعین کیا ہے پھر زندگی کے ہر ہر قدم پر اسی بارگاہ سے فیصلہ طلب کرے اور ان فیصلوں کو بطیب خاطر منظور کرتا جائے حرام اور حلال کی پابندیاں اپنے اوپر عائد کرے اور ان سب کے بعد مال اور جان جیسی عزیز ترین متاع کو ہر وقت ہتھیلی پر رکھے۔ اللہ کی راہ میں قربان کرنے پر آمادہ ہو۔ یعنی اپنے آپ کو ہر وقت شہادت گاہ میں تصور کرے تب جا کر کہیں نجات و سعادت کا متوقع ہو۔ اس کے برعکس ایک غیر مسلم (مثلاً ہندو) کے لئے فقط اتنا ضروری ہے کہ صبح اٹھ کر اپنے ہاں کے مروجہ طریقہ کے مطابق "خدا کی بھگتی" کرلے اور کبھی کبھار "دان" (خیرات) کر دے مثلاً چڑیوں کو دانہ ڈال دیا۔ گائے کے لئے چارہ خرید دیا۔ کیڑوں مکوڑوں کو استھانوں پر آٹا ڈال دیا اس سے آگے بڑھے تو کہیں پیاؤ بٹھا دیا اور استطاعت ہوئی تو کنواں کھدوا دیا سرائے یا ہسپتال بنوا دیا۔ دان (خیرات) کی کچھ ایسی ہی مدات ہیں اس کے بعد نہ اوپر کوئی خاص پابندی عائد کرنے کی ضرورت نہ اسلامی احکام کی کٹھن منازل طے کرنے کی حاجت نہ ہجرت کی سختیاں اٹھانا ضروری نہ خدا کی راہ میں سر کٹا دینے کا سوال درپیش (وہاں تو بلکہ جہاد کا تصور ہی گناہ ہے کہ یہ ہنسا میں داخل ہے) یہی نہیں بلکہ جہاں ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف اس نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے جو خدا کا متعین فرمودہ ہے اس غیر مسلم کو کھلی اجازت ہے کہ وہ جونسا نظام اپنے لئے چاہے وضع کرلے اور جس نظام کے ماتحت چاہے زندگی بسر کرے وہاں نظام انسانی اور خدائی نظام یا عدل نظام کا سوال ہی پیدا نہیں۔

لئے بس اتنا ہی کچھ کرنے کی ضرورت ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے تو سب سے وہ نجات کا مستحق قرار پا جائے گا اب سوچئے کہ جب انسانی زندگی کی تمام تگ و دو کا منتہیٰ حصولِ نجات ہے اور یہ مقصد ایک طرف اس قدر جاں گسل اور صبر آزما مراحل طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا اور دوسری طرف اتنی آسانی سے تو وہ کون سا صحیح العقل انسان ہوگا جو اس قدر آسان طریقہ کو چھوڑ کر ایسا کٹھن طریقِ زندگی اختیار کرے گا جس میں ایک ایک سانس پر قیامت کا سامنا ہو۔ اگر نجات اسی طرح سے حاصل ہو جاتی تھی تو پھر قرآن کریم میں اس قدر تفصیلی ہدایات اور احکامات کی کیا ضرورت تھی۔ اس میں فقط اتنا لکھ دینا کافی تھا کہ لوگو! خدا کی ہستی کو مانو اور اپنے اپنے طور طریقہ پر نیکی کے کام کرتے رہو تمہارے لئے نجات یقینی ہے اگر "رواداری اور وسعت نظر" کی الیسی "صلح کل" روش اختیار کر لی جاتی تو نہ نبیوں سے مخالفت کی آوازیں اٹھتیں اور نہ کوئی برسرِپیکار ہوتا۔ نہ حضورؐ اور آپ کے متبعین کو اس قدر تکالیف کا سامنا ہوتا۔ نہ مکہ چھوڑنا پڑتا۔ نہ مدنی زندگی میں اس قدر غزوات اور سرایا کی ضرورت پڑتی ساری دنیا خوش ہو جاتی اور انسانوں کو نجات کا طریقہ بھی نہایت آسان سا مل جاتا۔ اور پھر اس کے بعد آج تک جو چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی مسلسل ستیزہ کاری چلی آتی ہے اس کا بھی کہیں وجود نہ ہوتا۔ ساری دنیا (سوائے چند دہریوں کے جو خدا کی ہستی کے منکر ہیں) مومن ہوتی اور نہ واسطہ حق و باطل کا کوئی جھگڑا ہی پیدا ہوتا۔

خدا پرستی اور نیک عمل

خدا پرستی اور نیک عمل کے مبہم الفاظ پر ذرا پھر غور کیجئے۔ سوال یہ ہے کہ خدا پرستی کسے کہتے ہیں اور نیک عمل کیا ہے؟ کیا یہی کہ جس انداز پر کسی کا جی چاہے خدا کی پوجا و پرستش کر لے اور جس کام کو وہ نیک سمجھتا ہے اسے اختیار اور جسے برا قرار دیتا ہے اس سے اجتناب کر لے؟

حقیقت یہ ہے کہ بعض الفاظ (یا مذہبی اصطلاحات) مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں لیکن وہ اسلامی مفہوم کو قطعاً واضح نہیں کرتے جن کے لئے وہ شروع میں اختیار کئے گئے تھے یہی نہیں کہ وہ الفاظ اسلامی تعلیم کے صحیح ترجمان نہیں بلکہ بعض اوقات ان سے ایک ایسا مفہوم مترشح ہوتا ہے جو روحِ اسلام کے یکسر منافی ہوتا ہے۔

انہی الفاظ میں پرستش کا لفظ بھی داخل ہے دیگر ادیان میں خدا اور بندے کا تعلق پرستش اور پوجا پاٹ وغیرہ کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے لیکن اسلام میں اس کے لئے عبودیت کا لفظ ہے جو پرستش سے الگ معنی رکھتا ہے۔ اس فرق کو نظر انداز کر دینے سے وہ تمام غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو یکسانیت مذاہب تک منتج ہوتی ہیں۔

اپنے سے کسی بڑی ہستی کا تصور انسان کے اندر ابتدا سے چلا آتا ہے جب انسانیت اپنے عہد طفولیت میں تھی تو انسانوں کی زندگی انفرادی تھی جنگلوں اور غاروں میں رہائش پھل اور شکار ذرائع معاش کسی ایک کو دوسرے سے کچھ علاقہ نہیں اس زندگی میں خدا کے ساتھ اتنا ہی تعلق سمجھا جاتا تھا کہ مصیبت کے وقت اس کے سامنے جھک گئے خوشی کے وقت اس کے حضور ناچنے کودنے سے جشن شادمانی منعقد کر دیا خدا دیوی دیوتا کے لباس میں تھا یا بتوں کی شکل میں ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ ان دیوتاؤں کو خوش رکھتے اس کوشش کے مظاہر کا نام پرستش یا پوجا پاٹ تھا اس دوران میں جب کبھی وحی آسمانی کی روشنی آگئی اس نے انسانی تصورات کے ان غلط پردوں کو اٹھا کر خدا کا صحیح تصور پیش کر دیا جب وہ روشنی گم ہو گئی تو پھر وہی تاریکی چھا گئی رفتہ رفتہ انسانیت نے کچھ اور ارتقائی منازل طے کئے اور انسانوں نے مل جل کر رہنے کی طرح ڈالی اب غیر منظم قبائلی زندگی کی طرف رجحان ہوا انسانوں کا ایک دوسرے سے تعاون و تناصر کا تعلق قائم ہوا مشترک مفاد کی صورتیں جلوہ پیرا ہوئیں اس سے باہمی حقوق اور ان کی نگہداشت کا سوال پیدا ہوا اور ان کے صحیح تعین کے لئے خدا کی طرف سے احکام بھی آنے شروع ہوئے ظاہر ہے کہ جس قدر انسانی مقتضیات ہوتے تھے اسی اندازہ سے احکام ملتے تھے زمانہ آگے بڑھتا گیا ان مقتضیات میں ترقی اور تبدیلی ہوتی گئی اور ان کے ساتھ ساتھ سلسلہ ہدایت آلہیہ بھی بڑھتا چلا گیا ان احکام کی رو سے انسان اور خدا کے درمیان تابع اور متبوع حاکم و محکوم کا تعلق قائم ہوا چونکہ آسمانی ہدایت زیادہ عرصہ تک انسانوں کے پاس محفوظ شکل میں رہتی نہ تھی اس لئے ہدایت کی روح مسخ ہو جاتی خدا کے متعلق حاکم اور فرمانروا کا تصور بھی گم ہو جاتا اور پھر وہی پرستش کا ابتدائی تصور غالب آ جاتا یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ انسانوں نے انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کی زندگی اختیار کرنی شروع

کے بعد ان کی تمام جدوجہد کا منتہیٰ اجتماعیت کی تشکیل گیا۔ اب وقت تھا کہ انہیں ایک ضابطۂ حیات دیا جاتا جس میں نظامِ اجتماعیت کی مکمل تزئین صورتوں کے لئے آئین و قوانین موجود ہوں۔ اس ضابطہ نے یہ بتایا کہ نظامِ اجتماعیت کے لئے جس قدر بھی ضوابط ذہنِ انسانی کی پیداوار ہوں گے وہ انسانیت کی نشوونما و ارتقا کے راستہ میں حائل ہو جائیں گے۔ انسانیت کی نشوونما صرف اس ضابطۂ حیات کی رو سے ہو سکتی ہے جو تشکیلِ اجتماعیت کے لئے خدا کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔ اور جسے قرآنِ کریم کہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اب خدا پر ایمان رکھنے والے ہر انسان کا فریضہ ہے کہ کسی ایک خطۂ زمین پر انسانوں کی جماعتوں کے وضع کردہ نظامہائے زندگی کی جگہ اس نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد کرے جو خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ یعنی دنیا میں انسانوں کی جگہ خدا کی بادشاہت قائم ہو اور اس طرح انسان اور خدا میں وہ رشتہ قائم ہو جائے جو خدا اور بندے کے درمیان صحیح تعلق ہے۔ یعنی عبد اور معبود، محکوم اور حاکم کا تعلق۔ عبودیت سے مراد ہے کہ اپنی تمام قوتوں کو نظامِ خداوندی کے تقاضوں کے مطابق صرف کیا جائے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ پرستش کا عقیدہ خدا اور بندے کے تعلق سے قرآنی مفہوم کو قطعاً ادا نہیں کرتا۔ یہی نہیں کہ صرف ادا ہی نہیں کرتا بلکہ ایک الگ مفہوم پیدا کر دیتا ہے وہ مفہوم جو انسانیت کے عہدِ طفولیت کا پیدا کردہ اور اس کی انفرادی زندگی کے دور کی یادگار ہے۔ اسی لئے خدا پرستی تو ہر مذہب میں یکساں ہو سکتی ہے لیکن خدا کی عبودیت صرف اسلام میں داخل ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے اس لئے جس ضابطۂ خداوندی کی رو سے خدا کی محکومیت اختیار کی جا سکتی ہے وہ قرآنِ کریم کے سوا اور کہیں نہیں۔ اسلام کا مطالبہ نظامِ خداوندی قائم کرنے کا ہے۔ خدا پرستی (یعنی خدا کی پوجا پرستش) کا نہیں۔ اسی لئے ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ .... میں خدا کے علاوہ کسی اور کی محکومیت کو جائز نہیں سمجھتا۔ باقی چیزیں جنہیں ایمان کہتے ہیں اسی اصل کی شاخیں ہیں۔ یعنی:-

ایمان کا صحیح مفہوم

(۱) خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا اقرار۔ — اللہ پر ایمان

(۲) یہ محکومیت اس ضابطہ کی رو سے اختیار کی جائے گی جو خدا کی طرف سے نازل ہوا اور جس کی آخری شکل قرآن کریم ہے۔ — کتابوں پر ایمان

کا تحفظ ہے اس نظام کا نام خدا کی بادشاہت ہے ایک شخص بڑا مجذوب ہے۔ اچھے اچھے کاموں میں حصہ لیتا ہے غریبوں کی امداد کرتا ہے عادات و خصائل نہایت عمدہ ہیں لیکن حکومت وقت کو تسلیم نہیں کرتا یا اس کی جگہ کسی دوسری حکومت کے قیام کی فکر میں ہے تو حکومت کی نگاہوں میں وہ جرم ایسا سنگین ہے کہ اس کی ذاتی نیکیاں اس کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتیں اگر اس کے خلاف یہ جرم ثابت ہو جائے تو اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔

خدا کی بادشاہت کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا نام ایمان ہے اور اس کے خلاف زندگی کا نام کفر اب آپ خود ہی اندازہ فرما لیجئے کہ کفر میں زندگی بسر کرنے والے کی ذاتی نیکیاں میزان خداوندی میں کیا وزن رکھ سکتی ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال رائگاں جاتے ہیں یعنی جن اعمال کو وہ بزعم خویش نیک سمجھتے ہیں وہ دراصل نیک ہوتے ہی نہیں اس لئے ان کا نتیجہ بھی کچھ نہیں نکلتا۔ آپ چاک کو کونین سمجھ کر صبح و شام پھانکتے رہیئے ملیریا کبھی دور نہیں ہوگا

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ ۔ .... فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۔ (۲۴/۳۹-۴۰)

جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے اعمال ایک صحرا میں سراب کی طرح ہیں جسے ایک پیاسا پانی سمجھتا ہے (اور اس کی طرف جاتا ہے) لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو وہاں کوئی (اصلی) چیز اسے نظر نہیں آتی البتہ وہاں اللہ نظر آتا ہے جو اسے پورا پورا حساب دیتا ہے کیونکہ وہ بہت سریع الحساب ہے یا (ان کے اعمال ایک بحر ذخار میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کی طرح ہیں جہاں موج پر موج متلاطم ہو اور ان کے اوپر سیاہ بادل تو بر تو ظلمت (ایسا کہ) جب وہ اپنا ہاتھ باہر نکالے تو دکھائی نہ دے (اور حقیقت یہ ہے کہ) جسے اللہ روشنی نہ دے اسے کہیں سے روشنی نہیں مل سکتی۔

اس لئے کہ یہ لوگ نظام حیات کو اعمال حیات سے الگ سمجھتے ہیں حالانکہ اعمال وہی نتیجہ خیز ہیں جو صحیح نظام کے تابع ہوں نظام سے الگ ہٹ کر انفرادی اعمال کچھ وقعت نہیں رکھتے سورۂ توبہ کے تیسرے رکوع کو دیکھئے کیسے دلنشین انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا :۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ .... (التوبۃ، ۱۹)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانا، سبیلیں لگوا دینا، یا خانہ کعبہ کی خدمت کرنا اس شخص کے برابر ہے جو اللہ اور آخرت (نظام خداوندی) پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے راستے میں جدوجہد کرتا ہے (تمہاری نگاہ میں کچھ ہی کہیں)، اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے، اللہ ظالموں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں ان امور کی تصریحات موجود ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ قرآنی اصطلاح میں نیک عمل کسے کہتے ہیں۔

ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر غور فرمائیے کہ یہ نظریہ کہ نجات و سعادت کے لئے کسی خاص نظام زندگی کی ضرورت نہیں، خدا پرستی اور نیک عملی، جو اصولی طور پر ہر مذہب میں یکساں موجود ہے، نجات کے لئے کافی ہے، کس قدر قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ واضح رہے کہ یہ دعویٰ کہ اسلام کو باقی ادیان پر فضیلت و تفوق حاصل ہے کسی مذہب کے خلاف عداوت پیدا کرنے کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اسلام کسی مختلف مذہب کی ذرہ برابر عداوت نہیں سکھاتا۔ وہ تو امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ اس کے اس دعویٰ کا اعلان و تبلیغ نوع انسان کی ہمدردی اور بہی خواہی ہے۔ جیسے آپ کسی مریض سے کہیں کہ بھائی تمہارا مرض ادھر ادھر کے عطائیوں کے علاج سے نہیں جائے گا۔ اس کے لئے فلاں طبیب کی طرف رجوع کرو۔ وہی اس مرض کا ماہر ہے اور اسی کے پاس صحیح نسخہ ہے۔ یہ مشورہ مریض سے عداوت نہیں بلکہ محبت پر مبنی ہے۔ عداوت تو اس کی طرف سے ہوگی جو یہ کہے گا کہ نہیں، سب دواخانے ایک ہی جیسے ہیں، جہاں سے جی چاہے نسخہ لکھوا لو اور دوائی خرید لو۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جب دواخانہ کے اصلی مالک نے اعلان کر دیا کہ اب صحیح نسخے صرف فلاں دواخانے سے مل سکیں گے (باقی دواخانے بہت سے ناجائز نسخے بنا کر دھوکہ دیتے ہیں)، تو ہر دواخانے کو ایک جیسا بتانا مالک کے اس اعلان کی تکذیب اور

اور مریض سے کھلی ہوئی دشمنی ہے۔ وَفِيْهَا بِأَنْ تَعُوْضُوْا يَدْعُوْنَ۔

اسلام دین ہے

اس مقالہ میں اسلام کے لئے بھی مذہب کا لفظ دیا گیا ہے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اسلام درحقیقت مذہب نہیں دین ہے اس لئے اسلام کا مذاہب عالم کے ساتھ تقابل ہی غلط ہے جب یہ مذہب ہے ہی نہیں تو مذاہب کے ساتھ اس کا مقابلہ کیسا؟ یہ دین ہے اور دین کے معنی ہیں نظام حیات۔ اس لئے اسلام کا مقابلہ کرنا ہو تو دنیا کے دیگر نظامہائے حیات کے ساتھ کرنا چاہیے۔ ابوالکلام صاحب آزاد اور ان کے اتباع میں ان لوگوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام کو بھی مذہب تصور کرتے ہیں جب اسے ایک مذہب تصور کر لیا جائے تو پھر واقعی اسلام میں اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں رہتا اس صورت میں اسلام کی افضلیت ثابت کرنا بے سود کوشش ہے جب مقصود پوجا پاٹ ٹھہر تو پوجا مندر میں کر لی تو کیا اور مسجد میں کر لی تو کیا؟ جب مقصود یاترا ہو جائے تو ہردوار چلے گئے تو کیا اور مکہ ہو آئے تو کیا؟ جب مقصد دان (خیرات) سے ہو تو کسی کو بھیکھ دے دی تو کیا اور زکوٰۃ دے دی تو کیا۔ اس تصور کے ماتحت فی الواقع خدا پرستی اور نیک عملی سب جگہ ایک جیسی رہ جاتی ہے بلکہ ان کے لئے خدا پرستی کی شرط بھی بے معنی ہو جاتی ہے ضوابط اخلاق (سچ بولو۔ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ حرام نہ کھاؤ۔ زنا نہ کرو) ہر جگہ یکساں طور پر پائے جاتے ہیں حتیٰ کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں وہ بھی ان ضوابط کو صحیح سمجھتے ہیں اس اعتبار سے خدا پرستی بھی کوئی ضروری نہیں رہتی۔ ان ضوابط اخلاق کا نام "سچا دین" قرار پا جاتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں ایک مدت سے یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ اسلام بھی ایک مذہب ہے اس لئے ان کے ہاں بھی مذہب صرف پوجا پاٹ کا نام بن کر رہ گیا ہے اور نیک عملی ان ضوابط اخلاق کا نام رکھ لیا جاتا ہے جو چند خشک سی چند عبادات کی شکلیں۔ اور وہ اخلاقی احکام جو ہر جگہ عام ملتے ہیں بس ان کے مجموعہ کا نام ہے اسلام۔ اس اسلام میں اور دیگر مذاہب میں کچھ فرق نہیں۔ ابوالکلام صاحب کے پیش نظر وہی اسلام کا تصور تھا اس لئے ان کا نتیجہ فکر جو کچھ بھی تھا کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور باقی مذہبوں میں فرق صرف

اتنا ہوا کہ انھوں نے اس بات کا اعلان کر دیا اور دوسروں نے اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پائی ورنہ ہر ہندو کا
یہی عقیدہ ہے خواہ وہ زبان سے اس کا اقرار کرے یا نہ کرے۔ یا یوں کہیے کہ ان کے عقیدے کا منطقی نتیجہ وہی ہے
جس کا اعلان آزاد صاحب نے کر دیا ہے۔

لیکن جب یہ سمجھ لیا جائے کہ اسلام مذہب نہیں ایک نظامِ حیات ہے تو پھر اس بنیاد پر جو وحدت متعین ہو
وہ اس اسلام سے بالکل مختلف ہوتی ہے جس کا تصور آزاد صاحب پیش کرتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ ہر نظامِ حیات ایک
خاص ذہنیت کا متقاضی ہوتا ہے جب تک وہ ذہن پیدا نہ ہو اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ ایمان اسی خاص
ذہنیت کو کہتے ہیں جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے قرآن کی رو سے تمام نوعِ انسان کے لئے ایک ہی
نظامِ حیات ہے لہٰذا تمام نوعِ انسانی کے لئے ایک ہی انداز ایمان ہے اسلام کے اس قرآنی تصور کی رو سے یہ
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نظام ہر قوم اور ہر مذہب میں ایک جیسا ہے یہ نظام قرآن کے علاوہ کہیں نصیب ہی
نہیں اس لئے تقابل کا سوال ہی سامنے نہیں آتا۔

یہ ہے وہ بنیادی غلطی جس پر ابوالکلام صاحب آزاد کی برہمو سماجی تفسیر کی پوری عمارت اٹھتی ہے۔

وراثتِ ارض کا ابدی قانون

(نوشتہ اپریل سنہ ۴۵ء)

نظامِ کائنات ایک معین قانون کے مطابق سرگرمِ عمل ہے چھوٹے سے چھوٹے ذرۂ خاک سے لیکر بڑے سے بڑے کرۂ سماوی تک ہر شے زندانیِ تقدیر ہے آفتاب جہاں تاب ایک مقررہ قاعدہ کے مطابق ہر صبح دریچۂ مشرق سے آ نکلتا ہے اور ایک متعینہ شاہراہ پر چل کر ہر شام تہِ مغرب میں روپوش ہو جاتا ہے اس کے دوران سفر میں ہر شے جس میں زندگی کی صلاحیت ہوتی ہے، اس کے نور و حرارت سے اپنے سینہ کو بھرپور کر لیتی ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ۔ چاند ایک خاص قاعدہ کے مطابق ایک خوش رنگ کشتیِ سیمیں کی طرح دریچۂ نیل سے ابھرتا ہے اور ایک خاص نظام کے تحت بڑھتا اور گھٹتا ہوا اپنے سفر کی منازل طے کئے جاتا ہے وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ۔ جب خزاں کی دست درازیاں صحنِ گلستاں سے شگفتگی و شادابی کے تمام آثار و مظاہر کو (مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے متاعِ حیات کی طرح) ختم کر دیتی ہیں تو فطرت کے ایک معینہ قاعدہ کے مطابق نسیمِ بہار مسرت اور شادابی کی ہمہ رنگیں و عطر بیز دنیا اپنے جلو میں لئے آتی ہے اور زمانہ کے حسرت زدہ و غم آلود چہرے کو پھر سے تبسم نشاں و تبختر بار بنا دیتی ہے وَكَذٰلِكَ نُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔

وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنّٰتٍ مِّن نَّخِيلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ (۳۶/۳۴) -

جس طرح یہ قوانین و ضوابط خارجی دنیا میں جاری و ساری ہیں اسی طرح انسان کی داخلی دنیا بھی [illegible]
ان کی نگرانی ہے اور جس طرح انسان کی انفرادی زندگی کی جوئے رواں انہی سواحل میں محصور ہے [illegible]
کی حیات اجتماعیہ کا یم بیکراں بھی انہی حدود و ثغور میں مقید ہے۔ انسان کی ہیئت اجتماعیہ میں سب سے اہم شعبہ
نظام حکومت اور آئینِ مملکت ہے جسے قرآن "وراثت ارض" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ حکومت کسے ملتی
ہے اور کس طرح ملتی ہے اور کس سے چھنتی ہے اور کیوں چھنتی ہے؟ اس کے لئے بھی خدا کا ایک ابدی قانون ہے
جو سورہ انبیاء کے ان بصیرت افروز الفاظ میں مرقوم ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۔ إِنَّ فِي هٰذَا
لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ (۲۱/۱۰۵-۱۰۶)

اور ہم نے تورات کے بعد زبور میں (بھی) اس حقیقت کو لکھ دیا تھا کہ زمین کی وراثت ہمارے صالح
بندوں کے لئے مقدر ہے۔ اس عظیم الشان قانونِ خداوندی میں، عبودیت اختیار کرنے والی قوم کے لئے
ایک (عظیم القدر بصیرت افروز و حقیقت کشا) پیغام ہے۔

امانت حکومت و مملکت کی تفویض اور متاعِ جہانداری و جہانبانی کی وراثت کے متعلق یہ وہ ابدی قانون اور
سرمدی اصول ہے جس کو نوشتۂ خداوندی کی حیثیت سے اعلان کیا گیا ہے اور اس میں قوموں کے عروج و زوال
اور ملتوں کے استخلاف و استبدال کے متعلق ایک ایسے بنیادی معیار کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ہر صاحب بصیرت کے لئے
پیغام عظیم اور بلاغ مبین مضمر ہے۔ یہ بنیادی اصول کیا ہے؟ یہی کہ وراثت ارض کے لئے صلاحیت شرط ہے۔ یہ دائمی
قانون جو عالم آفاق میں بھی، صلاح کے محکم اصول کی حیثیت سے جاری و ساری ہے

صلاح کے معنی

"صلاح" دیکھنے کو تو چار حروف کا ایک مختصر سا لفظ ہے لیکن اپنی جامعیت کے اعتبار سے
یہ ہمہ گیر ہے کہ اس میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر آگئے ہیں صلاح کے معنی ہیں [illegible]

جو اپنی قوت بازو سے زندہ رہنے کا حق قائم نہیں کرتا اسے کوئی زندہ رہنے نہیں دیتا

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے — ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ قانون جس کے پیچھے قوت نافذہ نہ ہو وعظ اور پند و نصیحت بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی لئے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کو اگر دین کی حیثیت سے مستحکم و متمکن رہنا مقصود ہو فولاد کی شمشیر جگردار کی بھی ضرورت ہے۔ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ (۵۷/۲۵) ہم نے ضوابطِ دین اور میزانِ عدل کے ساتھ فولاد بھی نازل کیا جس میں بڑی شدت کی جنگ ہے۔ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷/۲۵) تاکہ لوگ جادۂ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند — کائناتِ زندگی را محور اند

یہی وہ قوت ہے جس کے متعلق فرمایا کہ

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ

جس قدر قوت کے ساز و سامان اور گھوڑوں کے پرے باندھ رکھنے کی تم میں استطاعت ہو (۸/۶۰) اسے اور اپنے دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رکھو۔

قوت اور رباط الخیل کی جامعیت میں تمام سامان و آلاتِ حرب و ضرب ساز و یراقِ جنگ و جدل اور وسائل و اسباب مدافعت و محاربت شامل ہیں زمانہ کے مقتضیات اور احوال و ظروف کے تبدل و تغیر سے ان اسباب و ذرائع کی نوعیتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن قوت کی وہ روح جو زندگی کی اصل ہے ہر جگہ بدستور قائم رہتی ہے۔ گوپھن کے پتھر سے لیکر ایٹم بم کے گولے تک تمام اسباب قوت قاہرہ کی روح کے مظاہر ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں۔ یہ سب کے سب یکسر ایک ہی تلوار کی نیام ہیں زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان پیکروں کا بدلتے رہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ جس قوت کی نوعیتیں وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں وہ قوت متضمن زندگی نہیں بلکہ موت کی رہبر ہو جاتی ہے جس طرح فلک پیما طیارہ کے مقابلہ میں راجہ جی کی بہلی۔

بہرحال دنیا میں زندہ وہی رہتا ہے جس میں زندہ رہنے کی استعداد ہو آگے وہی بڑھتا ہے جس میں آگے

بڑھنے کی قوت ہو لہٰذا حکومت و مملکت اسی کی تقدیر میں ہوتی ہے جس میں جہانبانی و جہانداری کی صلاحیتیں ہوں اِنَّ فِي هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ۔

یہاں تک صلاحیت کا صرف ایک گوشہ ہمارے سامنے آیا ہے جس کا نام خالص مادی قوت (Physical power.) ہے لیکن قرآن کی رو سے فقط مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہو جاتی اس میں تو کافر و مومن کی کوئی تمیز نہیں حزب اللہ اور حزب الشیطان کی کچھ تفریق نہیں جو بھی مادی قوت حاصل کرلے وہ غلبہ و استیلاء حاصل کر سکتا ہے اور اس طرح صاحبِ حکومت و سلطنت بن سکتا ہے آج دنیا میں جدھر نگاہ ڈالئے انہی مادی قوتوں کا باہمی مقابلہ نظر آئے گا جس کے پاس قوت اور اس سے حاصل کردہ سامان ذرائع زیادہ ہیں وہی سب سے بڑی سلطنت و حکومت کا مالک ہے وہ صرف آج ہی پر کیا موقوف ہے دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے ہر صفحہ پر یہی حقیقت فولاد کے ابھرے ہوئے آتشیں الفاظ میں آپ کے سامنے آئے گی

فساد اور صلاح

لیکن جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے قرآن کی رو سے فقط مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہو جاتی اور صرف اس کے زور پر قائم کردہ غلبہ و استیلاء اور تسلط و تمکن سے اصلاح نہیں پیدا ہوتی اس نے بتایا ہے کہ اصلاح و فساد دو الگ نتائج ہیں جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں جو نظامِ سلطنت فقط مادی قوتوں کے استبداد پر قائم ہوتا ہے اس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے سورۂ شعراء میں دیکھئے اس حقیقت کو کس قدر واضح طور پر بے نقاب کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ۔

وَلَا تُطِيْعُوْا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ۔ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۲۶/۱۵۱)

حدود فراموش سرکش قوتوں کے نظام کی اطاعت مت کرو۔ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ اصلاح نہیں کرتے۔

سورۂ نمل میں اسی ضمن (قصہ حضرت صالحؑ) میں ارشاد ہے کہ۔

راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے۔ اس سوال کا محرک بھی وہی خیال ہے۔ تقدیر کا یہ مفہوم ہمارے دورِ ملوکیت کی تخلیق
ہے جسے دیگر جملہ اغراض و مقاصد، ملوکیت کے استبداد کے "شرعی جواز" کی غرض سے وضع کیا گیا۔ اور
حیلہ کاریوں سے اس طرح پھیلایا گیا کہ یہ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر امت کے قلوب کی گہرائیوں میں سرایت کر گیا اور
وہاں سے آج تک نہیں نکل سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ہر قسم کی دولت اور قوت، حکومت و سلطنت
خدا کی نعمت، اور اس کی عطا فرمودہ قرار پا چکی ہے بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ دولت و قوت کس طریق سے حاصل کی
ہے اور اسے کس مصرف میں لایا جا رہا ہے۔ ہم جس دولت مند کا ذکر کرتے ہیں بلا تامل کہہ دیتے ہیں کہ اس پر خدا کا
بڑا فضل ہے۔ ہر صاحبِ شوکت و سطوت کے متعلق یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اللہ کی دین ہے۔ اس غیر محسوس عقیدہ کی رو سے
ہمارے نزدیک "دولت" خدا کی نعمت ہے خواہ وہ کسی نے ڈاکہ ڈال کر حاصل کی ہو یا اپنی محنت سے کمائی ہو۔ اور
ان قدیمی تصورات کی رو سے حکومت "اللہ کا انعام" ہے خواہ وہ ابلیسی تخلیب اور طاغوتی سیاست کی بنیادوں
پر قائم رکھا ہو یا ایمان و عملِ صالح کی بنا پر۔ غور کیجئے ہماری زبان میں اللہ کی دین کے مقابلہ میں کسی دوسری دین
کے لئے کوئی اصطلاح ہی موجود نہیں اس لئے کہ ہمارے نزدیک ڈاکو کو بھی خدا دیتا ہے اور ایک مردِ کاسب کو بھی۔
لہٰذا طاغوتی قوتوں کی حکومت بھی خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور اس لئے اس کے قانونِ وراثت
کے مطابق اور اس بنا پر صالحین کے معنی ہو جاتے ہیں ہر وہ گروہ جو حکومت قائم کرنے کی قوت پیدا کرے۔ لیکن سوچئے
کہ اگر فرعون کی حکومت بھی قانونِ خداوندی کی رو سے ملی تھی تو حضرت موسیٰ کو اس کے خلاف اتنی بڑی مہم کے لئے
کیوں مامور کیا گیا؟ اگر باطل کا دولتی نظام بھی اسی ابدی قانونِ وراثت کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس کی جڑیں
قائم کرنے کے لئے اس قدر سرفروشیوں اور جاں سپاریوں کی تاکید کیوں کی جاتی ہے۔ حق و باطل کی یہ کشمکش
ہر لمحہ تو اسی بنا پر ہے کہ باطل منجانب اللہ نہیں ہوتا۔ اگر "قانونِ وراثتِ ارض" صرف حصولِ قوت ہی کا دوسرا
نام ہے تو اس کے لئے عرشِ عظیم سے آنے والے پیغامات کی کیا ضرورت ہے۔ اسے تو دنیا کا ہر ہلاکو اور چنگیز خوب
جانتا ہے۔ اگر نیٹشے کا مافوق البشر قرآن کا مردِ مومن ہے تو پھر حکمتِ فرعونی اور حکمتِ کلیمی میں کیا فرق ہے۔

ظاہر ہے کہ خالص قوت کی بنا پر جو نظامِ حکومت قائم کر لیا جاتا ہے اسے خدا کے متعین فرمودہ قانونِ وراثت کا نتیجہ اور فلہذا من جانب اللہ نہیں کہا جا سکتا۔ من جانب اللہ استخلاف فی الارض وہی ہوتا ہے جو اس کے قانونِ سرمدی کا نتیجہ اور قرآنی صالحیت کا ثمرہ ہو اور یہی وہ استخلاف ہے جو ہمارے موضوع کا عنوان ہے۔

قوم کی مختلف حالتیں

صالحیت کا قرآنی مفہوم متعین کرنے کے بعد اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ وراثتِ ارض یعنی قوانینِ الٰہیہ کے مطابق حکومت قائم کرنے سے پہلے عام طور پر قوم کی حالت یہ ہوگی کہ (۱) یا تو اس پر کسی دوسرے کی حکومت نہیں ہوگی یعنی ان کی اپنی حکومت ہوگی لیکن کسی آئین کے مطابق جس کی رو سے عام انسانی حکومتیں قائم ہوتی ہیں یا (۲) سرے سے کسی دولتی نظام کا وجود ہی نہ ہوگا اور قوم قبائلی قسم کی زندگی بسر کر رہی ہوگی یا (۳) وہ قوم کسی غیر حکومت کی محکوم ہوگی۔ اول الذکر صورتوں میں (یعنی جب حکومت اپنی ہو یا سرے سے کسی منتظم حکومت کا وجود ہی نہ ہو) اس قوم کو اس کی امکانی قدرت حاصل ہوگی کہ وہ چاہے تو اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے آئینِ خداوندی کے مطابق وراثتِ ارض کی دولت سے متمتع ہو جائے۔ اس صورت میں مقابلہ ان لوگوں سے ہوگا جو اس انداز کی حکومت کے قیام میں اپنی ذاتی اغراض کا نقصان و زیاں سمجھتے ہوں اور اس لئے اس تحریک کی مخالفت میں سرگرمِ عمل ہو جائیں۔ ایسی صورت میں وہ قوم یا تو فریقِ مخالف پر غلبہ حاصل کر لے گی اور اگر اس کا فوری امکان نہ ہوگا تو کسی اور خطۂ ارض کی طرف ہجرت کر کے اسے اس آئینِ حکومت کی قرارگاہ بنا لے گی۔ یہ وراثتِ ارض فطری نتیجہ ہوگی ان کی صالحیت کا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے وقت قوم غالب کی یہی حالت تھی۔ عرب کسی غیر حکومت کے تابع نہیں تھے۔ قبائلی زندگی بسر کرتے اور اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے تھے۔ انہیں اس امکان کی قدرت حاصل تھی کہ وہ چاہتے تو اپنے اندر خوبیاں پیدا کر کے وراثتِ ارضی کے مستحق بن جاتے۔ نبی اکرم کی بصیرت افروز تعلیم اور حقیقت کشا عمل سے اس قوم نے وہ تربیت حاصل کر لی جس سے ان کے خفتہ جوہر بیدار ہو گئے اور وہ قوم ایسی بن کر استخلاف فی الارض کے مقامِ محمود تک پہنچ گئی۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ذٰلک الفوز العظیم۔

احسان کریں اور انہیں (تمام قوموں کی قیادت کرنے والے) بنائیں اور انہیں (حکومت و مملکت کا)
وارث بنائیں اور (اس طرح) انہیں زمین میں متمکن کر دیں۔

لہٰذا انہیں فرعون کی غلامی سے نجات بطور انعام دلا دی گئی اور انہیں ایمن کی وادیوں میں پہنچا دیا گیا جہاں ان پر کسی غیر کی حکومت نہ تھی۔ اور اس طرح ان کے لئے امکانی قدرت پیدا کر دی گئی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو تربیت دے کر وراثتِ ارض کے مستحق بن جائیں۔

پاکستان کے مسلمان

ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان بالکل اسی طرح ملا ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وراثتِ ارض یا استخلاف ہے وہ حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وراثتِ ارض بلا مزد و معاوضہ نہیں ملا کرتی وہ فطری نتیجہ ہوتی ہے قوم کی صلاحیتوں کا۔ البتہ اوراحسانًا صرف غیروں کی غلامی سے رستگاری عطا ہوتی ہے تاکہ اس سے صلاحیت پیدا کرنے کی امکانی قدرت نصیب ہو جائے۔ ہمارا اس وقت صرف ایک خطہ زمین ملا ہے جس پر کسی کی حکومت نہیں۔ اب ہم چاہیں تو

(۱) اپنے اندر صلاحیت پیدا کر کے اس زمین پر خدا کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھا دیں۔

(۲) صرف مادی قوتوں کے زور سے غلبہ و استیلا پیدا کر کے اس قسم کی سلطنت متشکل کر لیں جس قسم کی سلطنتیں دوسری قوموں نے قائم کر رکھی ہیں اور یا

(۳) موجودہ جمود و تعطل اور بے عملی و بے حسی کی زندگی سے اس امکانی قدرت کو بھی کھو بیٹھیں اور پھر کسی اور کی غلامی سے بدستور سابق جہنم کی سی زندگی میں گرفتار ہو جائیں۔

ہم نے کہا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہی ہے جیسی اس وقت بنی اسرائیل کی تھی۔ آئیے دیکھیں کہ اس حالت میں بنی اسرائیل نے کیا کیا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ ﴿ وفیھا البصآئر لقوم یعقلون ﴾۔

بنی اسرائیل کو اللہ کی اس موہبت عظمیٰ پر قدم قدم پر تشکر و امتنان کے سجدے کرنے چاہئیں تھے۔ بجائے

کچھ چھوٹا انعام اور یہ احسان کچھ کم احسان نہ تھا۔ فرعون جیسے مجسمۂ استبداد و نخوت کے دست برد سے رستگاری کوئی معمولی بات نہ تھی لیکن صدیوں کی غلامی سے بنی اسرائیل کے جوہر انسانیت قریب قریب مردہ ہو چکے تھے نہ ان کے سینہ میں زندہ آرزوؤں کی مقدس قندیل تھی نہ ان کی نگاہوں میں بلند مقاصد کی تب و تاب۔ درحقیقت دنیا میں غلامی ہزاروں لعنتوں کی ایک لعنت اور لاکھ نحوستوں کی ایک نحوست ہے غلامی میں وہ تمام عیوب و

قوم بنی اسرائیل کی حالت

نقائص جنہیں جسد انسانیت کے لئے جذام کہنا چاہئے اس قدر پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے تباہ کن اثرات کب اور کن راہوں سے خون کے اندر حلول کر گئے۔ غلامی میں انسان زندگی کے حقائق کے مقابلہ سے جی چراتا ہے اور قفس کے خوگر پرندے کی طرح اس عافیت کوشی کی زندگی کو عین حیات سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

صدیوں کی غلامی سے ان میں عزم و استقلال کے جوہر بہت کم رہ گئے تھے محکومی سے تن آسانی و سہل انگاری کی افسردگی ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اور وہ اس نہج زندگی کے اس درجہ عادی ہو چکے تھے کہ ان پر

قفس ہوا تھا حلال اور آشیانہ حرام

نتیجہ اس کا یہ کہ وہ ہر انقلاب آفریں تدبیر میں مصائب و مشکلات کے طوفان پوشیدہ دیکھتے تھے تبدیلی حالات کے تصور سے ان کا دل بیٹھنے لگتا تھا حضرت موسیٰ انہیں بار بار تاکید کرتے کہ ذرا ہمت اور استقلال سے کام لو اور دیکھو کہ اللہ کی تائید و نصرت کس طرح تمہارے منتظر ہوتی ہے۔ راستہ کی مشکلات کو استقامت سے برداشت کرو تو انجام کار میدان تمہارے ہی ہاتھ رہے گا ذرا اپنے اندر صالحیت پیدا کر لو۔ وراثت ارض تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ واصبروا۔ ان الارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین (۱۲۸)۔

تب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تم یقینِ خداوندی سے فتح و نصرت کی مدد مانگو اور اس (دین) پر جمے رہو بلاشبہ زمین (کی بادشاہت) صرف خدا کے لئے ہے جسے وہ اپنے بندوں میں سے بخش دیتا ہے جو اس کے قانون کے مطابق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ بندے جنہیں آخر الامر حکومت حاصل ہوتی ہے وہ ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو اس کے قانون سے ہم آہنگ کریں۔

لیکن اس تذکیر و تنذیر سے ان پیکرانِ آب و گِل کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑنا آسان نہ تھا حضرت موسیٰ انہیں عزم و استقلال کے لئے ابھارتے اور وہ الٹے شکوہ سنج ہوتے کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبتوں میں تھے اور اب تمہارے آنے کے بعد ان میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اب آرام سے گزرے گی لیکن تم تو نئے دن ایک نیا مرحلہ سامنے لے آتے ہو تم اچھے چارہ ساز بن کر آئے۔

قالوا اوذينا من قبل ان تأتينا ومن بعد ما جئتنا قال عسى ربكم ان يهلك عدوكم ويستخلفكم فينظر كيف تعملون ° (۷/۱۲۹)

انھوں نے کہا کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم پر مصیبتیں پڑ رہی تھیں اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں موسیٰ نے کہا کہ قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے (و تمہیں استخلاف فی الارض عطا کر دے) پھر دیکھے کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

لیکن جن لوگوں کی ہڈیوں کے گودے کے اندر تک محکومیت کے جراثیم گھر کر چکے ہوں جو خوئے غلامی میں پختہ ہو چکے ہوں ان پر بھلا ان حیات آفریں خطبات و زندگی بخش پیغامات کا کیا اثر ہو جب حضرت موسیٰ انہیں مصر سے نکال کر لے چلے ہیں تو وہ اس طرح بوجھل جا رہے تھے جیسے انہیں بیگار میں پکڑے جا رہے ہوں جب وہ سمندر کے کنارے پہنچے اور پیچھے سے فرعون کا لشکر قریب میں آیا تو انہوں نے چلانا شروع کر دیا کہ ہمیں موت کے منہ میں دھکیل کر لے آئے ہو۔

فلما تراء الجمعن قال اصحب موسى انا لمدركون ۔ (۲۶/۶۱)

جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم یقیناً دھر لئے گئے۔

تورات میں ہے:۔

> اور جب فرعون نزدیک آیا تو بنی اسرائیل نے آنکھیں اٹھائیں اور مصریوں کو پیچھے آتے دیکھا اور نہایت شدت سے ڈرے تب بنی اسرائیل نے خداوند کریم سے فریاد کی اور موسیٰ سے کہا کہ کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لایا ہے تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے باز رہ تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کیونکہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا۔ (خروج ۱۴: ۱۰-۱۲)

غلامی کے اثرات

غور کیجئے! غلاموں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح جھلک کر باہر آرہی ہے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ مصریوں کی خدمت گزاری اس سے کہیں بہتر تھی اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ قفس کو آشیانہ سے بہتر سمجھئے کہ آشیانہ میں کہیں خوفِ برق ہے کہیں خطرۂ صرصر، کبھی فکرِ معاش ہے تو کبھی غمِ سود و زیاں قفس کی زندگی میں یہ تمام تفکرات و خدشات آقا کے ذمہ تھے اللہ اکبر! محکومی کی ساحری بھی کس درجہ کامیاب ہوتی ہے جو انسان کی کیفیت بدل دیتی ہے وہ بصیرت صحیح جو انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ

حیات جاوداں اندر ستیز است

اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ خطرہ نہیں بلکہ خطرہ کا تصور بھی اسے مرگِ ناگہانی بن کر دکھائی دیتا ہے محکومیت کی افیون سے اس کے قوائے عملیہ اس درجہ مخدر ہو جاتے ہیں کہ جد و جہد اور سعی و کاوش کی زندگی اس کے لئے مصیبت بن جاتی ہے عافیت کوشی اور سہل انگاری سے کہ جس کے لئے حاکم قوم کی طرف سے خاص طور پر اسباب و ذرائع مہیا کئے جاتے ہیں ان کی قوتِ برداشت بالکل سلب ہو جاتی ہے اور وہ بات بات پر جھلا اٹھتے ہیں محکومیت کا وہ سنہرا، میٹھا، خواب آور، اور چپکے چپکے غیر محسوس طور پر موت کی طرف لے جانے والا زہر تھا جو بنی اسرائیل کے خون کے ہر قطرہ میں سرایت کر چکا تھا اور انہیں ذرا سی تکلیف پر اس کا دلی افسوس ہوتا تھا کہ ہم مصر کی حکومت سے کیوں آزاد ہو گئے چنانچہ تورات میں دوسری جگہ ہے:۔

> پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت زمین مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کی پندرھویں دن سین کے بیابان میں جو ایلیم اور سیناء کے درمیان ہے پہنچی۔ اور ساری جماعت بنی اسرائیل کی اس بیابان میں موسیٰ اور ہارون پر بڑبڑانے لگی۔ اور بنی اسرائیل کہنے لگے کاش۔ ہم خدا کے ہاتھ سے زمین مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھے تھے اور روٹی من بھر کے کھاتے تھے مارے جاتے کیونکہ تم ہم کو اس بیابان میں نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو۔ (خروج ۱۶/۱-۳)

آپ نے دیکھا کہ انہیں کس چیز کی یاد ستا رہی تھی۔ "گوشت کی ہانڈیوں کی"۔ یعنی جیل خانے کی روٹیوں کی یاد! یا للعجب! احساسِ محکومی کس قدر تقلیبِ ماہیت پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے دیدۂ شاہین میں نگہ خفاش رکھ دی جاتی ہے جو جہنم کے شجرۃ الزقوم کو ثمرِ بہشت بنا کر دکھا دیتی ہے۔ یہی کیفیت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی۔ ایک میدان میں پہنچے جہاں ذرا پانی کی قلت تھی تو پھر وہی واویلا مچانا شروع کر دیا کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے ہو۔

> تب بنی اسرائیل کی جماعت نے رفیدیم میں ڈیرا ڈالا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا۔ سو وہ موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ ہم پئیں۔ موسیٰ نے ان سے کہا کہ تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو اور خداوند کو کیوں امتحان کرتے ہو۔ اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے سو وہ موسیٰ پر بڑبڑانے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں کو اور ہمارے مویشی کو پیاس سے ہلاک کرے۔　　　(خروج ۱۷/۲-۳)

غرضیکہ وہ قدم قدم پر رکتے جاتے تھے اور ہر بار یہی طعنہ دیتے تھے کہ ہمیں مصر سے کیوں نکالا! قرآن کریم نے اس قوم کی داستانِ زندگی کو اس لئے اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے اور مختلف مقامات پر سے بار بار سامنے لاتا ہے کہ اس کے اندر ہر دیدۂ بینا کے لئے عبرت و موعظت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ آزادی کی وہ موہبت و نعمت جو انہیں بڑی محنت و مشقت سے مل گئی تھی ان کے لئے وبالِ جان اور باعثِ بے درمانی بن رہی تھی۔

بخود کے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے　　　ہزاروں سال منزل در مقامِ آزری کردہ

انہیں مصر کی لعنتی زندگی سے نکال کر سیناء کے میدانوں میں اس لئے لایا گیا کہ وہ اپنے جوہرِ خودی کی تربیت کریں۔

اور اس طرح اپنے اندر ایسی فولادی سیرت پیدا کر لیں جس سے مصائبِ زندگی میں ہر مشکل کا مقابلہ ہو سکے۔ [illegible]
پیکرِ خاکی کے ذراتِ کہن کو ترکیبِ نو دے کر اس سے ایک جہانِ دیگر کی تعمیر کر لیں جو وراثتِ ارض کی [illegible]
لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ قدم قدم پر موسیٰ کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے اور عجیب و غریب مطالبات پیش کرتے۔ سینا
کی وادیوں سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کسی بت کی پوجا کر رہے تھے۔ حضرت موسیٰ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے
کہ ہمیں بھی ایسا ہی بت بنا دیجئے: قالوا یٰموسی اجعل لنا الٰہا کما لہم اٰلہۃ (۱۳۸)۔ حتیٰ کہ جب حضرت موسیٰ
روزہ کے لئے طور کی چوٹیوں پر تشریف لے گئے تو انہوں نے گئو سالہ سامری کی پرستش شروع کر دی۔ جب ان سے [illegible]
کہ تورات کے احکام کی پابندی کرو کہ یہ احکام تمہارے خدا نے دیئے ہیں تو اکڑ کر بیٹھ گئے کہ [illegible]
ہم کبھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم خدا کو کھلے طور پر نہ دیکھ لیں۔ وادیٔ سینا کے صحرا کی [illegible]
فطرت پر کھانے کو ملتی تھی لیکن انہیں رہ رہ کر شہر کی چٹپٹی زندگی کی یاد ستاتی تھی۔ چند روز کے بعد مطالبہ کر دیا
لن نصبر علیٰ طعام واحد (۶۱) ہم سے ہر روز ایک ہی چیز نہیں کھائی جائے گی۔

جب محکوم قوم کے قوائے عملیہ مفلوج اور ان کے جوہر مردانگی مسلوب ہو جاتے ہیں تو ان کے پاس فقط باتیں ہی
باتیں رہ جاتی ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں عمل کے بجائے شاعری شروع کر دیتی ہے۔ بات بات پر [illegible]
قدم قدم پر فلسفیانہ نکتہ آرائیاں۔ زندہ قوموں کا شیوۂ زندگی ہوتا ہے سمعنا و اطعنا، سنا اور [illegible]
وہ کام زیادہ کرتے اور باتیں بہت کم۔ لیکن محکوم قوم باتیں ہی باتیں کرتی ہے، کام بالکل نہیں کرتی۔ یہی حالت
بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ ایک گائے ذبح کرو، کس قدر صاف اور سیدھی بات تھی۔ [illegible]
دیکھئے انہوں نے اس پر بھی کتنی باتیں بنائی ہیں۔ وہ کس طرح بال کی کھال نکالنا شروع کر دیتے ہیں [illegible]

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے حضرت موسیٰ کا خروج بنی اسرائیل کے لئے مقصود بالذات نہ تھا۔ فرعون کی محکومیت سے
رستگاری اس مقصد کے لئے ہوئی تھی کہ یہ قوم صحرائے سینا کی تربیت گاہ میں اپنے اندر صلاحیت پیدا کرے [illegible]

ارضِ مقدس (فلسطین) کی وراثت ان کے حصہ میں آ جائے۔ حضرت موسیٰ انہیں سرزمینِ فلسطین کے قریب تک لے گئے اور ان سے کہا کہ یہ ہے وہ زمین جو تمہارے خدا نے تمہارے نام لکھ دی ہے۔ چلو اور اس پر قبضہ کرو۔

یٰقوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا علیٰ ادبارکم فتنقلبوا خاسرین۔ (۵/۲۱)

لوگو! اس مقدس سرزمین میں جسے خدا نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے (یعنی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے) عزم و ہمت کے ساتھ داخل ہو جاؤ اور اپنے پاؤں پیچھے کی طرف نہ ہٹاؤ (کہ کامیاب ہونے کے بجائے) نقصان اور تباہی میں پڑ جاؤ گے۔

لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ ضعفِ خودی سے ان پر خوف طاری تھا۔ سپاہیانہ عزم کے تصور سے ان پر رعشہ چھا جاتا تھا۔ فریقِ مقابل کے آدمی انہیں دیو نظر آتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا:

قالوا یٰموسیٰ ان فیہا قوما جبارین۔ وانا لن ندخلہا حتیٰ یخرجوا منہا۔ فان یخرجوا منہا فانا داخلون۔ (۵/۲۲)

لوگوں نے کہا کہ اے موسیٰ! اس سرزمین میں بڑے لوگ بستے ہیں جو بہت ہی زبردست ہیں۔ ہم میں ان کے مقابلہ کی تاب نہیں۔ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر وہ وہاں سے از خود نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔

ذرا غور کیجئے اس منطق پر کہ فریقِ مقابل از خود وہاں سے نکل جائے تو پھر ہم آگے بڑھیں گے۔ حضرت موسیٰ نے بہتیرا سمجھایا لیکن ان پر اس پند و موعظت کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

قالوا یٰموسیٰ انا لن ندخلہا ابدا ما داموا فیہا فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون۔ (۵/۲۴)

وہ بولے اے موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں (اور اگر تم

وہاں جانے پر ایسے ہی مصر ہو تو تم خود چلے جاؤ اور تمہارا اللہ بھی تمہارے ساتھ چلا جائے تم دونوں
وہاں ان کے ساتھ لڑنا جب فتح ہو جائے ہمیں آواز دے دینا، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

لیجئے جواب مل گیا کہ ہماری بہبودی کی ایسی ہی تڑپ ہے تو جائیے ان لوگوں سے لڑیئے اور اپنے ساتھ اپنے اس خدا کو بھی لے جائیے جس نے فتح و کامرانی کا وعدہ دے رکھا ہے۔ ہم یہاں انتظار کرتے ہیں جب دشمن مغلوب ہو جائے تو ہمیں آواز دے لینا ہم پہنچ جائیں گے اللہ اکبر! کیا ذہنیت ہے غلام کی!!

اس کا نتیجہ کیا ہوا کیا وہ لوگ بلا محنت و مشقت وراثتِ ارض کے مستحق ہو گئے ہیں کیا انہیں وہ سرزمین یونہی اتفاقاً مل گئی! بالکل نہیں۔

قال فانها محرمة عليهم اربعين سنة۔ يتيهون في الارض فلا تاس على القوم الفسقين (۵/۲۶)

اللہ کا حکم ہوا کہ اب ان لوگوں کی حالت یہ ہے تو اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے سو اے موسیٰ تم ان نافرمان لوگوں کے اس قول پر غمگین مت ہو (وہ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرنا چاہتے تھے اس لئے وہ اس محرومی کے مستحق ہیں)

چنانچہ حضرت موسیٰ آب و گل کے ان پیکروں کو چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھراتے رہے تا آنکہ اس پیغمبر خوردہ جماعت کا کوئی فرد باقی نہ رہا اور جب ان کی نئی نسل جن کی تربیت مصر کی محکومی کی فضا سے الگ کر کے کی گئی تھی بڑھ کر جوان ہوئی اور وہ اپنے اندر اس صلاحیت کو پیدا کر لے جو وراثتِ ارض کے لئے شرط ہے تو پھر ان کے ہاتھوں خدا کا نوشتہ پورا ہو چنانچہ ایسا ہی ہوا جب اس نئی پود نے اپنے اندر صلاحیت پیدا کر لی تو وہ ایک ہی جست میں تمام منازل طے کر گئے اور استخلاف فی الارض کی مسند پر متمکن ہو گئے کہ یہی وعدۂ ربی تھا

واورثنا القوم الذين كانوا يستضعفون مشارق الارض ومغاربها التي بركنا فيها۔ وتمت كلمت ربك الحسنى على بني اسرائيل۔ بما صبروا (۷/۱۳۷)

اور جس قوم کو حقیر و کمزور خیال کیا جاتا تھا اسی کو ملک کے مشرقی و مغربی حصوں کی وراثت بخشی

لہ رب کے معنی بڑے بھائی کے بھی ہیں۔

ہوئی برکت سے مالا مال ہے وارث کر دیا اور اس طرح تیرے اللہ کی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری
ہوئی اس لئے کہ وہ ہمت اور استقامت سے جمے رہے تھے۔

یہ وراثت صالحیت کا فطری نتیجہ تھی اور صالحیت، جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے ایمانِ محکم اور عملِ پیہم سے پیدا ہوتی ہے اسی کو قرآن نے ایقان و صبر کی جامع اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے۔

وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا۔ وكانوا بآيتنا يوقنون (۳۲/۲۴)
اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی قیادت کرتے تھے اور یہ اس لئے
تھا کہ انہوں نے ثبات و استقامت کا ثبوت دیا اور وہ ہماری آیات پر محکم یقین رکھتے تھے۔

بچشمِ تعمق نگر یہ ہیں داستانِ بنی اسرائیل کے وہ اجزاء جو ہمارے موضوعِ زیرِ نظر سے براہِ راست متعلق ہیں۔ اس میں استخلاف فی الارض (وراثتِ زمین) کے سلسلے کی دو متمیز چیزیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ جسے ابتدائی حصہ کہنا چاہیئے جس میں غیروں کی محکومیت سے اس لئے رستگاری ملتی ہے کہ اس قوم کو اپنی صلاحیتوں کے نمود و ارتقا کے لئے امکانی مواقع مل جائیں اور دوسرا حصہ وہ ہے جس میں صالحیت کی پختگی کے بعد وہ قوم وراثتِ ارض کی مستحق قرار پا جائے۔ حصولِ صالحیت کا ابتدائی مرحلہ ہو یا تخلف و وراثت کا ثانوی حصہ دونوں میں مواقع اس لئے بہم پہنچائے جاتے ہیں تا یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ قوم اس قدرت و اختیار سے کس طرح فائدہ اٹھاتی ہے۔ پہلے مرحلہ میں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ قوم اپنے اندر حکومت کی صلاحیت پیدا کرتی ہے یا نہیں، اور دوسرے میں یہ کہ قوت و اختیار ملنے کے بعد وہ قوم اس کا استعمال صحیح طور پر کرتی ہے یا نہیں۔ حضرتِ موسیٰ نے اپنی قوم سے جبکہ وہ ابھی فرعون کے زیرِ حکومت تھی کہا ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون (۷/۱۲۹)۔ قریب ہے کہ اللہ تمہیں تخلف فی الارض عطا کر دے پھر دیکھے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو" اور
قومِ محمد رسول اللہ سے کہا گیا کہ۔

سلہ داستانِ بنی اسرائیل اپنے اندر عبرت و موعظت کا [illegible] جو ایک ہی نگاہ
سے دیکھی گئی [illegible] اس داستان کی تفاصیل حضرت معارف القرآن جلد سوم میں ملیں گی۔

ولقد اھلکنا القرون من قبلکم لما ظلموا وجاءتھم رسلھم بالبینٰت وما کانوا لیؤمنوا۔ کذٰلک نجزی القوم المجرمین۔ ثم جعلنٰکم خلٰئف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون (۱۰/۱۳-۱۴)

اور یقیناً (ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل نے) تم سے پہلے کئی نسلوں کو ہلاک کر دیا جب ان کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ (جادۂ عدل و انصاف سے ہٹ کر) ظلم کرنے لگ گئے (حالانکہ) ان کے رسول ان کے پاس واضح حقائق لیکر بھی آئے لیکن بایں ہمہ ایسا نہ ہو کہ وہ ایمان لے آتے اس طرح ہم مجرم قوم کو سزا دیا کرتے ہیں پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین کی حکومت عطا کی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح کا عمل کرتے ہو لہذا امکانی مواقع یا قوتِ اختیار کے خزانے اس لئے ملتے ہیں لننظر کیف تعملون تاکہ دیکھا جائے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

ہماری حالت ان اصول و مبادیات کو سمجھ لینے کے بعد اب اپنی موجودہ حالت کی طرف آئیے اور اسی آئینے میں اسے بھی دیکھئے۔

یہ ایک حقیقت ہے پاکستان کی سرزمین ہمیں بغیر صلاحیت کے مل گئی ہے یہ ہماری سعی و عمل اور ذہنی کا نتیجہ نہیں ہمارے اندر تلخاً وہ داخلی تبدیلیاں پیدا نہیں ہوئیں جن کا مظہر خارجی تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں یہ عوام اور کیا خواص ہم سب اسی سطح پر کھڑے ہیں جہاں اس سے پہلے تھے صلاحیت تو بڑی چیز ہے ہم میں تو وہ صلاحیت و استعداد بھی پیدا نہیں ہوئی جو محض مادی قوتوں کی بنا پر حصول مملکت و سلطنت کے لئے زندہ رہنے کی متمنی قوموں میں پیدا ہوا کرتی ہے ان قوموں کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے جنہوں نے اپنے اغراض و منافع دنیاوی مقاصد و مطامع کی خاطر دوسروں کے نظامِ سلطنت سے رستگاری حاصل کرنے یا اپنے تصورات کے مطابق اپنی حکومت بچھانے کے لئے جدوجہد کی اور پھر دیکھئے کہ اس باب میں انہیں کیا کیا مصائب برداشت کرنے پڑے اور

انھوں نے ان سب شدائد و نوائب کا کس پامردی و استقامت، حوصلہ اور ہمت، عزم و استقلال کے ساتھ اور اپنے
مقصد کے حصول کی خاطر کس طرح مستانہ وار اور شدائد سے ہر مخالف قوت کو بے جھجک چیرتے ہوئے آگے بڑھتے
چلے گئے ابھی کل کی جنگ عظیم کو دیکھئے جس میں حفاظت وطن اور قومی آزادی کی حفاظت کے لئے مختلف اقوام
مغرب نے کس کس ایثار و قربانی سے نامساعد حالات کا مقابلہ کیا ان سب حقائق کو سامنے رکھیے اور
بازگشتی نگر — یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ہم میں فی الواقع عام قومی خصائص بھی پیدا نہیں ہوئے
چہ جائیکہ ہمارے اندر صفات الٰہیہ منعکس ہوں اور ہم صبغۃ اللہ کے مشہود پیکر دکھائی دیں۔

بادیہ نوردی کی خود چہ می جوئی

گذشتہ تجربہ و انتشار (یعنی تقسیم ہند کے قیامت خیز حوادث) میں ہم نے ایک طرف جس عدم تدبر اور افلاس
نظر اور دوسری طرف جس فقدان ضبط و استقامت اور حرمان عزم و ثبات کا مظاہرہ کیا ہے نہیں! اس سے
بھی آگے بڑھئے ہم نے ایک طرف جن کشتی و خونریزیوں اور مردار خوریوں جن یوسف فروشیوں اور یعقوب
فریبیوں، اور دوسری طرف جن افراتفریوں اور نفس نفسیوں جن عہد شکنیوں اور آئین فراموشیوں کا ثبوت
دیا ہے وہ اس حقیقت کی زندہ شہادتیں ہیں کہ ہم اس وقت زندہ قوموں کے زمرہ میں شمار ہونے کے قابل اور
حکومت و مملکت کے متحمل ہونے کے بالکل مستحق اور اہل نہیں ہیں، لہٰذا غیروں کی حکومت سے نجات اور اس خطۂ
زمین کی موہبت محض خدا کا احسان ہوئی ہے جس طرح بنی اسرائیل کی فرعون کی غلامی سے رہائی اور سینا
کی وادیوں میں پرچم کشائی محض عطائے خداوندی ہوگئی تھی اس کے لئے خدا کی طرف سے کیا سبب و ذرائع پیدا کئے
گئے اور احوال و ظروف کس طرح ایک خاص منہج و ترتیب پر متشکل ہوتے چلے گئے یہ ایک الگ بحث ہے حقیقت
یہی ہے کہ جو اس وقت ہمارے سامنے ہے کہ یہ نتائج جو اس طرح مرتب ہوئے ہیں ہماری استعداد و اہلیت کا ماحصل
اور ہماری سعی و کاوش کا ثمرہ نہیں ہیں یہ ہمیں بطور امداد و اعانت اور بلا محنت و مشقت خدا کی طرف سے احساناً ملے
ہیں اور ملے اس لئے ہیں لننظر کیف تعملون۔ (تاکہ دیکھا جائے کہ ہم کیسے کام کرتے ہیں) غیروں کی حکومت

میں ہمیں وہ مواقع حاصل نہیں ہو سکتے تھے جو اس صالحیت کو پیدا کر سکیں جو وراثت ارض کے لئے بنیادی شرط ہے یہ خطۂ زمین اپنی مواقع (Cpportunity) کو بہم پہنچانے کے باعث تعلیم کے میدان میں لئے دیا گیا ہے کہ لننظر کیف تعملون (تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ ہم کیسے کام کرتے ہیں)۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے صالحیت مشروط ہوتی ہے ایمان اور عمل صالح پر۔ چنانچہ سورۂ عنکبوت میں ہے :-

والذین آمنوا وعملوا الصالحات لندخلنهم فی الصالحین (۲۹/۹)

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور (اس کے ساتھ) صالح العمل ہوتے ہیں تو ہم ان کو یقیناً صالحین کے زمرہ میں شامل کریں گے۔

ایمان کے معنی ہیں زندگی کا متعین نصب العین، منتہائے نگاہ، مطمح نظر، منزل مقصود، اور اس نصب العین کے برسر حق ہونے پر یقین محکم اور اعمال صالح کے معنی ہیں ایسا عملی پروگرام جو اس نصب العین کے حصول کے لئے ضروری صلاحیتیں پیدا کر دے اور جس سے معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہوتی چلی جائیں۔

اس حقیقت کو قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ ایک برسر حق نصب العین کے حصول کی راہ پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کی روش ہے اس میں بڑی بڑی تکالیف کا مقابلہ اور شدید مصائب کا سامنا ہوگا مومن وہ ہے جو ان مصائب کو مردانہ وار برداشت کرے جو اس راہ میں تکالیف سے جی چرائے وہ مومن نہیں قرآن کی رو سے منافق ہے چنانچہ آیۂ مندرجہ صدر کے ساتھ ہی فرمایا:-

ومن الناس من یقول آمنا باللہ فاذا اوذی فی اللہ جعل فتنة الناس کعذاب اللہ ط ولئن جاء نصر من ربک لیقولن انا کنا معکم ط اولیس اللہ باعلم بما فی صدور العالمین ۔ ولیعلمن اللہ الذین آمنوا ولیعلمن المنافقین (۲۹/۱۰-۱۱)

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں لیکن حالت یہ ہوتی ہے کہ جب اللہ (کی راہ) میں دکھ اٹھانا پڑتا ہے تو لوگوں کی طرف سے آنے والی مصیبتوں کو اللہ کا عذاب سمجھ لیتے ہیں لیکن اگر تیرے اللہ کی طرف سے نصرت آئے تو اس (فتح و کامرانی کے وقت) پکار اٹھتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں کیا اللہ نہیں جانتا جو اہل جہاں کے سینوں میں ہے (ضرور جانتا ہے) اور اللہ یقیناً مومنین کو بھی دیکھ لے گا اور منافقین کو بھی۔

لہٰذا صالحیت کے لئے پہلی شرط جسمانی قربانی ہے اور دوسری شرط مالی ایثار جس کے متعلق فرمایا۔

وانفقوا من ما رزقنٰکم من قبل ان یاتی احدکم الموت فیقول رب لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق واکن من الصّٰلحین (۶۳/۱۰)۔

اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس کے نظام کے قیام کے لئے کھلا رکھو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو اور وہ اس وقت کہے کہ یا اللہ! تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی کہ میں مال خرچ کرتا اور اس طرح صالحین میں سے ہو جاتا۔

ظاہر ہے کہ یہ اذیتیں اور مشقتیں مخالفین کے مقابلہ سے پیدا ہوں گی یہ مخالفت دو اطراف سے ہوگی ایک تو خارجی دشمنوں کی طرف سے جو اس امکانی قدرت کو بھی گوارا نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس خطۂ زمین پر خدا کے قانون کے مطابق حکومت متمکن ہو گئی تو ان کا باطل آگیں نظام سب کا سب درہم برہم ہو جائے گا باطل اپنی بنیادی کمزوریوں سے خوب واقف ہوتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ نظام حق و صداقت کے قیام کی مخالفت میں پوری سعی و کاوش سے کام لیتا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!

مخالفت

لہٰذا پاکستان کے مسلمانوں کو سب سے پہلے ان خارجی اعدا کی مکارانہ سازشوں اور معاندانہ ریشہ دوانیوں کے مقابلہ کے لئے ہر وقت مستعد رہنا ہوگا اس لئے کہ اگر ان کی کمزوری یا بے پرواہی سے

خدا نہ کردہ ان کے مشئوم عزائم بروئے کار آگئے تو یہ امکانِ قدرت جسے صالحیت یعنی وراثتِ ارض کے حصول کا ذریعہ بننا ہے یہیں ختم ہو کر رہ جائے گی اور کس قدر سوختہ سامان اور شوریدہ بخت ہے وہ قوم جس کی جھولی میں پڑی ہوئی ایسی متاعِ گراں بہا اس طرح سے چھن جائے۔

خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے

ویلیتنی مت قبل ہذا وکنت نسیاً منسیا!

لیکن ان خارجی دشمنوں سے کہیں زیادہ شدید مخالفت خود اپنوں کی طرف سے ہوگی جو اس انقلاب سے اس لئے خائف ہوں گے کہ اس میں انہیں اپنی ملمع کارانہ سیادت اور پُر فریبانہ قیادت کی موت نظر آئے گی یہی وہ گروہ ہے جو ہر زمانہ اور ہر قوم میں ہر دعوتِ انقلابِ حق و صداقت کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے اور قرآن نے جسے مترفین کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ مترفین کے عناصرِ ترکیبی ان کے نفسیاتی میلانات، اور ذہنی رجحانات ان کے خصائص و لوازم ان کے مقاصد و عزائم کیا ہوتے ہیں یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں سر دست صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ مترف کے مفہوم میں تن آسان، سہل انگار، نفس پرست، عیش پسند، دوسروں کی کمائی پر آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے کے عادی سب داخل ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ ہر رسول کی دعوتِ انقلاب کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کفرون (۳۴:۳۴)

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر اس کے مترفین نے کہا کہ ہم تمہارے پیغام صداقت سے انکار کرتے ہیں۔

ہر داعئ حق و صداقت کا پیغام انقلاب آفریں و حریت بخش ہوتا ہے وہ انسانی ذہنوں کے تراشیدہ قوانینِ بندگی کو الٹ کر ان کی جگہ قوانینِ خداوندی کے مطابق نظامِ حیات قائم کرنا چاہتا ہے اس نظام کے تحت میں ان مترفین کو جو پشت ہا پشت سے دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی نرم و نازک زندگی بسر کرتے چلے آتے ہیں

پیغامِ موت نظر آتا ہے اس لئے کہ زندگی کی تن آسانیاں اور سہل انگاریاں انہیں کسی تبدیلیٔ حالت کے قابل نہیں چھوڑتیں۔ نتیجہ یہ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس نہج و اسلوب پر قوم کا نظامِ معاشرت و تمدن چل رہا ہے اسی پر چلتا جائے۔

وکذٰلک ما ارسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا۔ انا وجدنا آباءنا علیٰ امۃ وانا علیٰ اٰثارھم مقتدون (۴۳/۲۳)۔

اسی طرح ہم نے اے رسولِ عربی، تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا کہ اس کے مترفین گروہ نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو جس روش پر چلتے دیکھا ہے اس کی تقلید میں ہم (نجات و سعادت کی راہ دیکھتے) ہیں۔

یہی وہ قوم کے اکابرین ہیں جو ہر دعوتِ انقلاب کی مخالفت میں سب سے پہلے آواز اٹھاتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے اپنی مسرفانہ فسوں طرازیوں اور شاطرانہ فریب سازیوں سے قوم کو سکھایا ہی یہ ہوتا ہے کہ تم مردہ تا کہ ہم زندہ رہیں تم محنت کرو تا کہ ہم تن آسانی کی زندگی بسر کریں۔ تم دست و بازو تا کہ ہم شکم بن جائیں تم سنو تو ہمارے کانوں سے دیکھو تو ہماری آنکھوں سے سوچو تو ہمارے دماغوں سے سمجھو تو ہمارے دلوں کی راہ سے، چراغ تمہارے بدن کا تیل ہماری زبان تمہاری ہو باتیں ہماری تمہارے پسینے سے ہمارے گلستانوں میں آبیاریاں ہوں اور تمہارے خون کی سرخی سے ہمارے ایوانوں میں گلکاریاں اس لئے ہر وہ تبدیلی جس میں سرنگوں غریب کے

مترفین کا گروہ

لئے سامانِ زیست میسر ہو ان کے لئے پیامِ موت ہوتی ہے لہٰذا ان کی طرف سے مخالفت یقینی۔ یہی ازل سے ہوتا آیا ہے یہی ابد تک ہوتا رہے گا آج سے پانچ ہزار سال پیشتر جب دنیا میں سب سے پہلی مرتبہ یہ آواز حضرت نوحؑ کی زبان سے اٹھی تو ان ہی اکابرین نے اس کی مخالفت کی۔

قال الملاء من قومہٖ انا لنرٰک فی ضلٰل مبین (۷/۶۰)

اس کی قوم کے اکابرین نے کہا۔ ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ تو (اس دعوتِ انقلاب میں) ایک کھلی ہوئی گمراہی پر ہے۔

اسی پیغام کو جب حضرت ہودؑ نے دہرایا تو مخالفت کی اس صدائے بازگشت نے اس دعوت کی مزاحمت کی۔

قال الملا الذین کفروا من قومہ انا لنرٰک فی سفاھۃ وانا لنظنک من الکاذبین (۷/۶۶)

اس کی قوم کے اکابر نے جنہوں نے اس دعوت کی صداقت سے انکار کیا تھا کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ تو حماقت میں مبتلا ہے اور جو کچھ کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔

یہی وہ اکابرینِ قوم تھے جنہوں نے حضرت صالحؑ کی اس پکار کی مخالفت میں آواز اٹھائی۔

قال الذین استکبروا انا بالذی اٰمنتم بہ کٰفرون (۷/۷۶)

اس قوم کے متکبرین نے کہا کہ جس بات پر تم ایمان لائے ہو ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔

یہی جواب حضرت لوطؑ کو ملا (۷/۸۲) اور اسی نہج سے حضرت شعیبؑ کی دعوتِ انقلاب کا استقبال ہوا۔ یہی وہ کبراء و جبابرۂ قوم تھے جنہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جھونک دینے کی ٹھانی تھی اور یہی قومِ فرعون کے وہ متکبرین و مترفین تھے جنہوں نے فرعون کو حضرت موسیٰؑ کے قتل کرنے کی صلاح دی تھی۔ یہی وہ سیادت و قیادت کے اجارہ دار تھے جنہوں نے جنابِ مسیحؑ کو حوالۂ دار و رسن کرنے کی سازش کی تھی اس لئے کہ وہ خدا کی بادشاہت کو غریبوں کا حصہ بتاتے تھے اور یہی وہ رؤسا و امراءِ عرب تھے جنہوں نے تمام عمر اس دعوتِ آسمانی کی سخت ترین مزاحمت و مخالفت کی جو حکومت و سلطنت کی کنجیاں مترفین سے چھین کر متقین کو دینے کے لئے بلند ہوئی تھی۔ یہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہی ہوگا۔ اس خطۂ زمین پر جسے ہم پاکستان سے تعبیر کرتے ہیں جب اس انقلابِ صحیحہ کی آواز اٹھے گی جو قوم میں صالحیت کا موجب بنے گا اور جس میں عزت و تکریم اور سیادت و امامت کے پیمانے بدل جائیں گے تو اس کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز انہی مترفین کی طرف سے بلند ہوگی جو آج اپنے خودساختہ معیاروں کے مطابق از خود واجب التکریم بنے بیٹھے ہیں اور جن کی کیفیت یہ ہے یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳/۱۸۷) وہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ وہ زبان سے کہتے ہیں لیکن کرتے نہیں اس کے لئے ان کی تعریف کی جائے۔ انہیں مستقل مسندِ عظمت و منبرِ عقیدت پر بٹھائے رکھا جائے یہ ہیں وہ لوگ جن کی طرف سے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دینے والی ہر آواز کی مخالفت ہوگی چونکہ اس

زمانہ کی فضا میں عہدِ کہن کے شخصی استبداد کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے سیاستِ حاضرہ کے تقاضے یہ ہیں کہ ان میں زبان سے تغلب و تفوق اور استیلاء و استبداد کی مخالفت کی جائے لیکن نظام اس قسم کا قائم کیا جائے جس میں وہی تغلب و استیلاء موجود رہے یعنی روح وہی ہے لیکن اس کے پیکر بدل چکے ہیں لات و منات وہی ہیں فقط ان کے لباس میں تبدیلی آگئی ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　　جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

لہٰذا پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے یہ دوسرا مرحلہ پہلے سے بھی زیادہ ہمت طلب اور حوصلہ آزما ہے۔ اگر انہوں نے اس باب میں جرأت و بسالت اور ثبات و استقامت سے کام نہ لیا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکے گا کہ یہ بھی اس قسم کی حکومت قائم کر لیں جیسی دنیا کی اور قومیں قائم کئے بیٹھی ہیں لیکن یہ قرآنی استخلاف فی الارض نہیں ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی حکومت بہرحال و بہرکیف غیروں کی حکومت کے مقابلے میں ہزار آئیں سود مند ہوتی ہے اس لئے وہ زندگی اس سے پیشتر کی زندگی سے یقیناً بہتر ہوگی لیکن قرآنی زندگی نہ پہلے تھی نہ یہ دوسری ہوگی۔ پہلی زندگی میں یہ معذوری تھی کہ ہمیں وہ امکانی مواقع میسر نہیں تھے جن سے ہم اپنے تصوراتِ صحیحہ کے مطابق نظامِ حکومت قائم کر سکتے لیکن اب امکانِ قدرت کے میسر آجانے سے وہ بات تو باقی نہیں رہی۔ اب ہمارے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہ ہوگا کہ ہم نے اپنی زندگی کی عمارت کو قرآنی خطوط پہ تعمیر کیوں نہ کیا۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے حکومت مبدل باستخلاف و وراثت اسی صورت میں ہوتی ہے جب وہ اس نظام کے قیام کا ذریعہ بنے جسے خالقِ کائنات نے نوعِ انسانی کے لئے تجویز کیا ہے۔ وہ جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔ (۲۲/۴۱)

یہ (مسلمان) وہ لوگ ہیں کہ جب ہم انہیں تمکّن فی الارض عطا کریں گے تو وہ نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قائم

نکال کر لے آئے اس سے تو ہم فرعون کی غلامی میں اچھے تھے اور یہاں کیا حالت ہے۔ اگلے دنوں میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ کالی جھنڈیاں لئے پاکستان مردہ باد کے نعرے لگاتے جلوس کی شکل میں چلے جا رہے ہیں۔ ایک سے پوچھا کہ کیوں؟ کیا بات ہے؟ کہنے لگا میاں! تین دن ہو گئے پانی کا نل بند پڑا ہے کوئی سنتا ہی نہیں جہنم میں گیا ایسا پاکستان اور جہنم میں گئی اسلامی حکومت کچھ وہاں مر گئے اور جو باقی رہ گئے ہیں یہاں مارے جا رہے ہیں۔ دیکھئے یہ داستان کس طرح حرف بحرف بنی اسرائیل کی داستان سے ملتی ہے اور قوم کس طرح ذرعاً ذرعاً اور شبراً شبراً ان کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے جس شخص سے بات کیجئے یہ معلوم ہوگا گویا اس نے پاکستان میں آکر کسی کی ہفت پشت ہفتاد نسل پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوم کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن ان مصیبتوں کی برداشت میں ان کی طرف سے پیہم اس قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ ہو رہا ہے گویا یہ مصیبتیں کسی اور کی خاطر مفت میں جھیل رہے ہیں انہیں قطعاً اس کا احساس نہیں کہ انہیں ایک ملکِ عظیم عطا ہوا ہے تاکہ وہ اس پر اپنی حکومت قائم کریں اور اگر انہوں نے ان مصائب اور تکلیف کو ہمت سے اور حوصلے سے برداشت کر لیا تو دنیا بھر کی سرفرازیاں اور سربلندیاں ان کے قدم چومیں گی۔ یہ عوام کا حال ہے خواص کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس خطۂ زمین کے مل جانے سے سب کچھ مل گیا ہے۔ اب کچھ کرنے کا کام باقی نہیں رہا۔ چند دنوں کی یہ چند روزہ غوغا آرائی ختم ہو جائے تو وہ تختِ جہانداری و سریرِ جہانبانی پر کامل امن و سکون سے متمکن ہو جائیں گے۔ وذالک الفوز العظیم۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر　　اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

یاد رکھئے یہ خطۂ زمین بجائے خویش کوئی شے نہیں۔ نہ یہ اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہے اور نہ ہی ہم اس کی مٹی میں دفن ہونے سے جنت الفردوس کے مستحق بن سکتے ہیں یہ محفوظ اسی صورت میں رہ سکتا ہے کہ آپ اپنے خون سے اس کی حفاظت و صیانت کا سامان بہم پہنچائیں اور پھر اس طرح محفوظ و مصئون ہونے کے بعد یہ جنتِ ارضی میں اسی صورت میں متبدل ہو سکتا ہے جب آپ اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے اس پر خدا کی حکومت کا تختِ اجلال بچھائیں

وراثتِ ارض کا ابدی قانون صالحیت ہے اور خوف و حزن سے مامونیت و محفوظیت صرف اس کے لئے مقدر

کی گئی ہے جو اپنے آپ کو قانونِ الٰہیہ کی حفاظت میں لے آئے اور اس طرح اصلح بن جائے۔

فمن اتقیٰ واصلح فلاخوف علیہم ولاھم یحزنون۔ (۳۵/۷)

پس جو کوئی اپنے آپ کو (قوانینِ خداوندی) کی حفاظت میں لے آئے اور اپنے اندر صالحیت پیدا کرے اس کے لئے نہ کوئی خوف ہے نہ غم۔

وذالك الدین القیم ولکن اکثرالناس لایعلمون۔

مسلمان کی زندگی

(اکتوبر ۱۹۳۹ء)

جب انسان پر مایوسی کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں ظلمت کدۂ عالم میں امید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہتی تمام اسباب و عِلل ایک ایک کر کے جواب دیدیتے ہیں تو اس کا دل بیٹھ جاتا ہے زندگی کے تمام ناکام تجارب کی یاد پھر سے تازہ ہو جاتی ہے عمر بھر کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے نقوش ذہن کے پردوں سے ابھرتے چلے آتے ہیں وہ ان کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھ جاتا ہے زندگی اسے مسلسل مصائب و تکالیف کی اندوہناک داستان معلوم ہوتی ہے انسان اسے ایک بے کس و بے بس مجبور و مظلوم قیدی کی طرح نظر آتا ہے جسے فطرت کی چیرہ دستیوں نے جور و ستم اور ظلم و استبداد کی المناک صعوبتیں جھیلنے کے لئے اس وحشتناک کرہ میں بھیجا ہے چونکہ دنیا کی ہر شے وہی کچھ بن جاتی ہے جس نگاہ سے انسان اسے دیکھے اس لئے جب وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے تو اسے کہیں مسرت و شادکامی کی نورانی کرن نظر نہیں آتی ہر چہرہ تبسم ناآشنا اور پریشانی غم آلود دکھائی دیتی ہے وہ سوچتا ہے اور بار بار اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

> زندگی مصائب کا دوسرا نام ہے۔ خاص اور دوامی مصائب، ہر آرزو ایک مستقل تکلیف کا پیش خیمہ ہے لہٰذا سکون و اطمینان عدم آرزو میں ہی ہے۔ (مہا تمابدھ)

وہ حیاتِ انسانی کو ایک لغو و باطل شے قرار دیتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ زندگی محض سراب ہے دھوکا ہے

مایا کا جال ہے (اپنشد) "وہ زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو ورق خیال کرتا ہے (شوپنہار) وہ زندگی
سے دور بھاگنا چاہتا ہے اور اسے چھوڑ دینے میں ہی عافیت سمجھتا ہے چونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی ناکامیوں کے پردوں
میں دوسرے انسانوں کے ہاتھ پوشیدہ ہیں اس لئے اسے عام انسانوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور چونکہ عام
انسانوں میں سے صاحبانِ ثروت و اقتدار کو وہ اپنی لٹی ہوئی مسرت کا سبب سمجھتا ہے اس لئے ان انسانوں کے خلاف
نہیں بلکہ خود دولت و ثروت، شوکت و سطوت کے خلاف اس کے دل میں ایک گرہ سی بیٹھ جاتی ہے وہ انسانوں کی
بستیوں کو چھوڑ کر دور جنگلوں میں جا کر بسیرا کر لیتا ہے اگر اسے انسانوں میں رہنا بھی پڑے تو وہ دولت و ثروت کے
خلاف جہاد کرنا سب سے بڑی خدمتِ خلق سمجھتا ہے وہ یہ کہکر اپنے قلبِ محزوں کو تسلی دے لیتا ہے کہ خیر اس دنیا میں
تو یہ جو جی چاہے کر لیں۔ "آسمانی بادشاہت" میں تو ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہو گا وہ ستم رسیدہ [illegible]

ترکِ دنیا

ناتواں، ضعیف، مغلوب و مقہور انسانوں کو یہ کہکر مطمئن کر دیتا ہے کہ یہ دنیا تمہارے لئے نہیں
ہے اس کے طالب خدا کی نگاہوں میں مردود و ملعون ہیں البتہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی آنے
والی ہے جس میں دولت و حشمت کے مالک ذلیل و خوار ہوں گے اور جو آج ذلیل و خوار ہیں وہ معزز و مکرم
آسمانی بادشاہت ہنی مفلس و غریب انسانوں کی وراثت ہے نروانا میں بدھ کے مقرب یہی لوگ ہوں گے
میں برہما کے ہم آغوش ہونے والے یہی بھگت ہیں یہی تعلیم کنیسہ و صومعہ کے راہب کی اصل ایمان ہے یہی نسخہ
سنیاسی اور تیاگی بھکشو کا سچا دھرم ہے اس فلسفہ اور مشرب کی لِم یہ ہے کہ حال کو ذلیل کر کے مستقبل کو مزین
بنایا جائے دنیا کی رسوائیاں، عاقبت کی سرفرازیاں قرار دی جائیں یہاں کی ذلت آنے والی زندگی کی عزت ہو
یہاں جتنا پست ہو وہاں اتنا ہی بلند ہو یہاں کا محتاج وہاں کا غنی یہاں کا تباہ حال وہاں کا خوش حال ہو
یہاں کا نادار وہاں کا مالک ہو وہ یہاں کے مصائب و آلام کو بڑھا بڑھا کر اپنا گھر دکھ ہے کیونکہ اسے ان میں بڑی
مسرتوں کے پیام نظر آرہے ہیں غرضیکہ وہ دنیا و آخرت کے درمیان ایک ایسے ناقابل شکست آئینہ کی سدِ سکندری
قائم کر دے جس میں یہاں کا ہر نقش معکوس دکھائی دے۔

لیکن کیا یہ تعلیم، فطرت کی تعلیم قرار دی جا سکتی ہے؟ کیا انسان واقعی اس دنیا میں ایک مجرم و مقہور قیدی کی حیثیت سے لایا گیا ہے کہ وہ اس جیل خانہ میں عمر قید ہے؟ کیا اس کی تخلیق سے فی الواقع یہی منشا ہے کہ وہ فطرت کے ہر تقاضے کے خلاف جنگ کرتا رہے اور ان جذبات کے فنا کر دینے ہی میں اپنی کامیابی سمجھے؟ کیا دنیا اور اس کی نعمتیں واقعی قابلِ نفرت و ملامت ہیں؟ کیا یہاں کی ہر سہانی شے شجرِ ممنوعہ کا حکم رکھتی ہے؟ کیا

کیا دنیاوی زندگی ذلیل ہے؟

مقصدِ حیاتِ انسانی ذلت و رسوائی، محتاجی و ناداری، نکبت و مسکنت، افلاس و زبوں حالی اور مغلوبیت و مقہوریت ہی ہے؟ پھر کیا ایک آنے والی زندگی کی تمام برکات و نعم، یہاں کی رسوائیوں اور ذلتوں کے معاوضے میں ملیں گی؟ کیا آسمانی بادشاہت اسی قسم کی خدائی فوج کا حصہ ہو گی جو دنیا میں ہر قوت سے ڈرتی دبکتی دن گزار رہی ہو؟ کیا خدا کا مقرب وہی ہو گا جسے دنیا میں کوئی اپنے پاس بیٹھنا پسند نہ کرے؟ کیا دولت و حشمت، عزت و وقار کی زندگی واقعی جنت سے محرومی کا سبب ہو گی؟ کیا یہاں کے مرفہ الحال لوگوں پر وہاں کا بابِ السلام قطعی مسدود ہو گا؟ کیا یہاں کے چاندی و سونے کا ہر ٹکڑا جہنم کے طوق و سلاسل بنانے کے کام میں لایا جائے گا؟ ذل و مسکنت کیا واقعی خدا کی رحمت ہے؟ وسعت و فراخی کیا فی الحقیقت اس کا عذاب ہے؟

ان سوالات کا جواب آپ اپنے دماغ سے کہ جس پر ایک عرصۂ دراز سے خاص ماحول اور مخصوص تعلیم کے پردے پڑے ہوئے ہیں خود ہی دیجیے اور اس سے مطمئن ہو جائیے۔ لیکن آئیے ہم دیکھیں کہ قرآنِ کریم ان کی بابت ہمیں کیا تعلیم دیتا ہے کہ وہی تعلیم تعلیمِ فطرت اور وہی حکم حکمِ خداوندی ہو گا۔

قرآنِ کریم ہمیں کھلے کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ انسان کی پیدائش اس کائنات میں ایک مخدوم کی سی ہے اور جملہ موجوداتِ عالم اس کے خدمت گزار اور مطیع ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (۴۵/۱۳)

پستیوں اور بلندیوں (ارض و سماوات) میں جو کچھ ہے سب کو تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔

انسان کی پوزیشن

لہٰذا انسان کا منصب یہ ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کو اپنا تابع فرمان بنائے فطرت کی ہر چیز سے کام لے کر ایک مدت معینہ تک یہ سب اس کی متاع ہیں دنیا کی زیبائش و آرائش کی چیزیں خدائے تعالیٰ نے قطعاً حرام نہیں کیں (۷ : ۳۲) بلکہ ان میں انسان کے لئے ایک خاص کشش و محبت رکھی ہے۔ (۳ : ۱۳) ان سے تمتع حاصل کرنا ان سے فائدہ اٹھانا ان کو کام میں لانا ہی ان کی تخلیق کا مقصد ہے اور اسی انتفاع و تمتع کا نام دنیا میں عزت و وقار کی زندگی بسر کرنا ہے اس میں کلام نہیں کہ دولت و حشمت کے غلط استعمال سے ہماری معاشی اور معاشرتی زندگی ناہموار ہو جاتی ہے جس سے ہمارے تمدن میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ دنیا سے الگ ہو جانا ہی اس کا علاج ہے اگر دولت و قوت کی بے لگام سرکشی انسانی فضیلت نہیں تو ذلت و پستی کی زندگی بھی تو انسانی تخلیق کی غرض و غایت نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت انبیاء کرام کی تعلیم ہمیشہ اس افراط و تفریط کو مٹانے کے لئے ہوتی تھی۔ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ خدائے قیوم کا ازلی پیغام جو ان حضرات مامورین من اللہ کی وساطت سے دنیا میں آتا رہا اس باب میں اس کا شروع سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی لَم رہی ہے یعنی وہ ان عیوب و نقائص کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے جو دولت اور قوت کے غلط استعمال سے انسانوں میں پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف ضعیف و ناتواں لوگوں کو ابھار کر انسانیت کی بلند ترین سطح پر لاتے رہے اور انہیں الٰہی تعلیم کی طرف متوجہ کرتے رہے جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں وہ عیوب پیدا نہ ہوں جو مترفین میں پیدا ہو جاتے ہیں دولت و ثروت کے غلط استعمال سے نظام انسانی میں فساد پیدا ہو جاتا ہے لہٰذا حضرت انبیاء کرامؑ جن مستضعفین کو ابھار کر بلندی پر پہنچاتے تھے انہیں تاکید کرتے تھے کہ دیکھنا تم نے حدود اللہ کی نگہداشت کرنا ورنہ ان کے توڑنے سے تمہارا بھی وہی انجام ہو گا جو تمہارے متقدمین کا ہو چکا ہے وہ قوانین الٰہی سے منہ موڑ لینے والے انسانوں سے دنیا چھین کر ان کو دوسروں کو دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ انہیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتے تھے جس سے ان کے درجات کے درمیان ایک دائمی رشتہ قائم رہے اور اس طرح انسانیت کا نظام متوازن و ہموار طریق پر چلتا رہے بس یہ ہے خلاصہ

تعلیم فطرت کا جو انسانوں کی ہدایت کے لئے زمین پر بھیجی جاتی رہی اور اس پر عمل پیرا ہونے کا نام دنیا کی فلاح

دنیا اور آخرت

اور عاقبت کی سرخروئی ہے میزانِ خداوندی کے یہ دو پلڑے ہیں جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہیئے نظامِ انسانیت کی گاڑی کے یہ دو پہیے ہیں جو ہمیشہ ہموار اور استوار رہنے چاہئیں آزادیوں کی فضائے بسیط میں اڑنے والے پرندے کے یہ دو بازو ہیں کہ جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو گیا تو وہ زمین سے ابھر نہیں سکتا۔ اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی حدیں وہ ہیں جہاں پہنچنے سے قدسیوں کے بھی پر جلتے ہیں یاد رکھئے! اگر نعمائے آخرت خدا کا انعام ہیں تو دنیوی شوکت و عظمت بھی کچھ کم نعمت نہیں اور یہ وہ نعمت ہے جس کی یاد دہانی اقوامِ عالم کو بار بار کرائی جاتی رہی ہے حضرت ہود نے اپنی قوم سے یہی فرمایا کہ خدا کی اس نعمت و قدرت کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں قوم نوحؑ کے بعد استخلاف فی الارض کی بخشش سے نوازا اور تمہیں قوت و حشمت میں برتری عطا فرمائی لہٰذا

فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۷: ۶۹)

اللہ کی یہ نعمت یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی نصیب ہو۔

یہی حضرت صالحؑ نے قوم ثمود سے کہا۔

تم خدا کی اس بخشش کو یاد کرو کہ اس نے تم کو قوم عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں تمکن
کیا تم نرم زمین پر محلات بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں رہنے کے مکانات تعمیر کرتے ہو
سو اللہ کی نعمتوں کو پیش نظر رکھو اور زمین میں فساد مت پیدا کرو۔ (۷: ۷۴)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم زمین پر قلیل تھے اس نے تمہیں کثرت عطا فرمائی (۷: ۸۶) حضرت ابراہیمؑ کو اس دنیا میں بھی حسنات دی گئیں اور آخرت میں بھی (۱۶: ۱۲۲) اور آلِ ابراہیمؑ کتاب و حکمت کے ساتھ ملکِ عظیم کی بھی مالک بنائی گئی (۴: ۵۴) اور اس کو اللہ کا فضل قرار دیا حضرت یوسفؑ کو اس قدر گردش کے بعد جس نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز کیا گیا وہ تمکن فی الارض تھا اور اس عطیہ کبریٰ کو ان کے صبر و

تقویٰ کا اجر جزیل کہا گیا۔

اور اس طرح ہم نے یوسف کو زمین میں صاحب حکومت بنادیا (مکنّا فی الارض) کردیا جہاں چاہیں رہیں سہیں ہم جس پر اپنی رحمتیں چاہیں پہنچادیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے (۱۲ : ۵۶)

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستان اسی قوت وحشمت، تمکن وتسلط کی مسلسل تاریخ ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ جس شدت وتکرار سے اس قوم کے واقعات قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں کوئی اور واقعہ اس شد ومد سے دہرایا نہیں گیا اس تمکن کو کمزوروں پر خاص احسان کہا گیا ہے۔

ہم چاہتے تھے کہ جن لوگوں کو کمزور کردیا گیا تھا ان پر احسان کریں اور ان کو دیگر اقوام کا امام بنادیں اور ملک کا وارث قرار دیدیں اور ان کی حکومت کو زمین پر قائم کردیں اور فرعون وہامان اور ان کے لشکر کو وہ کچھ دکھا دیں جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ (۲۸ : ۵-۶)

چنانچہ اسی ضعیف وناتواں، اسی محکوم ومغلوب قوم کو بالآخر مشارق ومغارب کا حکمران بنادیا۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا ۚ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا ۚ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۔ (۷ : ۱۳۷)

اور ہم نے اس قوم کو جو بالکل کمزور شمار کی جاتی تھی اس بابرکت زمین کے مشرق ومغرب کا مالک بنادیا اور آپ کے رب کا وعدۂ حسنہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے استقلال کی وجہ سے یوں پورا ہوگیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ اور بلند بوس عمارت کو درہم برہم کرکے رکھ دیا۔

صبر وتوکل، سعی وعمل کا یہی وہ انجام تھا جس کے لئے حضرت موسیٰؑ نے پہلے ہی اپنی قوم سے وعدہ کررکھا تھا۔

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدائے تعالیٰ سے مدد مانگو اور مستقل مزاج رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے وہ جسے چاہے

دائمی قوانین کے مطابق، چنانچہ ان میں سے ان کا ملک نکالنا ہے اور آخری انجام تو متقین کے لئے ہی ہے۔ (۷: ۱۲۸)

چنانچہ یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کی یاد بار بار بنی اسرائیل کو دلائی گئی ہے۔

اے بنی اسرائیل یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے تم کو نوازا تھا اور تمہیں تمام اقوام عالم پر برتری عطا کی تھی (بقرہ و دیگر مقامات)

اور جب اس قوم نے قوانینِ الٰہی سے سرتابی اختیار کر لی تو خدا کی طرف سے جو سب سے بڑا عتاب ان پر نازل ہوا وہ اسی نعمتِ کبریٰ کا چھن جانا تھا۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ۔ (۲)

اور ان پر ذلت و مسکینی کی مار ماری گئی اور وہ اللہ کے غضب کے سزاوار ہو گئے۔

تاریخی یادداشتیں

مذکورہ صدر قصص، قرآنِ کریم میں بار بار دہرائے گئے ہیں قصص القرآن کا مقصد محض وقائع نگاری نہیں بلکہ ہر قصہ اور اس کا ہر بیان اپنے اندر عبرت و موعظت کی کھلی کھلی بصیرتیں رکھتا ہے چنانچہ قرآن کریم امم گذشتہ کے احوال و ظروف کی طرف خاص طور پر توجہ دلاتا ہے اور بار بار تاکید کرتا ہے کہ غور و فکر کرتے دیکھو کَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ — جن قوموں نے قوانین الٰہی کی تکذیب کی ان کا کیا انجام ہوا؟ ظاہر ہے کہ ان اقوام کے دنیاوی انجام کی طرف توجہ دلانا ہی مقصود ہے کیونکہ آخروی انجام تو کسی کی آنکھوں کے سامنے نہیں آسکتا۔ ان میں سے بہت سی قومیں تو قانونِ خداوندی کے مطابق صفحۂ کائنات سے حرفِ مکرر کی طرح مٹ گئیں اور ان کی محض داستانیں تاریخ میں باقی رہ گئیں۔ وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيْثَ (۲۳: ۴۴) اور بعض قومیں گو زندہ رہیں اور اب بھی زندہ ہیں، مگر ان کی حالت عبرت و نصیحت کی زندہ داستان ہے پھر قرآنِ کریم نے تاریخی نتائج کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ

واضح الفاظ میں یہ بھی ذہن نشین کرا دیا کہ اس دنیا میں عزت و توقیر کی زندگی اللہ کی رحمت ہے۔ دنیا کی ذلت و خواری اس کا غضب اور عذاب ہے مثلاً کہیں یہ وعدہ ہے کہ تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں ان کو وہ زمین کا بادشاہ بنائے گا" (۵۵ : ۲۴) کہیں یہ تشریح ہے کہ جو کوئی عمل صالح کرے گا وہ مرد ہو یا عورت شرط یہ ہے کہ مومن ہو تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور جو اچھے کام ان سے عمل میں آتے ہیں ان کا اجر دیں گے۔ (۹۷ : ۱۶) جو کوئی اللہ کی راہ میں گھر چھوڑتا ہے اسے اس دنیا میں بہترین گھر دیا جاتا ہے۔ (۴۱ : ۱۶) جو اس کے دیئے ہوئے کی قدر کرتا ہے اپنی قوتوں وغیرہ کی نعمتوں کو صحیح صحیح طور پر مصرف میں لاتا ہے کہ یہی عملاً شکر نعمت ہے اللہ ان نعمتوں میں اور زیادتی کرتا جاتا ہے (۷ : ۱۴) برعکس اس کے جو قوانینِ خداوندی سے بلا علم و ہدایت، بلا دلیل و برہان بے خبر ہے ان قوانین سے منہ موڑ لیتا ہے وہ خود بھی منزل مقصود تک لے جانے والے راستے سے بہک جاتا ہے اور دوسروں کو بھی بہکاتا ہے اس کی سزا یہ ہے کہ اسے دنیا میں بھی ذلت و خواری نصیب ہو گی اور اس کے بعد کی زندگی میں عذابِ حریق ملے گا (۸ : ۲۲) اسی طرح جو اس کے قوانین اس طرح سے مانے کہ جو بات اپنے مطلب کی ہو اسے قبول کرے اور جس میں کسی قربانی و ایثار کی ضرورت ہو اور وہ اس کی طبع سہولت پسند پر گراں گزرے اور وہ اس سے پہلو تہی کرے اس کے لئے بھی خزی فی الحیوٰۃ الدنیا کا رسوائی آمیز عذاب بتایا گیا ہے (۸۵ : ۲) غرض دو نہیں سینکڑوں آیات اسی اصول کی تشریح اور اسی نکتہ کی تفصیل میں موجود ہیں اس اعتقاد کو دلوں میں جس طرح جاگزین کر دینے کے بعد مسلمانوں کے لئے ایک دستور العمل، ایک لائحہ حیات تجویز کیا گیا جس سے وہ ان تمام نعمتوں کے وارث و مالک ہونے والے تھے جو اقوامِ گزشتہ کو مل چکی تھیں اور جن کا ذکر قرآن کریم میں ہو چکا تھا ان برکات کے حصول کی شرط ایمان و تقویٰ تھی۔

قرآن کی تعلیم

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۷ : ۹۶)

اگر ان بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم یقیناً ان پر آسمان سے برکات کے دروازے کھول دیتے۔

اور اسی ایمان تقوی سے مسلمانوں کی دنیا میں ایک امتیازی زندگی عطا ہونے والی تھی۔

اے ایمان والو! اگر تم نے تقوی اختیار کیا تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا فرمائے گا اور تمہاری
لغزشوں کو دور کر دے گا، اور تمہاری کوتاہیوں سے درگزر کریگا اور اللہ فضلِ عظیم کا مالک ہے۔ (۸:۲۹)

مومنین کی زندگی

اس لائحۂ عمل کی رو سے جو قرآن کریم نے تجویز کیا ایک مسلم کی تمام زندگی مسلسل جدوجہد، غیر منقطع سعی و عمل، ان تھک کوشش، کوہ شکن عزم، غیر متزلزل استقامت، پیہم جہاد، اور یکسر سپاہیانہ زندگی تھی جس کا مقصد محض "عاقبت سنوارنا" ہی نہ تھا بلکہ اپنے حسنِ عمل اپنے اعمال صالح کے جیتے جاگتے نتائج اس دنیا میں دیکھ لینا بھی تھا ذلت و پستی کی زندگی، محتاجی و فلاکت کی زندگی، مجبوری و بے لبسی کی زندگی کہ جسے قرآن نے غضبِ خداوندی کا نتیجہ قرار دیا تھا نشیب اعدا کر کے خود عزت و وقار کی زندگی، خوش حالی و خوش بختی کی زندگی، عظمت و شوکت کی زندگی، حکومت و سطوت کی زندگی بسر کرنا تھا کہ یہی قرآن کریم کی رو سے ایک مومن و عمل صالح کرنے والی جماعت کی حیاتِ طیبہ ہو سکتی تھی ان کے نزدیک عبادات و اعمال کا ماحصل "اپنے اللہ سے دین و دنیا کے حصے لینا تھا"۔ (۲:۱۴۷) وہ قوم بننا تھا جسے خدا نے تمام اقوامِ عالم میں سے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کر لیا تھا (۳۲ : ۲۵) جسے نوعِ انسانی میں سے بہترین امت قرار دیا تھا (۳:۱۰۹) ایسے عباد صالح بننا تھا جن کے لئے وراثتِ ارضی مقدر ہو چکی تھی (۲۱:۱۰۵) اور عملاً بتا دینا تھا کہ خدا کے اس اٹل قانون میں اس کے بندوں کے لئے ایک عظیم الشان پیغام موعظت ہے۔ بلاغ مبین ہے۔ (۲۱: ۱۰۶) اور ساری دنیا کو دکھا دینا کہ ہاں جو سچے مومن بن جائیں۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰:۶۴)

ان کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی بشارتیں ہیں اور آخرت میں بھی یہ قانونِ الٰہی غیر متبدل ہے اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

نہیں بلکہ یہ ثابت کر دینا تھا کہ خدا کا یہ وعدہ کہ ہم دنیا میں اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی مدد کیا کرتے ہیں (۴۰:۵۱)

یقیناً پورا ہوا کرتا ہے۔ قرآن ارضی کو عملاً بتا دیتا تھا کہ کس طرح صبر و صلوٰۃ سے استعانت طلب کی جاتی ہے (۲ : ۴۵) کس طرح دشمنوں کے جمِ غفیر کے مقابلہ میں ڈٹ کر اللہ کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے کہ جس سے فتح و نصرت قدم چومتی ہے۔ (۸ : ۴۵) الغرض یہ لوگ اپنے اعمال سے جریدۂ عالم پر اپنا دوام ثبت کر کے یہ دکھا دیتے تھے کہ یاد رکھو تمام خوبیاں، ہر قسم کی کامیابیاں صرف مومنین کے لئے ہیں مجاہدین کے لئے ہیں۔ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۹ : ۸۸) اور یہی لوگ ہیں جن کے لئے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔ انہوں نے یہ کچھ کر کے دکھایا اور ان کے نتیجے میں وہ تمام وعدے پورے کر دیئے جو ان سے کیے گئے تھے۔

وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا (۳۳ : ۲۷)۔

اور اس نے تم کو (تمہارے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے مالوں کا مالک بنا دیا

اور اس سرزمین کا بھی کہ جہاں ابھی تمہارے قدم بھی نہ پہنچے تھے اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

یہ تعداد میں تھوڑے تھے لیکن ان کے حوصلے بڑھانے کے لئے ان کے خوابوں میں انہیں دشمن تھوڑے دکھلائے جاتے۔ (۸ : ۴۳) جب مقابلہ ہوتا تو ان کے نورِ ایمان سے مخالفین کی آنکھیں خیرہ کر دی جاتیں کہ جس سے یہ انہیں تھوڑے دکھائی دیں (۸ : ۴۴) کبھی ایسے لشکروں کو بھیج کر ان کی مدد کی جاتی جن کو کسی کی آنکھ نہ دیکھ سکتی اور جس سے ان کے دلوں میں سکینت و تثبیت اور ان کے اعدا کے دل میں ان کا رعب ڈال دیا جاتا (۸ : ۱۲) کبھی ان میں کا ایک ایک دو دو پر بھاری ہوتا (۸ : ۶۶) کبھی دس دس پر (۸ : ۶۵) ہاتھ ان کے ہوتے اور مارنے والا خود خدا ہوتا۔ تیر ان کے ہوتے اور قضا ان کے ساتھ لپٹی ہوتی خدا کی (۸ : ۱۷) ان کے مقابلہ میں نہ دشمنوں کی اکثریت ان کے کام آتی اور نہ قوت اس لئے کہ یہ قوانینِ خداوندی کی روشنی میں قدم اٹھاتے تھے اور وہ ان رستوں کو جان چکے تھے یہی وجہ تھی کہ ہر معرکہ ان کے ہاتھ میں اور ہر میدان ان کے قبضہ میں ہوتا۔ اس طرح سے بتا دیا جاتا کہ وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ۔ کی دعائیں کیسے مستجاب ہوا کرتی ہیں۔ اللہ کسی کی محنت ضائع

نہیں کیا کرتا۔ یہ اس کا وعدہ ہے چنانچہ اس وعدہ کے مطابق وہ ننھا سا پودا جو دنیا بھر کی تیز و تند مخالف ہواؤں کے جھونکوں میں رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے لگایا گیا تھا چند ہی سال کے عرصہ میں ایک شجر طیب کی طرح یوں بڑھا۔ پھولا پھلا کہ اس کی جڑیں تحت الثریٰ میں اور اس کی شاخیں اوج ثریا پر تھیں اور جسے دیکھ دیکھ کر اس جنتِ ارضی کا باغبان وجد مسرت سے جھوم اٹھتا تھا۔

> محمد اللہ کے رسول اور ان کے ساتھی کفار کے مقابلہ میں سخت آپس میں محبت والے۔ تو ان کو دیکھے گا کبھی رکوع کرتے ہیں کبھی سجدوں میں پڑے ہیں اللہ کے فضل و رضا جوئی کی جستجو میں لگے رہتے ہیں ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدات ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ ان کے اوصاف توریت میں ہیں اور انجیل میں ہیں جیسے کھیتی کہ پہلے اس نے اپنی سوئی نکالی پھر وہ درست ہو کر اوپر کو ابھری پھر وہ اور موٹی ہوئی پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی کہ اسے دیکھ دیکھ کر کسان کا دل مسرت سے اچھل پڑے تاکہ اس سے حاسدین جل بھن جائیں۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح کئے مغفرت اور اجر عظیم کا جو وعدہ کر رکھا تھا (وہ یوں پورا کر دیا)۔ (۴۸ : ۲۹)۔

چنانچہ اللہ کے یہ سچے مومن بندے جب بعد میں اپنی دونوں حالتوں کا موازنہ کرتے اور وہ وقت انہیں یاد آتا جب وہ قلیل تھے۔ ملک میں کمزور و ناتوان شمار کئے جاتے تھے اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ مخالف انہیں اچک کر نہ لے جائیں۔ ایسی حالت میں اللہ نے ان کی حفاظت کی اور اپنی مدد سے انہیں قوت دی اور ان کو نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں کہ وہ خدا کے شکر گذار بندے بنیں" (۸ : ۲۶) تو مسرت کے سجدے کرتے جن کی وجہ سے حضرت عمرؓ لوگوں کو اکٹھا کر کے اعلان کرتے کہ

> یہ وادی ضجنان وہی ہے جس میں ایک اونی کرتہ پہنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا وہ سخت مزاج آدمی تھے کام سے تھک جاتا تو تھکا دیتے تھے، کم کام کرتا تو پیٹتے تھے اور آج یہ حالت ہے کہ اس وادی میں میرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی تیسری قوت حائل نہیں۔

لیکن یہ دور جس میں اسلام کا صحیح نصب العین، عبادات کا صحیح مفہوم، اعمالِ حسنہ کی صحیح تفسیر، دنیا اور آخرت کا اصلی تعلق، قرآنِ کریم کا عملی نظام، اسوۂ رسول اللہ کی بین تصویر ہر مسلمان کے سامنے تھی بہت جلد

اس کے بعد؟

ختم ہو گیا۔ خلافت ملوکیت سے بدل گئی اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت (امپیریل ازم) کی تمام خرابیاں ایک ایک کر کے اسلامی کلچر میں نمودار ہو گئیں، اور اس کی انتہا عہدِ عباسیہ میں اس وقت ہوئی جب اسلامی تعلیم کا محض قالب اسلامی تھا اور روح یکسر عجمی ہو چکی تھی حکومت و سرمایہ داری اور ذہنیت سے طبائع عافیت کوش ہو چکی تھیں وہ مجاہدانہ زندگی جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی اصل پہچان تھی اب بیگار کے بھرتی شدہ مستعار طبقہ کا کام سمجھا جاتا تھا۔ گرمجوشی کی وہ فاروقی روح جو خالد ابن ولید کو ریشم میں ملبوس دیکھ کر تمتما اٹھتی تھی (حالانکہ وہ میدانِ جنگ میں تھے اور جنگی ضرورت سے انہوں نے ایسا کیا تھا) اب عہدِ کہن کا افسانہ بن چکی تھی تقسیمِ عمل سے عملی برہمنیت پیدا ہو چکی تھی علما کا طبقہ بجائے نبرد ستان کے بے لفظی تاویلات کی جنگ میں مصروف تھا اربابِ طریقت عجمی تصوف کے تباہ کن نظریہ کے تحت قوائے عملیہ کو مفلوج کر بیٹھے تھے یہ سب سامانِ ہلاکت پہلے سے جمع تھے کہ شامتِ اعمال لے تاتاریوں کے حملہ کی صورت اختیار کی۔ اسلام کی مرکزی قوت فنا ہو گئی، ان کی اجتماعیت بگڑ گئی۔ مذہب کے علمبردار حضرات اب مختلف گوشوں اور زاویوں میں جا دبکے۔ قوتیں سلب ہو چکی تھیں، حوصلے پست ہو چکے تھے۔ دنیا ہاتھ سے نکل گئی عزت و وقار کی جگہ ذلت و پستی آ گئی۔ شوکت و حشمت کی بجائے ذل و مسکنت چھا گئی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، مناسک و شعائر

پھر کیا ہوا؟

کی شکل تو وہی تھی جو عہدِ اولیٰ میں تھی لیکن اب ان کے نتائج وہ نہ تھے جو اس وقت مرتب ہوتے تھے قوموں کی تاریخیں ذہنیت کے بدلنے سے بدل جاتی ہیں اور اس قسم کے موڑ شاہراہِ حیات میں بڑے نازک ہوتے ہیں اگر اس وقت ضمیر یاوری کرتا، ہمارے اعمال کے سزا کی مدت ختم ہو جانے والی ہوتی تو نگاہ اس طرف جاتی کہ یہ تمام عبادات، یہ تمام اعمال، جن کی شکل اسلامی ضرور ہے اس وقت تک حقیقی معنوں میں اعمالِ صالح نہیں ہو سکتے جب تک ان کے نتائج اس حیاتِ ارضی میں وہی کچھ نہ ہوں جو عہد

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ میں ہوئے تھے لیکن جونہی کہ زاویۂ نگاہ اُس طرف بدلا قرآن کریم نے جہاں جہاں کامیابی، فلاح، سرخروئی، فوزِ عظیم، رزقِ کریم، حسنِ مآب مومنین کے لئے مخصوص کیا تھا ان سب کو آخرت کی زندگی سے متعلق کر دیا گیا اور کوئی عمل ایسا باقی نہ رہا کہ جس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی برآمد ہو سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود عقیدہ کی شدت اور صوم و صلوٰۃ، تسبیح و تہلیل کی پابندی کے دنیاوی زندگی روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

زاویۂ نگاہ کی تبدیلی

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

اس وقت بجائے اس کے کہ یوں سمجھا جاتا کہ ان الفاظ و اعمال کی روح ان سے مفقود ہو چکی ہے اس لئے صحیح نتائج برآمد نہیں ہوتے انھوں نے اپنے آپ کو یوں فریب دے لیا کہ یہ تمام اعمال رائگاں نہیں جا رہے لیکن ان کا نتیجہ اخروی زندگی میں برآمد ہوگا۔ غیر مسلم خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے بجائے اس کے کہ ان پر رشک آتا، انھیں اپنے لٹے ہوئے سرمایہ کا غاصب سمجھتے۔ اپنے آپ کو یوں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ابتدا کی زندگی ہے جس میں انھیں مہلت دی گئی ہے اخروی زندگی میں ہم جنت جاودانی اور وہ جہنم ابدی میں جائیں گے۔ عیسائی راہبوں کا فلسفہ ترکِ علائق، یونانی مشائین کی حکمت ترکِ دنیا، ہندو مت کا سنیاس، بدھ دھرم کا مہاتیاگ ایک ایک کر کے اسلامی کلچر میں منتقل ہوتا چلا گیا لہٰذا ترکِ دنیا۔ ترکِ علائق۔ ترکِ لذت حتیٰ کہ "ترکِ ترک" صحیح اسلامی تعلیم کے خدوخال قرار پائے۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانۂ بے عملی کا بنی شرابِ الست
فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ تھا مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

دولت کی فراوانی کے ساتھ اگر خدا فراموشی جمع ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ فساد فی الارض ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ

تمام عالمِ اسلامی میں اس عجمی ذہنیت کے مہلک جراثیم پھیل گئے اور آہستہ آہستہ اسلام کی تمام شوکت وحشمت ذلت ومسکنت میں بدلتی چلی گئی حتیٰ کہ آج حالت یہ ہے کہ وہی قوم جس کے نزدیک خدا کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر کے مترادف ہے یاس وحرمان کا مجسمہ بن کے رہ گئی ہے۔ اور چونکہ وہی تعلیم جو اس واماندگی، ضعف وناتوانی پریشانی وپراگندگی کے عالم میں وضع ہوئی تھی، اصل اسلام بن چکی ہے لہٰذا عوام تو اس نشے میں مست ہیں کہ یہاں جس قدر ہو سکے تباہ حال ہو جائیں جونہی آنکھیں بند ہوئیں۔ ہم جنتِ جاودانی میں جا بیٹھے اور جنہیں مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کا احساس ہے وہ یہ سمجھ کر کہ یہ سب ان کے دین کا نتیجہ ہے اسلام سے بیزار ہو جاتے ہیں دین کے علمبرداروں کو شکایت ہے کہ لوگ بے دین ہوتے جا رہے ہیں اور بے دینوں کو شکوہ ہے کہ یہ دین داران کی دنیا بھی تباہ کر رہے ہیں "مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے" اور نمازیوں کو گلہ ہے کہ ان اماموں میں "وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے" لہٰذا ان دونوں میں ایک ایسی حدِ فاصل یک گہری خلیج حائل ہو چکی ہے کہ دونوں اپنے اپنے شعبوں کو دین اور دنیا کو ناقابلِ انتقال سمجھ کر ایک دوسرے سے الگ ہو بیٹھے ہیں "حامیانِ دین" نے اسی وجہ سے دین کو غریبوں تک محدود کر دیا ہے کہ وہاں ابھی ان کی عزت باقی ہے مسلمان غرباء کے طبقہ

غریبوں کی حالت

کی حالت آج خون کے آنسو رلا دینے والی ہو چکی ہے۔ جن دین کی تمام خدمات کا بوجھ اسی غریب ونادار طبقہ کے سر ہے۔ مولوی آتا ہے اور اپنا خمس وصول کر کے اسے عذابِ قبر اور نارِ جہنم سے بچنے کی دعائیں سکھا کر چلا جاتا ہے۔ شیخِ طریقت اپنا ٹیکس لے کر پاسِ انفاس و ذکرِ خفی وجلی سے روحانیت بڑھانے کا "صراطِ مستقیم" دکھا جاتا ہے۔ واعظ آتا ہے تو قرآنِ کریم کے رزقِ کریم اور حیاتِ طیبہ کے وعدوں کو عاقبت پر اٹھا کر لے تھپک تھپک کر سلا جاتا ہے۔ یاد رکھو وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ

میں نے ایک بہت بڑی مسجد میں جمعۃ الوداع کے وعظ میں خود سنا کہ "امام آخر الزمان کا ظہور اس وقت ہو گا جب مسلمانوں کا زوال وانحطاط اپنی انتہائی حالت کو پہنچ جائے گی چاروں طرف سے مایوسی کی گھٹائیں اٹھ اٹھ کر چھا جائیں گی۔ امید کی کوئی کرن باقی نہ رہے گی۔ اگر اس وقت تک امام صاحب نے نقاب نہیں الٹا تو اسکا سبب

یہ ہے کہ ابھی مسلمانوں کا زوال آخری حد تک نہیں پہنچا۔ جس وقت مسلمانوں کی تباہ حالی اس آخری حد تک پہنچ جائے گی تو آنے والا آئے گا اور تمام روئے زمین پر مسلمانوں کی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔ یہ جو لوگ بظاہر آسودہ حال ہیں ان پر ان محافظینِ دینِ متین اور حامیانِ شرعِ مبین کی نظرِ کرم اس قسم کی ہے کہ [illegible] آپ کو ایسے اشتہارات چسپاں نظر آئیں گے کہ ایک ہزار روپیہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو یہ ثابت کر دے کہ نماز میں آمین بالجہر نہیں کہنی چاہیئے۔ ان متنبیانِ دین نے اپنے اپنے مراکز قائم کر رکھے ہیں۔ معتقدین کا حلقہ گرد ہوتا ہے [illegible] ایسے ہی مجادلات و مباحثات میں صرف کرائے جاتے ہیں جو عقائدِ مخالف کے ائمہ و مشائخ [illegible] جاتے ہیں۔ مقدمے چلتے ہیں دونوں طرف سے ہزارہا روپیہ صرف ہو جاتا ہے۔ دینے والے "فی سبیل اللہ" [illegible] جنت کے خریدار بنتے ہیں۔ لینے والے اپنے جہادِ کبیر کا صلہ سمجھ کر لیتے ہیں اور پھر احسان بھی رکھتے ہیں۔ [illegible] صورت دیکھئے کہ اللہ نے اس سلسلۂ کائنات کو ایک عظیم الشان مقصد کے لئے تخلیق کر کے اسے انسان کے لئے مسخر [illegible] ان انسانوں میں سے امتِ مسلمہ کو خیر امت کہہ کر اس مقصد کی تکمیل کے لئے الگ چن لیا۔ تو کیا وہ مقصد [illegible] نصب العین جو فاطرِ کائنات نے اس اجتباء و انتخاب کے اندر مضمر رکھا تھا اس کا حصول اس کے [illegible] ہو گا کہ نماز میں آمین آہستہ کہنی چاہیئے۔ یا بآواز بلند۔ ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا زیرِ ناف۔ [illegible] کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ دراصل قصور ان کا بھی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جس چیز کو اسلامی تعلیم [illegible] اور جن اداروں میں یہ تعلیم دی جاتی ہے ان کی بنیاد غلط ہے۔ فلاح و سعادت کو محض اخروی زندگی کے ساتھ مخصوص کر دینے سے مطلب ہی یہی ہے کہ اعمال کو نتائج کے اعتبار سے نہ پرکھا جائے بلکہ محض نظری [illegible] جائے یعنی ایمان و اعمالِ صالح کی پہچان حسنِ مآب، نیک انجام، کامیاب زندگی، حیاتِ طیبہ، [illegible] نہ ہو بلکہ ان کی سند اس قسم کے سرٹیفکیٹ ہوں جو مصری خلفاء کے عہد میں ہر مسلمان کو اپنے عقیدہ کے صحیح ہونے کی شہادت میں اپنی جیب میں رکھنے پڑتے تھے۔ قصور سارا اس ذہنیت کا ہے اور جب تک یہ ذہنی تخیل نہیں بدلتا کوئی تبدیلی کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود ایں زمین و آسماں دیگر شود

مذہب پرست طبقہ کی حالت

آپ اس طبقہ کو چھوڑیئے جو اسلامی مناسک و عبادات پر عامل نہیں اس طبقہ کو دیکھئے جو ان عبادات پر کاربند ہے، ان کی دنیاوی حالت کیسی ہے۔ قرآن کریم نے ان ہی لوگوں کو کامیاب کہا تھا۔ قد افلح المومنون (۲۳: ۱-۱۱) انہی کے لئے آیا تھا پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ روز بروز بجائے فلاح و اصلاح ہونے کے ناکام و نامراد ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا محض اس لئے نہیں کہ یہ کامیابی، یہ "فلاح و صلاح" محض آخرت سے منسلک کر دی گئی؟ قرآن کریم نے کہا تھا:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ

كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷: ۲)۔

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح کئے یعنی ایمان لائے اس پر جو محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے جو حق ہے ان کے رب کی طرف سے ان سے ان کی برائیاں دور کر کے ان کی حالت کو بہترین بنا دیا جائے گا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جسے صالح کہا جاتا ہے اس کی زندگی نہایت قابلِ رحم گزر رہی ہے کبھی سوچا بھی کہ یہ کیوں ہے۔ لیکن ان حضرات کو سوچنے کی ضرورت ہی نہیں انہوں نے اپنے آپ کو یہ فریب دے رکھا ہے کہ حالت کی بہتری کا مقام صرف حیاتِ آخرت ہے یہ دنیا نہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ:۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

قرآنِ کریم میں ہے:۔

بداعمال لوگ کیا خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالح کئے کہ ان سب کا مرنا اور جینا، حیات و ممات یکساں ہو جائے یہ بہت برا فیصلہ ہے (جو یہ کئے بیٹھے ہیں)۔ (۴۵: ۲۱)۔

صالح اور غیر صالح کی زندگی

یعنی قرآن کریم کی رو سے ایک مومن و صالح کی زندگی ایک بد عمل کی زندگی کے برابر نہیں بلکہ بہتر اور ذی شان ہونی چاہئے یہ خدا کا فیصلہ ہے اور جو اس کے خلاف سمجھے وہ سراسر غلطی اور گمراہی پر ہے لیکن کیا واقعی آج ان کی زندگی جنہیں مومن صالح کہا جاتا ہے بد اعمال کفار کے مقابلہ میں امتیازی زندگی ہے؟ واقعات تو اس کے خلاف بتا رہے ہیں۔

قرآن کریم نے تو اعمال و ایمان کے صلہ میں رزق کریم، عزت و آبرو کی روزی (۵۰ : ۲۲) دینے کا وعدہ کیا تھا پھر آج یہ کیوں ہے کہ سب سے زیادہ ذلت و رسوائی کی روزی مسلمان کو مل رہی ہے یہ محض زیب داستان نہیں بلکہ ٹھوس حقیقت ہے کہ آج محض روزی کی خاطر مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی ہر دو اعتبار سے ذلت و خواری کی وہ منازل طے کرنی پڑتی ہیں جن کے تصور سے شرافت کی نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری یہ زبون حالی اس لئے ہے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ رکھا ہے بجا اور درست، لیکن اس "اسلام چھوڑنے" کی تفصیل کیا ہے؟ صرف اس قدر کہ لوگ انگریزی پڑھ گئے ہیں ڈاڑھی منڈانے لگ گئے ہیں ان کے ٹخنے ڈھکے رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کے یہ سب انداز درست اور صحیح ہیں جو آپ کے معیار کے مطابق "پکے مومن" ہیں وہ کون سی خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ آپ جس طرح جی چاہے اپنے آپ کو خوش کیجئے لیکن یہ ساری خرابی اس نظریہ کی ہے جو اسلام کے ضعف و انتشار کے زمانہ میں پیدا ہوا اور جس کی رو سے مسلمان کو مسلمان ہونا تو ایک طرف انسان ہونا بھی نصیب نہ ہو سکا اس تمام خرابی کا ایک اور صرف ایک علاج ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو بار بار جگا کر، جھنجوڑ جھنجوڑ کر بتایا جائے کہ یاد رکھو دنیا کی ذلت و خواری خدا کا عذاب ہے

نتائج

یہاں کی شوکت و حشمت کی زندگی عین مومن کی زندگی ہے مسلمان دنیا میں ایک امتیازی زندگی بسر کرتا ہے عزت و وقار، جاہ و حشمت، سربلندی و سرفرازی، اس کے اعمال صالح کے لازمی نتائج ہوتے ہیں لیکن جو اعمال یہ نتائج پیدا نہیں کرتے ان کی صورت کتنی ہی ہو تو ان کی روح مردہ [illegible] جو قوم یہاں ذلیل ہے وہ اس ذلت پر قانع ہے وہ آخرت میں معزز نہیں ہو سکتی جو یہاں موجود [illegible]

ان کی یہ حالت ہو گئی کہ

قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی۔

اگر ان کے اعمال کہیں حقیقی معنوں میں اعمال صالحہ ہو جاتے تو پھر اس جنت ارضی کا پوچھنا ہی کیا

ایسی جنت کہ جس میں اس جہنم کا گذر ہی نہ ہو جس میں یورپ آج گزر رہا ہے اس لئے قرآن کریم کے مطابق ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض یعنی اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام ہے استبداد و ملوکیت کی لعنت نہیں جس میں آج مسلم و غیر مسلم سب حکومتیں گرفتار ہیں۔

یاد رکھئے! جس ایمان و عملِ صالح کا جیتا جاگتا، زندہ پائندہ نتیجہ اس دنیا میں خدا کی بادشاہت کا قیام نہیں یعنی جماعت مؤمنین کا استخلاف فی الارض نہیں ضابطۂ الٰہی کے مطابق جہاں بانی وجہاں داری نہیں وہ ایمان قرآنی ایمان نہیں وہ اعمال اسلامی اعمال نہیں انہیں ایسا سمجھنا نفس کا دھوکا ہے لگاؤ کا فریب ہے مسلمان کے لئے ایمان و اعمالِ صالح کے پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے باقی سب فریبِ نظر ہے ابلیس کے دھوکے ہیں۔

زقرآن پیشِ خود آئینہ آویز — دگرگوں گشتۂ از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را — قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

اپنی آنکھ اور قرآن کی روشنی

(اپریل سنہ ۱۹۳۲ء)

کسی نئی زبان کے سیکھنے میں کس قدر محنت درکار ہوتی ہے۔ لیکن انسان کے بچّے کو دیکھئے، وہ ان دشوار گذار مراحل کو کس آسانی سے عبور کر لیتا ہے۔ بچہ جب بولنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس طرح بات چیت شروع کر دیتا ہے گویا یہ سب کچھ اسے پہلے ہی سے یاد تھا - اس نے اپنے گہوارہ میں خاموش نگاہوں سے سب کچھ سیکھ لیا تھا اور سیکھا اس پختگی سے کہ نہ صرف الفاظ ہی ازبر ہو گئے، بلکہ اس لب و لہجہ کی بھی پوری پوری نقل کرلی جو اس کے ماحول کی فضا کو متحرک کر رہا تھا اور نقل بھی ایسی مکمل کہ دو لفظ بولنے سے معلوم ہو جائے کہ بچہ کس خطہ اور کس تہذیب سے متعلق ہے۔ بڑی عمر میں پہنچ کر جو زبان سیکھی جائے اس میں اہلِ زبان کا لب و لہجہ پیدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے اور ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ یہ پہچانا ہی نہ جا سکے کہ وہ زبان اس کی مادری زبان ہے یا بعد میں سیکھی ہوئی لیکن بچہ اس نقل کرنے میں کمال کرتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ بچہ کا ذہن کس قدر نقش پذیر ہوتا ہے اور وہ نقوش جو بچپن ہی میں اس کے لوحِ قلب و دماغ پر آغوشِ مادر میں منقش ہو جاتے ہیں کیسے محکم اور دیرپا ہوتے ہیں لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بچّے کے دماغ کی یہ غذا اور اثر قبول صرف زبان ہی تک محدود رہتا ہوگا! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دماغ تو بہرحال دماغ ہے جب وہ حروف و الفاظ اور لب و لہجہ کی حرکات و سکنات سے یوں متاثر ہوتا ہے تو گرد و پیش کے دیگر احوال و کوائف سے اثر پذیر کیوں نہ ہوگا! زبان کی اثر پذیری چونکہ الفاظ

کے محسوس پیکر میں ہمارے سامنے آجاتی ہے اس لئے ہم اسے ناپ لیتے ہیں۔ لیکن خیالات کی اثر پذیری بچے کے قلب و دماغ پر غیر محسوس طور پر پرورش پاتی ہے اس لئے ہم اس کا احساس نہیں کرتے۔ مگر ناپ ہیں تو سکتے ہیں جنھوں نے کرنا چاہا انھوں نے ان غیر محسوس خیالات کو بھی ناپ اور تول کر دیکھ

وراثتی اور ماحولی اثرات

لیا علم تجزیہ نفس کی بنیاد بھی اسی اصول پر ہے بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کا بچہ اپنے وراثتی اور ماحولی اثرات کا پیکر ہوتا ہے؛ وہی نقوش و اثرات آہستہ آہستہ محکم نقش بن جاتے ہیں جن پر ان کے نظریاتِ زندگی اور معتقداتِ حیات کی ثریا بوس عمارتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ یہ اثرات جب وراثت و تواتر سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے جائیں تو ان کی ابتداء کتنی ہی غلط نہج پر کیوں نہ ہو رفتہ رفتہ اس قوم کے لئے یہی صداقت و حقیقت کا معیار بن جاتے ہیں جنھیں اس قوم کے فرد انتہائی خوش عقیدگی سے دل کے نازک ترین گوشوں میں چھپائے۔ سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔ یہ غلط نظریات ان کے نزدیک ایسی گراں بہا متاع کی شکل اختیار کر جاتے ہیں کہ ان کا چھوڑنا تو ایک طرف چھوڑنے کے تصور تک سے وہ اس طرح کانپ اٹھتے ہیں گویا ان کی کائنات لٹی جا رہی ہے۔ غلط نظریات و معتقدات کے یہ حسین و دلفریب پردے اتنے دبیز ہوتے ہیں کہ حقیقت شناسی کی استعداد ان کے نیچے دب جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا گلا اس طرح گھٹ جاتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہیں زندہ بھی ہے یا نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان پردوں کو کون اٹھائے؟ اس خاص ماحول میں تو کم و بیش ہر ایک وراثتی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ مبداء فطرت کی ربوبیت نے یہ انتظام اپنے ذمہ لیا کہ وقتاً فوقتاً ایسے پیغامات اس طرف سے آتے رہیں جو وراثت و ماحول کے تمام اثرات سے محفوظ و غیر متاثر ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان پیغاماتِ خداوندی سے ہدایت حاصل کرنے کا طریق کیا ہے اور وہ روش کون سی ہے جس سے اس ہدایت سے مستفید نہیں ہوا جا سکتا۔ اس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ   ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لے ذہن و فکر کی قوتوں کو کام میں لائے۔ ڈھور ڈنگر کی طرح آنکھیں بند کر کے جس ڈگر پر چلے آرہے ہیں اسی پر نہ چلتا جائے اگر

عقل انسانی

انسان نے غور و فکر سے کام لیا تو اس پر ہدایت کی روشنی منکشف ہو جائے گی۔ روشنی سے تو وہی مستفید ہو سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر رکھے۔ آنکھیں بند کر کے دوسروں کی تقلید کے سہارے چلنے والوں کا انجام جہنم ہے فرمایا:-

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝

اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں جنہیں ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا۔ یعنی ان کا بالآخر ٹھکانا جہنم ہے۔ وہ ایسے ہیں کہ ان کے پاس دل ہے لیکن اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ غور و فکر کی قوتوں کو بیکار کر کے چارپایوں کی مانند ہو گئے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ یہی لوگ ہیں جو یکسر غفلت میں ڈوب گئے۔

یہ ہیں وہ بنیادی خطوط جن پر حق و باطل کی کشمکش متشکل ہوتی چلی آرہی ہے۔ یعنی قانون خداوندی کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان (ان قوانین کی روشنی میں) اپنی عقل و فکر سے کام لے اور اس طرح زندگی کی صحیح راہوں پر چلتا جائے۔ اس کے برعکس روایتی اثرات کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان اس دعوت پر غور و فکر نہ کرے بلکہ ضد سے اسی روش پر چلتا رہے جس پر اس کے آباؤ اجداد چلتے رہے ہیں اور جسے وہ وراثتاً اور گرد و پیش کے تابع اثرات کے ماتحت صحیح راہ سمجھ رہا ہے۔ اس کا نتیجہ جہنم ہے اور ہلاکت۔ جس دن سے خدا کا پیغام دنیا میں آنا شروع ہوا اس دن سے آج تک جہل و بصیرت اور تقلید و تجدید کی یہ کشمکش جاری ہے۔ قرآن کریم میں امم سابقہ کے احوال و کوائف بیان کر کے اس حقیقت ازلی کو بے نقاب کیا گیا تاکہ آنے والے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں چنانچہ متعدد آیات میں مذکور ہے کہ

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝ (۷/۱۷۶)

سو اے پیغمبر ان تاریخی سرگزشتوں کو لوگوں سے بیان کر دو تاکہ وہ ان میں غور و فکر کریں۔

تاریخی یادداشت

قرآن کریم کے بیان کردہ امم سابقہ کے ان قصص و حکایات کو سامنے لائیے اور پھر ان پر غور کیجئے آپ دیکھیں گے کہ بار بار اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ آبائی تقلید سے انسان حقیقت کے راستے سے ہٹ جاتے تھے اس کے بعد حضرات انبیاء کرام علیہم کی وساطت سے آسمانی پیغام ان تک آیا لیکن ان میں سے اکثر اس سے محض اس لئے اعراض برتتے رہے۔ پیغام ان کے آباؤ اجداد کی روش کے خلاف ہوتا حالانکہ اس پیغام کی دعوت سراسر عقل و بصیرت اور غور و تدبر پر مبنی ہوتی لیکن وہ لوگ غور و تفکر کے پاس نہ پھٹکتے اور جس راہ پر چلے آرہے تھے اسی پر چلے جانے ہی میں عافیت سمجھتے سب سے پہلے قوم حضرت نوحؑ کو لیجئے ان تک پیغام خداوندی آیا لیکن انھوں نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ۝ (۲۳/۲۴)

ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے ایسی بات کبھی نہیں سنی۔

تقلیدِ آباء

یعنی انکار کی وجہ یہ ہے کہ یہ دعوت ان کے اسلاف کی روش کے خلاف تھی اور انھوں نے اپنے بزرگوں سے کبھی ایسی بات نہیں سنی تھی۔

قوم نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ کی قوم کو لیجئے جب ان سے کہا گیا کہ خدائے قہار کی عبودیت اختیار کرو تو انھوں نے کہا:-

أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا ۔ (۷/۷۰)

کیا تم صرف اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک خدا کی عبادت اختیار کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبودیت ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں۔

وہی سوال کہ جس روش پر اسلاف چلتے آئے ہیں اسے چھوڑ کر اس نئی روش کو کس طرح اختیار کر لیا جائے۔ یعنی اپنے مسلک کی تائید و صداقت میں کوئی دلیل نہیں کوئی برہان نہیں بس دلیل ہے تو فقط اتنی کہ یہ وہ روش ہے جس پر ان کے آباؤ اجداد چلتے آرہے ہیں۔

قومِ ہودؑ کے بعد حضرت صالحؑ کی قوم کو دیکھئے۔ قوم کو اس مردِ صالح سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ یہ ہمارے باپ دادا کی روش پر چل کر ہماری پیشوائی کرے گا لیکن جب اس نے حق و صداقت کی ایسی بات کہدی جو اس کے آبائی مسلک و طریق کے خلاف تھی تو انھوں نے منہ پھیر لیا اور کہدیا کیسا افسوس کا مقام ہے اس شخص سے کتنی امیدیں وابستہ تھیں اور اس نے کس طرح ان سب کو خاک میں ملا دیا۔

قَالُوا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ([illegible])

انھوں نے کہا کہ اے صالح! پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ہم ان معبودوں کی عبودیت اختیار کریں جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آرہے ہیں ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارا دل نہیں ٹکتا۔

ایسا ہی جواب حضرت شعیبؑ کو اپنی قوم کی طرف سے ملا انھوں نے قوم کو اس غلط راستے سے روکا جس پر وہ آبائی تقلید کی رو سے آنکھیں بند کر کے چلے آرہے تھے تو قوم نے جواب دیا:۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ([illegible])

قوم نے کہا کہ اے شعیب! کیا تیری یہ نماز تجھے حکم دیتی ہیں کہ ہمیں کہے کہ ان معبودوں کو چھوڑ دو جن کی عبودیت تمہارے باپ دادا اختیار کرتے چلے آئے ہیں یا یہ کہ یہ تمہارے اختیار میں نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو کرو۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو۔

غور فرمائیے اس جواب سے انکار و اعراض کی راہ اختیار کرنے والوں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح جھلک رہی ہے یعنی ہمارے آباؤ اجداد سب غلط رستے پر تھے اور یہی ایک راہِ راست پر ہے؟ بڑا آیا کہیں سے مقدس آپ! (معاذ اللہ) اسلاف کی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے والوں کی بالکل یہی کیفیت ہو جاتی ہے ان کے قلوب پر بزرگوں کی عظمت و

عقیدت اس درجہ پہنچ جاتی ہے کہ وہ انھیں معصوم و منزہ عن الخطا سمجھنے لگ جاتے ہیں اور یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص ان کی روش کو غلط بتائے۔

یہی کچھ فرعون کی قوم نے کیا جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون ان کے پاس خدا کی کھلی ہوئی نشانیاں لیکر گئے جن کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا تو بالآخر انھوں نے وہی جواب دیا جو اس سے پیشتر آبائی طرز کے مخالف ہر داعی الی الحق کو ملتا چلا آیا تھا۔

قَالُوٓا اَجِئۡتَنَا لِتَلۡفِتَنَا عَمَّا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوۡنَ لَـكُمَا الۡكِبۡرِيَآءُ فِى الۡاَرۡضِ

وَمَا نَحۡنُ لَـكُمَا بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ (۱۰/۷۸)

انھوں نے کہا کہ کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے

اس سے ہمیں ہٹا دو اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کیلئے سرداری ہو جائے ہم تو تمہاری بات ماننے کے نہیں۔

ملتِ حنیفہ کے موسسِ اول حضرت ابراہیمؑ نے بھی جب اپنی قوم کو اس غلط راہ سے روکا جس پر ان کے آباؤ اجداد چلتے آرہے تھے تو انھیں بھی یہی جواب ملا کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا۔

قَالُوۡا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيۡنَ ۝ (۲۱/۵۳)

انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا وہ ان ہی کی پرستش کیا کرتے تھے۔

غرضیکہ جہاں جہاں اور جب کبھی پیغام خداوندی اپنی روشن دلیلوں کے ساتھ پہنچا تو ان لوگوں کی طرف سے جو اپنے آباؤ اجداد کے طور وطریق پر چلے جانے میں ہی عافیت سمجھتے تھے اور ان کے ذہن میں یہ خیال جم چکا تھا کہ ان سے اسلاف کبھی غلطی نہیں کر سکتے تھے انھوں نے ہر جگہ اس پیغامِ حقیقت کی مخالفت کی چنانچہ سورۂ ابراہیم میں تمام اقوامِ سابقہ کے متعلق جامع طور پر فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی روش اختیار کی اور حضرات انبیاء کرامؑ سے یہی کہا۔

تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَصُدُّوۡنَا عَمَّا كَانَ يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا ۔ (۱۴/۱۰)

تم چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی عبودیت ہمارے آباؤ اجداد ختیار کرتے آئے ہیں ان سے ہمیں روک دو۔

قرآن اور اسلاف پرستی

پھر جب ایسا ہوا کہ وحی خداوندی جو پہلے مختلف اقوام و ملل کے پاس قندیلوں کی شکل میں آتا رہا، ایک مہرِ عالمتاب بن کر چمکا تو شپرہ چشم لوگوں نے حسبِ معمول پیغمبر کی مخالفت کی کہ ہم کبھی آنکھیں نہیں کھولیں گے اس لئے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے دیکھا ہے۔

بَلْ قَالُوْا اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۴۳/۲۲)

بلکہ انھوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راہ پر چلتے دیکھا اور ہم ان ہی کے نقشِ قدم پر چلے جا رہے ہیں۔

ایک دیدۂ بینا کے لئے یہ جواب یقیناً حیرت انگیز تھا کہ روشنی آجانے کے بعد اگر معلوم ہو جائے کہ جس راہ پر وراثتی اثرات کے ماتحت چلے جا رہے ہیں وہ راہ ہلاکت و تباہی کے مہیب غاروں کی طرف لئے جا رہی ہے لیکن اس کے باوجود اسی راہ پر چلنے پر اصرار کرنا اور اس کے لئے دلیل یہ لانا کہ ہمارے آباؤ اجداد اسی راہ پر چلا کرتے تھے کھلی ہوئی حماقت نہیں تو اور کیا ہے جس کے متعلق خود خالقِ فطرت نے بتایا کہ ان کی یہ روش کچھ نئی نہیں بلکہ مسخ شدہ ذہنیتوں کا تقاضا ہی یہی ہے جہاں جہاں روشنی آئی ہے اسلاف کی تقلید میں آنکھیں بند رکھنے والے نادانوں نے ہمیشہ اس کی طرف سے منہ موڑا۔

وَكَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ (۴۳/۲۳)

اسی طرح (اے رسول) تجھ سے پہلے بھی جس بستی میں ہم نے کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا تو اس کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک روش پر چلتے دیکھا ہے اور ہم ان ہی کے نقشِ قدم کی پیروی کریں گے۔

جیسا کہ ظاہر ہے یہ دلیل اتنی بودی اور یہ روش ایسی احمقانہ تھی کہ اس کی تردید کے لئے کسی بحث و تمحیص کی ضرورت

ہی نہ تھی۔ اس کے جواب میں اتنا ہی کہا جا سکتا تھا کہ جس روش کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ مسلک تو تمہارے آبائی مسلک سے کتنا ہی بہتر اور محکم کیوں نہ ہو کیا تم پھر بھی اس روش کہن ہی پر چلے جاؤ گے یعنی اگر اس دعوت جدید اور آبائی مسلک کو دلائل و براہین کے ترازو میں رکھ کر تولنے کی کوشش کرو جب تو ہم بتائیں کہ یہ دعوت کس قدر گراں بہا ہے لیکن اگر دلیل فقط اتنی ہو کہ یہ روش چونکہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے یہ بہتر ہی نہ محکم ہے تو اس کا کیا جواب؟

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۴۳/۲۴)

(ان پیغمبر نے) کہا کہ خواہ میں تمہارے پاس اس راہ سے جس پر تمہارے آباؤ اجداد چلتے تھے کہیں زیادہ صحیح راہ لے کر آیا ہوں (تو کیا تم پھر بھی اس پرانی لکیر پر چلتے رہو گے؟) انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس دلیل و حجت تو ہے نہیں لیکن) بات یہی ہے کہ ہم اس پیغام سے انکار کرتے ہیں جسے دے کر تم بھیجے گئے ہو۔

یہی جواب سلسلۂ انبیاء کرام کی پہلی کڑیوں کی طرف سے دیا جاتا رہا اور یہی جواب اس مقدس سلسلہ کی آخری اور مکمل کر دینے والی کڑی کی طرف سے دیا گیا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (۲/۱۷۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے کوئی ان سے پوچھے کہ اگر تمہارے بڑے بوڑھے عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں (تو تم بھی عقل و ہدایت سے انکار کر دو گے؟)

انسانی ضد اور جہالت بے دانشی اور بے راہ روی وراثتی اثرات کے ماتحت اسلاف کی اندھی تقلید کی ہے

داستان ہمارے سامنے ہے جو انسان کی آنکھ کھولنے کے دن سے لیکر حضور خاتم النبیین صلعم کے عہدِ مبارک تک مذکور ہے لیکن کیا اس کے بعد اس بے دانشی اور اسلاف کی کورانہ تقلید کا سلسلہ ختم ہو گیا؟ ختم کیسے ہو سکتا ہے؟ ابلیس نے تو اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لئے مہلت لے رکھی ہے سو جب تک ابنِ آدم دنیا میں موجود ہے ابلیس اور حربے بھی اس کی یاد میں موجود رہیں گے۔ پہلی امتوں میں یہ ہوتا تھا کہ کچھ عرصہ تک لوگ اپنے رسول کے لائے ہوئے پیغام کی اتباع کرتے اس کے بعد جب نفسانی خواہشات ان پر غالب آجاتیں تو وہ رفتہ رفتہ دوسری شاہراہوں پر چل نکلتے۔ شروع میں گمراہی کی یہ روش بالارادہ ہوتی لیکن اس کے بعد آنے والی نسلیں غیر شعوری طور پر اپنے آبا واجداد کے وراثتی اثرات کے تحت اس غیر فطری مسلک کو اختیار کئے جاتیں۔ اس کے بعد ایک دوسرا رسول آجاتا۔ اس سے کہ ان لوگوں نے جہاں اپنے عمل کی راہ بدلی تھی اس کے ساتھ ہی پیغامِ خداوندی میں بھی تحریف والحاق شروع کر دیا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ پیغام حوادثِ ارضی و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتا۔ بہرحال وہ پیغام اپنی اصل شکل میں موجود نہ رہتا اس لئے ایک دوسرا رسول آتا اور نئے سرے سے دعوت کرتا۔ نبی اکرم کے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے کہ خدا

آج کل کی حالت

کا آخری پیغام اپنی اصل شکل میں دنیا میں موجود ہے اور موجود رہے گا لیکن اس پیغام کی محض موجودگی اس بات کی دلیل نہیں کہ جس طرح پہلی قومیں راہِ راست کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ وراثتی اثرات کے ماتحت غلط راستے پر چل نکلیں یہ قوم غلط روش اختیار نہیں کرے گی۔ غلط روش اختیار کرنے کے لئے سینکڑوں محرکات اور ہزاروں اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اس روش سے حفاظت و صیانت کا ایک ہی طریق ہے کہ القرآن لئے ہر ایک قدم کا پیمانہ پیغامِ خداوندی کی روشنی میں بنتا رہے اور جونہی کوئی قدم غلط طریق پر اٹھنے لگے اسے فوراً قرآن کی صراطِ مستقیم کی طرف لے جائے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمان غلط راستے پر پڑ گئے۔ اس سے غرض نہیں کہ فلاں فرقہ غلط راستے پر چلا اور فلاں صحیح روش پر گامزن رہا۔ لیکن بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ایک فرقہ نہیں دوسرا بھی غلط روش پر ضرور پڑ گیا اور پڑ جاتا ہے۔ ملت واحدہ کا فرقوں میں بٹ جانا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ ہر ایک صحیح روش پر نہیں رہا الگ

بات ہے کہ ہر فرقہ یہی سمجھتا ہے کہ میں راہِ راست پر ہوں اور دیگر فریق غلط روش پر ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر پہلی امتوں میں سے کسی امت کی یہی حالت ہو جاتی جو ہماری ہو چکی ہے (اور آج سے نہیں ایک عرصے سے ہو چکی ہے) اور ان کی اصلاح کے لئے کوئی رسول آتا اور خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کرتا تو ان کی طرف سے کیا جواب ملتا؟ وہی جواب جو ملتا چلا آیا ہے یعنی یہ کہ چونکہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم تمہاری نہیں سنتے! اس کے جواب میں داعی الی الحق لاکھ پیغامِ خداوندی کی روشنی کو پیش کرتا۔ لیکن اس کو وہی جواب ملتا جو حضرت صالحؑ کی قوم نے دیا تھا کہ ہاں ہمارے اسلاف سب غلطی پر تھے بس تمہیں ایک راہ راست پر چلنے والے رہ گئے! آج ہماری اصلاح کے لئے کوئی رسول نہیں آسکتا۔ لیکن جو روشنی رسولوں کی وساطت سے ملا کرتی تھی وہ تو ہمارے پاس موجود ہے اب دیکھئے کہ آج بھی جو شخص قرآن کریم کی آسمانی قندیل کو سامنے لاکر قوم کو بتاتا ہے کہ اللہ کی متعین کردہ صراطِ مستقیم کونسی ہے اسے وہی جواب ملتا ہے یا نہیں جو پہلی قوموں کی طرف سے ملا کرتا تھا یعنی یہ کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں وہ کہتا ہے کہ بھائی میں تو کچھ نہیں کہتا۔ کہنے والی تو خدا کی یہ کتاب ہے اس کا کیا جواب ملتا ہے؟ اسی سنگ گنبد کی صدائے بازگشت!! کہ لو بھائی! یہ آگیا کہیں سے بڑا مجتہد! کیا ہمارے بڑے بوڑھے قرآن نہیں جانتے تھے وہ کہتا ہے کہ بھائی! اس میں بحث و جدل اور لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں یہ ہے قرآن اور یہ ہے تمہاری

قرآن میں آبا کی روش

روش۔ تم خود پرکھ کر دیکھ لو کہ یہ روش قرآن کے مطابق ہے یا نہیں اس کا جواب کیا ملتا ہے اور اس تمام مباحثہ و مجادلہ کے پیچھے جذبہ محرکہ وہی "ایمان" کہ ہمارے آبا و اجداد غلطی نہیں کر سکتے تھے وہ معصوم اور منزہ عن الخطا تھے اس میں شبہ نہیں کہ اگر انسان سے کہا جائے کہ تمہارے بزرگ غلطی بھی کر سکتے تھے تو اس سے اس کے جذبات کو بڑی ٹھیس لگتی ہے۔ بالخصوص جبکہ ان بزرگوں کے ساتھ عقیدت و ارادتمندی کے مقدس جذبات بھی وابستہ ہوں یعنی مقدس ہستی اور غلطی؟ توبہ توبہ! یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ لیکن انہیں کون سمجھائے کہ تنقید کی حد سے بالا صرف وحی الٰہی ہوتی ہے۔

انسان سے غلطی کا امکان ہوتا ہے اور غلطی سے کسی انسان کے تقدس اور بزرگی پر کوئی حرف نہیں آ سکتا ہم اپنے ہمعصروں میں غلطی کا امکان تسلیم کرتے ہیں ان غلطیوں پر تنقید بھی کرتے ہیں یہی ہم عصر آیندہ نسلوں کے اسلاف بن جائیں گے اس لئے اسلاف میں غلطی کا امکان نہ ماننا یا انکی تنقید کی حد سے بالاتر سمجھ لینا کس دلیل کے تحت ہو سکتا ہے؟ محض یہ واقعہ کہ ایک شخص ہم سے سو برس پیشتر وفات پا چکا ہے اسے منزہ عن الخطا نہیں بنا سکتا! اس کی تحقیقات کو قرآن کی روشنی میں پرکھ لینے سے اس کی کسی قسم کی تحقیر و تذلیل نہیں ہوتی۔ ہر شخص کا فہم، ادراک، تحقیق اس کے ماحول اور زمانہ سے وابستہ ہوتا ہے اس لئے اگر زمانہ مابعد کا انسان اپنے کسی پیشرو کی تحقیق میں غلطی دیکھے تو درحقیقت اس سے اس پیشرو کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا وہ اپنے زمانہ اور ماحول میں گھرا ہوا تھا اس نے جو محنت کی اور مشقت اٹھائی وہ ہمارے نزدیک درخور تحسین ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی محنت کا ماحصل تمام کا تمام وحی منزل کی طرح واجب التسلیم سمجھ لیا جائے نیز یہ تنقید و تحقیق کسی شخص کی ذاتی رائے کے تابع نہیں ہوگی بلکہ قرآن کریم کے مطابق ہوگی اگر زیر تنقید معاملہ قرآن کے مطابق ہو تو ہو المراد اس کے صحیح تسلیم کرنے میں کسے انکار ہو سکتا ہے اور اگر وہ قرآن کریم کے مطابق نہ نکلے تو اس سے رجوع کر لینے میں کون سی خفت ہو جائے گی قرآن کریم تو وہ نصابِ حیات ہے جس کی اتباع کا حکم خود ذاتِ رسالتمآب کو بھی تھا۔

اِتَّبِعْ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۶/۱۰۶)

اے رسول جو کچھ تیرے رب کی طرف سے دی گئی ہے تم اس کی پیروی کرو۔

اس لئے قرآن کریم کی اتباع میں اگر کسی بڑے سے بڑے بزرگ کا اپنا خیال بھی ترک کر دینا پڑے تو اس میں ذرا سا تأمل نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ حق کو کبھی انسانوں کے ذاتی خیالات کے تابع نہیں ہونا چاہیئے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو کوئی شے اپنی اصل پر قائم نہیں رہنے پاتی۔ آج ہم جادۂ اعتدال سے اس لئے ہٹے ہوئے ہیں کہ ہم نے حق کو انسانوں کی آراء کے تابع رکھ چھوڑا ہے اور یہ سب وراثتی اثرات کے ماتحت غیر شعوری طور پر ہو رہا ہے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۔ اگر حق لوگوں کی خواہشات

تابع ہو جائے تو زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے درہم برہم ہو جائے دین خداوندی کے اکمل و
آخری ہونے کی دلیل ہی یہی ہے کہ حق ہر وقت اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے اس میں کسی قسم کی آمیزش
نہیں ہوئی اور یہی حق ہے جو ہر بات کے پرکھنے کا معیار ہے اسی لئے اسلام کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ اندھی
تقلید کی بنا پر نہیں کیونکہ تقلید میں بصیرت کا کچھ تعلق نہیں ہوتا اور یہ عقل و بصیرت کو اپیل کرنے والی دعوت
حضرت صاحبِ قرآن (صلعم) ہی کا خاصہ و امتیاز نہ تھا بلکہ حضورؐ کے متبعین کی بھی یہی روشِ زندگی بیان ہوئی
ہے ارشاد ہے:۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲)

(اے رسولؐ!) تم کہہ دو کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں اس روشنی (بصیرت) کی بنا پر جو میرے سامنے ہے
اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور میں ہی نہیں جو میری اتباع کریں وہ بھی اسی طرح کی (بصیرت) دعوت دیتے ہیں

فرمایئے کہ جو شریعت معتقدات موروثہ و ماحول کے اثرات کے ماتحت انسان کی بہ حیثیت مذہب کے
تابع اختیار کی جائے اس کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت کیسے قرار دی جا سکتی ہے۔؟

مسلمانوں کی روش

لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمان یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کا تعلق
قرآن کی تنبیہ و تنذیر امم سابقہ سے متعلق یا زیادہ سے زیادہ نبی اکرمؐ کے زمانے کے
منکرین کے متعلق ہے ہم سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں اقوام گذشتہ کے قصص و حکایات
اور احوال و کوائف کا ذکر آیا ہی اس لئے ہے کہ آنے والے ان سے عبرت حاصل کریں لیکن ہم ہیں کہ قدم بقدم امم سابقہ
کے نقوش و آثار پر چلے جا رہے ہیں اور دل میں خوش ہیں کہ ہم اہل حق ہیں مستقیم پگڈنڈی پر ہیں اس کی دلیل یہ ہے
کہ یہ راستہ ہمارے اسلاف کا ہے ذرا غور فرمایئے کہ اگر کسی راہ کی صداقت کی سند یہی کافی ہو کہ وہ اسلاف
سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے تو آپ اپنے زمانے میں پیدا شدہ فرقوں کے متعلق ... فرقوں کی روش ہی کا مذہب

نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ کون سا مسلک و مشرب ہے جو بڑے بوڑھوں سے منتقل ہو کر آیندہ نسلوں کو نہیں ملا لہٰذا حق و صواب کی یہ راہ نہیں کہ اس کے ساتھ اسلاف کے نقوشِ قدم کی سند ہو بلکہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب زندہ اس کی تائید کرے جب قرآن کریم سامنے آجائے تو اس وقت کوئی چیز خواہ وہ تمہارے اپنے علم و عقل کی پیداوار ہو یا اسلاف سے منتقل ہوتی چلی آتی ہو کچھ حقیقت نہیں رکھتی اس وقت حق و صداقت کا تقاضا ہے کہ خدائی سند کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے خواہ اس سے آپ کے اپنے علمی تقاضے کو ٹھیس لگے یا اسلاف کی غلط عقیدت مندی پر حرف کیوں نہ آئے قرآن کریم نے اسی حقیقت کو سورۂ لقمان میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا
أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ (۳۱/۲۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں ہم تو اس روش کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا ہے خواہ ان کی اس روش کے مطابق انہیں شیطان جہنم کے عذاب کی طرف ہی دعوت دے رہا ہو۔

یہ تو ان کی کیفیت ہے جو اسلاف کے نقوشِ قدم پر بلا سوچے سمجھے چلے جاتے ہیں اور نجات و سعادت کی راہ خیال کرتے ہیں اس سے اگلی آیت میں صحیح مسلک کا بیان ہے۔

وَمَن يُسْلِمْ وَجْهَهُ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ
وَإِلَى اللَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۳۱/۲۲)

اور جس نے اپنے آپ کو بہ خلوصِ قلب خدا (کے پیغام) کے سامنے جھکا دیا تو اس نے یقیناً ایک مضبوط شاخ کو پکڑ لیا اور انجام کار سب اللہ ہی کی طرف ہے۔

یعنی دینِ محکم نہ تو یہ ہے کہ تم اپنے خیالات ہی کی اتباع کرنے لگ جاؤ اور نہ یہ کہ جو کچھ اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اسے بغیر دیکھے پرکھے کے اس پر آنکھیں بند کئے چلے جاؤ۔ دینِ قیم یہ ہے کہ اپنے خیالات اور اسلاف کی طرف سے منتقل

ہونے والے معتقدات سب کو قرآنِ کریم کی ترازو میں رکھ دو جو اس پر پورا اترے وہ قابلِ تسلیم۔ جس کا وہاں کچھ وزن نہ ہو بلاتامل رد کر دینے کے قابل۔ یہ وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جسے شکست و ریخت کا کوئی خوف نہیں۔ یہ وہ متاعِ گراں بہا ہے جسے کسی رہزن کا خطر نہیں۔

اس مسلکِ صحیحہ کی اتباع کی ضرورت یوں تو عام حالات میں بھی کچھ کم نہ تھی لیکن اب جب کہ ہمارے سامنے ایک نئی زندگی اور زندگی کی نئی تعبیر آئی ہے جب ہم نے اپنی زندگیوں کے لئے نئے قالب اختیار کرنے ہیں جب اپنے لئے ایک نیا نظامِ حیات مرتب کرنا ہے اس مسلک کی ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس وقت آئینِ نو کی تدوین میں جو مشکل سب سے زیادہ عناں گیر ہو رہی ہے وہ یہی احساس ہے کہ بہت سے عقائد اور احکام جو اسلاف سے متوارث چلے آ رہے ہیں ایسے ہیں جو ہماری نئی زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے لیکن چونکہ انہیں "مذہب" کی مقدس سند مل چکی ہے اس لئے انہیں چھوڑتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس ہو رہی ہے نتیجہ اس کا یہ کہ نہ ان تصورات کو قائم ہی رکھا جا سکتا ہے نہ چھوڑا ہی جا سکتا ہے قائم رکھنے میں زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے چھوڑنے میں "مذہب" کی خلاف ورزی کا احساس دامنگیر ہو جاتا ہے[1]

غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را

لیکن یہ مشکل ہماری اپنی پیدا کردہ ہے حقیقی نہیں اس کا علاج واضح ہے یعنی ہم خدا کی کتاب کو اپنا نصب العین قرار دیں اور اس کے سوا جو کچھ ہمارے قلوب و اذہان پر مستولی ہے اسے اس میزان پر تولیں جو اس پر پورا اترے وہ قابلِ قبول جو پورا نہ اترے وہ جھٹک کر پھینک دینے کے قابل خواہ اس کی نسبت کسی سے بھی کیوں نہ کی جا رہی ہو۔

---

[1] ان امور کی تفصیل "[illegible] نظام"، "مقامِ حدیث"، اور "سلیم کے نام خطوط" میں ملے گی۔

نسخہ اور اس کا استعمال

(اکتوبر ۱۹۵۱ء)

حکیم صاحب کا کمرہ مریضوں سے بھرا رہتا۔ حکیم صاحب باری باری ایک ایک مریض کی نبض دیکھتے شاگرد کو نسخہ لکھوا دیتے۔ مریض آگے بڑھ جاتا اور شاگرد سے نسخہ بھی لے لیتا۔ اور ترکیب استعمال بھی سمجھ لیتا۔ ایک مریض جب نسخہ لے کر جانے لگا تو حکیم صاحب نے خاص طور پر پوچھا کہ ترکیب استعمال سمجھ لی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں! گرم پانی میں آپ کی طرح جوش دیکر چھان کر سوتے وقت پی لینا ہے ایک ہی مرتبہ۔ حکیم صاحب نے سر ہلایا اور کہا کہ ہاں احتیاط سے پینا اور کل صبح آکر اطلاع دینا مرض معمولی تھا۔

حکیم صاحب کا مطب

دوسری صبح مریض پھر آیا۔ حکیم صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور پوچھا کہو کچھ فرق محسوس ہوا؟ مریض نے کہا کہ نہیں حضور۔ کچھ فرق نہیں بلکہ آج تو تکلیف اور بڑھ گئی ہے۔ حکیم صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے۔ ماتھے پر انگلیاں رکھ کر ایک گہری سی سانس لی اور پھر تیز نظروں سے کہا۔ ذرا لاؤ نسخہ دکھاؤ۔

"نسخہ؟" مریض نے کہا، حضور۔ نسخہ تو میں نے جوش دیکر پی لیا۔ نسخہ کہاں سے نکالوں۔ حکیم صاحب نے گھبرا کر آنکھیں اٹھائیں۔ کیا کہا؟ نسخہ پی لیا! "جی حضور۔ نسخہ جوش دیکر چھان کر پی لیا۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھیلی میں رہ گئے تھے ان کو میں نے پھینک دیا تھا۔" حکیم صاحب کا چہرہ دفعتاً تمتما اٹھا۔ غضب

میں بولے "ارے بدبخت۔ ایسا احمق! نسخہ کو جوش دے کر پی گیا!" مریض حیران تھا کہ اس سے کیا خطا ہو گئی اس نے تو بالکل ایسے ہی کیا تھا جیسا اس سے کہا گیا تھا۔ حکیم صاحب نے پھر چلا کر کہا "ارے بیوقوف! کبھی نسخہ کو جوش دے کر بھی پیا کرتے ہیں؟" مریض ابھی تک ششدر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا معمہ ہے؟ حکیم صاحب نے اپنی ڈانٹ کو جاری رکھتے ہوئے کہا "پاگل! نسخہ میں جو دوائیاں لکھی تھیں انہیں دوائی خانہ سے لینا تھا۔ اور وہ دوائیاں جوش دے کر پینی تھیں۔ نہ کہ اس کاغذ کے ٹکڑے کو جوش دینا تھا جس پر دوائیاں لکھی تھیں۔" مریض کو اب معلوم ہوا کہ اس کے مرض میں افاقہ کیوں نہیں ہوا۔

مریضوں کے ہجوم میں ہر شخص اس مریض کی حماقت پر ہنستا ہوا واپس گیا۔ شام تک شہر کے ہر محلے میں نسخہ کے اس انوکھے استعمال کا چرچا ہونے لگا۔ جو سنتا قہقہہ لگاتا لیکن نہ سمجھتا کہ یہ ہنسنا اس مریض پر نہیں خود اپنے آپ پر ہنستا ہے۔ اسے آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک ایسے حکیم مطلق نے نسخہ دیا تھا جس کی حذاقت پر اس کا ایمان ہے

آپ کی اپنی حالت

وہ نسخہ انسانیت کے تمام کہنہ اور پیچیدہ امراض کی مکمل تشخیص کے بعد مرتب ہوا تھا لیکن اس نے اس نسخہ کے ساتھ بعینہٖ وہی کچھ کیا جو مذکورہ صدر مریض نے کیا تھا۔ جس کی حماقت پر یہ یوں ہنستا ہے اس نے اس نسخہ عظیم کو مقدس غلافوں میں لپیٹ کر رکھا۔ کبھی تعویذ بنا کر گلے میں لٹکایا۔ کبھی زعفران اور مشک و عنبر سے لکھ کر دھو دھو کر پینا شروع کر دیا۔ کبھی [illegible] کے نام [illegible] شروع کر دی۔ نتیجہ یہ کہ مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ اور مشکل اندر مشکل یہ کہ جب کبھی کسی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ نسخہ کا استعمال صحیح نہیں ہو رہا تو جھلا کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ پھر طرہ یہ ہے کہ نسخہ کے اس انوکھے استعمال میں کچھ عوام ہی مبتلا نہیں ہیں بلکہ [illegible] ہستیاں بھی جنہیں خود طبیب ہونے کا دعویٰ ہے۔ جس قوم کی حالت یہ ہو جائے اس کی شفایابی کی کیا امید ہو سکتی ہے!! افسوس کہ مسلمان نے یہ سمجھا ہی نہیں کہ وہ نسخہ کیمیا جو کائنات کے حکیم و خبیر نے عطا کیا تھا اس کی عظمت کیا ہے۔ وہ عدیم المثال اور عدیم المرتبت نسخہ جس کے متعلق

قرآن کی عظمت

خود اس حکیم مطلق کا ارشاد ہے کہ:۔

فلا اقسم بمواقع النجوم۔ وانہ لقسم لو تعلمون عظیم۔ انہ لقرآن کریم۔ فی کتاب مکنون۔ لا یمسہ الا المطہرون۔ تنزیل من رب العالمین (۵۶ : ۷۵-۸۰)۔

(اے راہ گم کردہ انسانو!) میں تمہیں اس محدود وسعتوں والے آسمان کے ستاروں کے بلند مقامات کو گواہ ٹھہرا کر کہتا ہوں اگر تمہیں علم ہوتا تو تم سمجھ لیتے کہ یہ شہادت کتنی عظیم الشان شہادت ہے کہ یہ قرآن بڑی ہی قابل قدر و عزت کتاب ہے (جس کے حقائق نظروں سے) چھپے ہوئے صحیفہ میں (بند پڑے ہیں) جن تک پاک دل (اہل) انسانوں کے سوا کوئی پہنچ نہیں سکتا۔ (اس لئے کہ) یہ اس خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے جو تمام کائنات کی پرورش کرنے والا ہے۔

غور فرمایئے رصدگاہِ آسمانی کی بے پناہ بلندیوں کو گواہ ٹھہرا کر بتایا جاتا ہے کہ یہ قرآن کس قدر عظمت و توقیر، عزت و تکریم والی کتاب ہے یہ نسخۂ جنّت کیسا نایاب اور بے مثال اور اپنے اثر و نتیجہ کے لحاظ سے کیسا بالکل یقینی ہے لیکن اس کا اثر اور نتیجہ تو انہیں کے لئے ہو گا جو اسے صحیح طور پر استعمال کریں گے۔ جو اسے جوش دے کر پی جائیں گے انہیں فائدہ تو ایک طرف الٹا نقصان ہو گا۔

وننزل من القرآن ما ہو شفاء ورحمۃ للمؤمنین۔ ولا یزید الظلمین[1] الا خسارا (۱۷ : ۸۲)۔

اور ہم نے جو کچھ قرآن میں نازل کیا ہے وہ ایمان والوں کے لئے یکسر شفا اور رحمت ہے لیکن جو اس کا صحیح استعمال نہیں کرتے ان کے لئے نقصان میں اضافہ کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

قرآن کا صحیح استعمال

قرآن کریم کا صحیح استعمال کیا ہے؟ اس کے لئے صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہے کہ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ زندگی ہے اس ضابطہ کو پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ سمجھ میں آ جائے اور سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ زندگی اس کے مطابق بسر کی جائے لیکن اگر نسخہ کے الٹے استعمال کی طرح اس ضابطۂ زندگی کو بازوؤں سے باندھ لیا جائے۔ گلے میں لٹکا لیا جائے۔ گھول گھول کر پینا شروع کر دیا جائے۔ اس کے الفاظ و حروف کی گنتی شروع کی جائے اور توقع یہ کی جائے کہ جو فوز و فلاح اس ضابطہ کے مطابق

[1] ظلم کے معنی ہیں وضع الشیٔ فی غیر موضعہ المختص بہ (المفردات) کسی شے کا غیر محل استعمال۔

زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہے وہ ہمیں اس تو کے مگر سہل طریقے سے ہی مل جائے تو نتیجہ سوائے خسران کے اور کیا ہوگا۔؟

قرآن ایک عملی تحریک کا بے مثال ضابطہ ہے اور اس کے زندہ و پائندہ، درخشندہ و تابندہ نتائج اسی وقت مرتب ہو سکتے ہیں جب اس کی حامل قوم کا عمل اس کے متعین کردہ نظام کے مطابق ہو نہ یہ کہ اس کے حروف و الفاظ کو گھول گھول کر پیا جائے قرآن کا یہی وہ بے محل استعمال (ظلم) ہے جس کا نتیجہ خسران و افلاس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا اور یہ خود قرآن ہی کا فیصلہ ہے۔

اس سے پیشتر طلوعِ اسلام کے صفحات پر قرآن کریم کے اسی بے محل استعمال کے چند نمونے پیش کئے جا چکے ہیں جو ہمارے علوم دینیہ کے مرکز دیوبند شریف سے شائع ہونے والے رسالہ الخالد سے نقل کئے گئے تھے۔ آج اسی قبیل سے کچھ اور پیش کیا جاتا ہے ان کی اہمیت اس لئے ہے کہ یہ ایک ایسی بزرگ ہستی کے تجویز فرمودہ ہیں جو ہندوستان کے اربابِ شریعت و طریقت میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔ علوم شریعت میں بھی مرجع انام تھی اور رموزِ طریقت میں بھی بے شمار اللہ والوں کے نزدیک منبع فیوض، قرآن کریم کے مفسر و مترجم بے شمار کتب دینیہ کے مصنف اور ایک بہت بڑے آستانہ کے مسند نشین ان کی وفات کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ان کے ارشادات دیکھئے اور پھر خود فرمائیے کہ جب خود ایک حکیم حاذق نسخہ کو چھوڑ کر پیا شروع کر دے اور اسی کی تلقین کرے تو مریضوں کا خدا حافظ!

"اعمالِ قرآنی" — اب ملاحظہ فرمائیے قارئین کی سہولت کے لئے ہر ایک لطیفہ کے بعد ہم نے آیت متعلقہ کا ترجمہ (جس سے مفہوم سمجھ میں آ جائے) قوسین میں لکھ دیا ہے فرماتے ہیں۔

(۱) - فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ط

خاصیت:- یہ آیت پڑھکر خربوزہ یا کوئی چیز کاٹے تو انشاء اللہ تعالیٰ شیریں و لذیذ ہوگی۔

(آیت کا مطلب:- سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ

ایک گائے ذبح کریں انھوں نے سیدھے سادے حکم کی تعمیل میں بیسیوں حجتیں کیں اور بعد مشکل بمشکل اس پر آمادہ ہوئے۔ فذبحوھا ۔ پس انھوں نے ذبح کیا وما کادوا یفعلون ۔ اور ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا کریں یہ تھا قرآن کا مفہوم اور یہ ہے اس آیۂ مقدسہ کا استعمال جسے حکیم الامت نے تجویز فرمایا۔ غالباً لفظ ذبح سے خربوزہ تراشنا لیا گیا ہے۔)

(۲) افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السمٰوات والارض طوعا وکرھا والیہ یرجعون ط

خاصیت۔ اگر سواری کا کوئی جانور گھوڑا اونٹ سواری کے وقت شوخی اور شرارت کرے اور چڑھنے نہ دے تو اس آیت کو تین مرتبہ پڑھ کر اس کے کان میں پھونک دے انشاء اللہ تعالیٰ سیدھا ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب:۔ کیا یہ لوگ اللہ کے قانون کی اطاعت کے علاوہ کوئی اور ضابطۂ حیات اپنے لئے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انہیں دیکھنا چاہیئے کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے طوعاً و کرہاً اس کے (قانون کے) سامنے جھکا ہوا ہے اور سب کی گردشیں اسی محور کے گرد ہیں یعنی سب کائنات کی ہر شے اللہ کے قانون مشیت کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے تو کیا انسان جو خود کائنات ہی کا ایک جزو ہے اپنے لئے قرآن کے علاوہ کوئی اور ضابطۂ زندگی اختیار کرنا چاہتا ہے)

(۳) انی توکلت علی اللہ ربی وربکم ما من دابۃ الا ھو اٰخذ بناصیتھا ان ربی علی صراط مستقیم ط

خاصیت۔ اگر کوئی لونڈی یا غلام سرکش ہو تو بال پیشانی کے پکڑ کر تین مرتبہ اس کو پڑھے اور اس پر دم کرے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۔ بعدار اور مسخر ہو جائے گا۔

(آیت کا مطلب:۔ میں اس اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں۔ جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے (اور جس کا قانون کائنات میں یہ حکم گیر ہے) کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جسے وہ پیشانی سے پکڑ کر اس سے مواخذہ نہ کرے یقیناً میرا رب ایک متوازن روش راستہ پر ہے یعنی اللہ کے قانون مکافات عمل کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

(۴) کلبھم باسط ذراعیہ

خاصیت۔ اگر راستہ میں کوئی شیر یا کتا حملہ کرے اور شور مچا دے تو فوراً اس آیت کریمہ کو پڑھ لے چپ ہو جائیگا

(آیت کا مطلب: ۔ سورۃ کہف میں ہے کہ اصحابِ کہف کا کتا اپنے بازو پھیلائے غار کے منہ پر بیٹھا ہے آیت اور خاصیت کا باہمی ربط ظاہر ہے)

(۵) اذا السماء انشقت ہ واذنت لربہا وحقت ہ واذا الارض مدت ہ والقت ما فیہا وتخلت ہ

خاصیت: ۔ ان آیتوں کو لکھ کر [illegible] ولادت کی آسانی کے لئے بائیں ران پر باندھ دے۔ انشاء اللہ تعالیٰ [illegible] آسانی سے ولادت ہوگی مگر بعد ولادت تعویذ کو فوراً کھول دینا چاہیئے۔ اور اس عورت کے سر کے بال کی دھونی مقام خاص پر دینا مفید ولادت ہے۔

(آیات کا مطلب: ۔ یہ سورۃ انشقاق کی آیات ہیں جن میں قیامت کی نشانیوں کا ذکر ہے ترجمہ یہ ہے ” جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کا حکم سن لے گا اور وہ اسی لائق ہے اور جب زمین کھینچ کر بڑھا دی جائے گی اور زمین اپنے اندر کی چیزوں کو اگل کر خالی ہو جائے گی “ ربط ظاہر ہے)

(۶) اگر درد زہ سے تکلیف ہو تو عورت موطا امام مالکؒ (مجموعہ احادیث) پر ہاتھ رکھے فوراً ولادت ہو جائے گی

(۷) فسیکفیکہم اللہ وھو السمیع العلیم ہ

خاصیت: ۔ جس سے حاکم ناراض و خفا ہو وہ اس آیت کو پڑھ کرے یا لکھ کر بازو پر باندھے انشاء اللہ تعالیٰ حاکم مہربان ہو جائے گا (مطلب: اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو تسلی دی ہے کہ ان سرکش مخالفین کی فتنہ انگیزیوں سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں اللہ ان سب کے خلاف تیرے لئے کفایت کریگا وہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے)

(۸) جو شخص ساتوں حٰم کو پڑھا کرے اس پر دوزخ کے ساتوں دروازے بند ہو جائیں گے۔

(۹) ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو ج عالم الغیب والشہادۃ ج ھو الرحمن الرحیم ۔

خاصیت: ۔ اسم اعظم اس میں مخفی ہے جو کوئی صبح کے وقت سات مرتبہ پڑھے تو شام تک اس کے واسطے فرشتے دعائے مغفرت کریں اور اگر اس دن میں مرے تو شہید کا درجہ پائیگا اور اگر شام کو پڑھے تو صبح تک یہی ہو سکے

فرشتے دعائے مغفرت کریں۔ اور جو اس شب میں مرے تو درجہ شہادت کا پاوے۔

(ترجمہ: اللہ کی ذات وہ ہے کہ جس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں وہ غیب و شہادت کا جاننے والا اور رحمٰن و رحیم ہے)

(۱۰) القیوم۔

خاصیت: اس کی کثرت سے نیند آتی ہے۔

(القیوم یعنی دنیا کو قائم رکھنے والا۔ جسے قیام و بقا کے لئے کسی آسرے کی ضرورت نہ ہو۔ غالباً نیند کی طرف خیال اس لئے گیا کہ القیوم کے بعد ہے کہ اسے نیند ہو سکتی ہے نہ غنودگی۔ حالانکہ القیوم کی تاثیر تو سونے والوں کو بھی بیدار ہو جانا چاہیئے)

(۱۱) المغنی۔

خاصیت: اگر مشغولی جماع کے وقت خیال سے پڑھے تو بیوی اس سے محبت کرنے لگے (المغنی سب سے بے نیاز اور سب کا حاجت روا۔)

(۱۲) الرحمٰن الرحیم۔

خاصیت: اگر کسی مطلوب کا نام مع نام والدہ کے لکھے اس کی محبت میں سرگرداں ہو بشرطیکہ جائز محبت ہو۔

(۱۳) انا للہ وانا الیہ راجعون ط

خاصیت: اگر یہ آیت پڑھ کر گم ہوئی چیز کی تلاش کی جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ ضرور مل جائے ورنہ غیب سے کوئی چیز اس سے عمدہ ملے گی۔

(مطلب آیت: قرآن کریم میں مصائب و مشکلات پر استقامت کی تلقین کے بعد فرمایا کہ جماعت مومنین کا منشا یہ ہونا چاہیئے کہ ہماری تمام سرگرمی بحیثیت کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے اور ہماری تمام زندگی کی تمام سرگرمیاں اسی کے قانون کے محور کے گرد گھومتی ہیں)

(۱۴) یاایھا الناس اتقوا ربکم ان زلزلۃ الساعۃ شیء عظیم ۰

خاصیت :۔ حفظ حمل کے لئے مفید ہے۔

(مطلب: اے لوگو! اپنے رب کا تقوی اختیار کرو۔ یقیناً قیامت کا زلزلہ ایک عظیم شے ہے)

(۱۵) اگر پوری سورۃ لیح سوتے وقت پڑھ لی جائے تو احتلام سے محفوظ رہے گا۔

ایک اور لطیفہ اتنے ہی ارشادات کافی ہیں زیادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ورنہ کتاب میں تو بڑے بڑے دلچسپ خواص لکھے ہیں ان وظائف وغیرہ کا نام رکھا جاتا ہے قرآن کے کمال۔ حالانکہ قرآن کا عمل تو صرف وہی عمل کہلا سکتا تھا جو قرآن کے احکام کی اتباع میں ہو۔ ویسے مؤلفِ کتاب نے ایک اور دلچسپ لطیفہ بھی لکھا تھا۔

احقر کو حضرت مرشدی...... نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر کوئی حاجت مند تعویذ وغیرہ لینے آوے تو انکار مت کیا کرو چنانچہ احقر کا معمول ہے کہ اس حاجت کے مناسب کوئی آیت قرآنی یا دعا لکھ کر دیدیتا ہے اور بفضلہ تعالیٰ اس میں برکت ہوتی ہے چنانچہ ایک بی بی کی نگ باوجود کوشش بسیار کے بھی نہ نکلتی تھی احقر نے کہا اھدنا الصراط المستقیم پڑھ کر انگشتری کا لو چنانچہ اس کے پڑھتے ہی نگ بے تکلف سیدھی نکل آئی۔ احقر نے یہ حکایت اس لئے عرض کی ہے کہ اور کوئی صاحب بھی اس معمول کو اختیار کرے تو امید نفع اور برکت ہے۔

غور فرمائیے! ان "اعمالِ قرآنی" نے خود قرآنِ کریم اور اس پر ایمان رکھنے والوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے اس زندگی میں فراخیٔ رزق، نیک اولاد، دشمن پر غلبہ، عزت کی زندگی، شیطان سے دوری، غیبی خزانوں کا علم، چوری سے حفاظت، ادائیگی قرض، جملہ جسمانی امراض سے شفا۔ اور آخرت میں جنت، شہادت کا مرتبہ، حضور کی شفاعت، دوزخ سے نجات، غرضیکہ اس زندگی اور آیندہ زندگی میں جس چیز کی بھی تمنا کی جا سکتی ہے وہ چند اوراد و وظائف کے پڑھنے سے یا اگر پڑھ نہ سکتا ہو تو لکھ کر چاٹ لینے سے یا بازو پر باندھ لینے سے بغیر مشروط طور

پر گارنٹی دی گئی ہے اور کوئی ایسی ضرورت باقی نہیں رکھی گئی جس کے لئے قرآنِ کریم کو ضابطۂ حیات بنایا جائے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک اس قسم کے اعمالِ قرآنی جو محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کا ضابطۂ زندگی بنے تھے کچھ پیچیدہ اور لمبے راستے ہیں اس لئے ان کی جگہ اس زندگی میں کامیابی اور آخرت میں سرفرازی کے لئے (Short Cut) قرآن کی آیات کے ان "باطنی معانی" میں مضمر ہے جن پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسی صبر آزما مرحلہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور یوں مفت میں بیٹھے بٹھائے جنت مل جاتی ہے۔

بہشتے بہرِ اربابِ ہمم است بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش بہشتے فی سبیل اللہ ہم است
(اقبالؒ)

اثر کس طرح ہوتا ہے

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! ان اوراد و وظائف کو خود کر کے دیکھئے ان میں واقعی اثر ہوتا ہے۔ یہ اثر اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ قرآن کی آیت کا کیا گیا ہو جو لوگ قرآنِ کریم سے واقف ہی نہیں اور کھلا ہوا شرک کرتے ہیں وہ بھی ایسے ایسے اعمال کرتے اور بتاتے ہیں جو تاثیر کے اعتبار سے ان اوراد و وظائف قرآنی سے بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں۔ کیونکہ تاثیر زیادہ تر عمل کرنے والے کی فنی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے اس (Phenomenon) کا تعلق علم النفس (Psychology) سے ہے ایک خاص طریقہ سے جن الفاظ کو بھی بطور وظیفہ پڑھئے یا لکھئے اس قسم کے اثرات پیدا ہو جاتے ہیں تفصیل اس اجمال کی طویل ہے جسے ہم انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر پیش کریں گے۔ اس وقت تو صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ کس طرح نسخۂ کیمیا اکسیر ایک مستقل طبیبِ مطلق کے بتائے ہوئے علاج سے باز رکھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وارثینِ کتاب کی وہ جماعت جسے دنیا کی امامت کیلئے پیدا کیا گیا تھا آج دنیا میں سب سے پیچھے ہے ان کی وہ ملی قوتیں جو ایشیا اور دنیا کے سخت سے سخت مقابلہ میں سینہ سپر کر دیا کرتی تھیں مفقود ہو چکی ہیں قرآنِ کریم کی برکت سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن اس کی برکت اس پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہوتی ہے جھاڑ، پھونک اور گنڈے تعویذ سے برکت حاصل کرنے کا ذکر قرآن میں تو کہیں بھی نہیں۔ یہ سب نفسی اثرات کا نتیجہ ہے۔

[خدا اور انسان کے تعلق کے متعلق اہم مباحث!]

(دسمبر ۱۹۲۹ء)

سامنے میز پر گھڑی رکھی تھی شیشہ ٹوٹا ہوا اور منٹ کی سوئی غائب۔ گھنٹے کی سوئی پر میری نگاہ تھی اور میں ایک گہری سوچ میں ڈوبا ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا مجھے اس میں کوئی حرکت محسوس نہ ہوئی لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک سے دو اور دو سے تین پر جا پہنچی میں نے سوچا کہ بعض تغیرات ذہن انسانی میں بھی کچھ ایسے تدریجاً اور غیر شعوری طور پر رونما ہوتے ہیں کہ جب تک ان کا مجموعی اثر ایک نمایاں انقلاب کی شکل میں ظاہر نہیں ہو جاتا محسوس ہی نہیں ہونے پاتا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ عمل میں آرہا ہے ذہنی انقلاب کے یہ تخریبی اور تعمیری مراحل دریا کی پرسکوت روانیوں کی طرح کچھ ایسے غیر مرئی طور پر طے پا جاتے ہیں کہ جو خطوط ابتدا از نقوش بر آب سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے ہوں وہی ایک عرصے کے بعد ایک محکم حصار سنگین کی بنیادیں بن جاتے ہیں تاریخ انسانیت میں اس قسم کے غیر محسوس اور غیر مرئی تغیر و تبدل کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے آسکتی ہیں لیکن جو انقلاب اسلام کے متعلق مسلمانوں کے ذہن میں رونما ہوا ہے شاید ہی اس کی نظیر کہیں مل سکے۔ اسلام بحیثیت مجموعی انسانیت کا ایک مکمل نظام حیات تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ ایک عالمگیر روحانی نظام

انتہائی ذلت ہے کہ انسان اپنے جیسے انسانوں کا محکوم ہو جائے۔ محکوم اس کا ہونا چاہیئے جو اپنے سے بلند و بالا ہو اور انسان سے بلند صرف خدا کی ذات ہے۔ ہر رسول کا یہی پیغام اور ہر نبی کی یہی تعلیم تھی۔ سب سے پہلے یہ پیغام خداوندی اور یہ تعلیم عظیم ایزدی تھی حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ

کہ خدا کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔

یہی حضرت ہودؑ نے فرمایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

کہا کہ اے میری قوم! اللہ کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ (حاکم) نہیں۔

انبیاء کی تعلیم

انہی الفاظ میں حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو پیغام خداوندی پہنچایا۔ انہی میں حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔ حضرت یوسفؑ نے قید خانہ کی چار دیواری میں جو وعظ فرمایا وہ خدا اور بندے کے اسی تعلق کو واضح کرنے کے لئے تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھی قیدیوں سے پوچھا کہ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ کیا الگ الگ آقاؤں کا ہونا اچھا ہے یا اللہ کا جو یگانہ ہے اور سب پر غالب ہے؟ اس کے بعد فرمایا کہ تم لوگوں نے جن کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے انہیں کوئی حق نہیں کہ تم کو اپنا غلام اور محکوم بنائیں۔ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے ہیں جیسے تھیٹر کے تماشہ میں کسی کا نام بادشاہ رکھ لیا جاتا ہے کسی کا نام وزیر حالانکہ وہ فی الحقیقت بادشاہ یا وزیر نہیں ہوتے۔ یاد رکھو۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ

حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔

اس کے بعد جو کچھ فرمایا اس سے عبادت کا مفہوم بالکل نمایاں ہو جاتا ہے۔

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نظامِ اطاعت (دین) چھوڑ کر کوئی دوسرا نظام تلاش کر لیں؟

حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے خوشی سے یا مجبوری سے سب اسی کے قوانین کے فرمان بردار

ہیں اور ان کے نتائج بھی سب آخرکار اسی [illegible] کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں۔

ایک ہی نظامِ اطاعت

یعنی یہ نظامِ حکومت اپنے عین تقاضائے فطرت ہے۔ کائنات کی ہر شے اللہ ہی کے ضابطۂ قوانین کے تابع اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرم ہے کوئی شے اس کی محکومیت سے سرتابی کر سکتی ہے نہ کسی دوسرے کی محکومیت اختیار کر سکتی ہے جب کائنات کی ہر شے کی یہی فطرت اور یہی آئین ہے تو پھر انسان کے لئے کوئی دوسرا آئین حکومت اور نظامِ اطاعت (دین) کیوں ہو۔ اگر انسان کوئی دوسرا نظام اختیار کریں گے تو اس غیر فطری نظامِ زندگی کی سزا بھگتیں گے اللہ کے میزان میں ان کی یہ روشِ زندگی ناقابلِ قبول ہوگی

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (۳/۸۵)

اور جو کوئی اسلام (نظامِ حکومت خداوندی) کے سوا کوئی اور نظامِ اطاعت (دین) کا

خواہشمند ہوگا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

خدائی اطاعت و محکومیت کے علاوہ کوئی اور نظامِ اطاعت و حکومت جس قدر [illegible] ہیں قرآن کی اصطلاح میں [illegible] الطاغوت [illegible] نظام [illegible] زندگی [illegible] طاغوت [illegible] زندگی کا قرار دے کر خدائی نظامِ اطاعت کا انکار دین قیمہ ہے۔

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)

اور جس نے طاغوت کی اطاعت سے منہ پھیر لیا اور اللہ پر ایمان لایا تو اس نے ایک مضبوط [illegible] کو

پکڑ لیا جو ٹوٹ نہیں سکتی۔

آخرت پر ایمان کا مفہوم

یہ خدا کا اقرار اور غیر خدا کا انکار ہے۔ خدا کے اقرار سے مطلب یہ ہے کہ اطاعت صرف اس کے قانون کی کی جائے۔ اور اس کے قانون کی اطاعت اُس نظام کے ذریعے ہوتی ہے جو ان قوانین کے نفاذ کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ
تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيلًا (۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کے نظامِ حکومت کے مرکز (خدا اور رسول) کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے اس مرکز کے صاحبِ اختیار بنائے ہوں پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں اور ان صاحبانِ اختیار میں اختلاف پیدا ہو جائے تو چاہئے کہ مرکزِ نظامِ خداوندی کی طرف رجوع کرو۔ اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی بات تمہارے لئے بہتر ہے اور اسی میں انجام کار کی خوبی ہے۔

یعنی خدا اور آخرت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ تم خدائی نظام کی اطاعت اختیار کرو اور اپنے تمام اختلافات و نزاعات کے رفع کرنے کے لئے اسی مرکزِ اطاعت و تسلیم کی طرف رجوع کرو۔ خدا پر ایمان لانے سے خدا اور بندے کے درمیان یہی تعلق پیدا ہونا چاہئے یعنی حاکم و محکوم کا تعلق۔ نہ یہ کہ خدا کو ایک پرستش کی شے (Object of worship) سمجھ کر اس کی پوجا کر لی اور اپنے معاملات میں غیر خدائی نظام کی طرف رجوع کیا۔ یہ تو خدا کے بجائے طاغوت پر ایمان کے مترادف ہے جس سے انکار کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ آیت مندرجہ صدر سے اگلی آیت میں فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ
يُرِيدُونَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوٓا اِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ اُمِرُوٓا اَنْ يَّكْفُرُوا بِهٖ وَيُرِيدُ الشَّيْطٰنُ
اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيدًا - (۶۰)

ہوتے ہیں اس لیے قرآن کریم نے جہاں خدا کی عبادت (محکومیت) کا حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی شیطان کی عبادت (محکومیت) سے منع کیا ہے۔

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ (۳۶/۶۰-۶۱)

اے نوعِ انسانی! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبودیت اختیار مت کرو۔ یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور یہ کہ صرف میری ہی عبودیت اختیار کرنا۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔

شیطان کی پرستش

یہاں عبادت کا مفہوم بالکل واضح ہے اگر (لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ) کے معنی یہ لئے جائیں کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا تو اس سے مطلب کچھ نہیں نکلتا۔ اس لئے کہ دنیا میں کون ہے جو شیطان کی پرستش (Worchip) کرتا ہے۔ شیطان [illegible] نظام مانے جاتے ہیں طاغوتی نظام کی اطاعت اختیار کی جاتی ہے لیکن شیطان کی پرستش کہیں نہیں ہوتی۔ عراق میں موصل کے قریب ایک باطنی قسم کے فرقے (یزیدی) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں لیکن تحقیقات نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ بھی درحقیقت شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس کے خوف کی وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے ان کا عقیدہ ہے کہ خدا تو رحیم و کریم ہے اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں لیکن شیطان سے ضرور ڈرتے رہنا چاہیے کہ وہ بڑا نقصان پہنچا سکتا ہے وہ اسے شیطان نہیں کہتے بلکہ اس کا نام ملک طاؤس [illegible] غالباً شیطان کے حضرت آدم کو سجدہ نہ کرنے کی [illegible] ہے بہرحال مقصد یہ تھا کہ شیطان کی پرستش (پوجا) کوئی نہیں کرتا۔ اس لئے لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ سے

ایک [illegible]

[illegible]

[illegible]

زیادہ سے زیادہ یہی کہے گا کہ میں نے اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کر دی، مالک مجھ سے خوش ہو جائے گا چنانچہ یہی جواب ہمارے ہاں کے "عبادت گذار" بندوں کی طرف سے ملتا ہے۔ جب ذرا زیادہ کرید کر پوچھئے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے ثواب ملتا ہے اور جب پوچھئے کہ ثواب سے کیا حاصل ہوتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے نجات مل جاتی ہے انہیں کچھ علم نہیں ہوتا کہ ثواب کسے کہتے ہیں اور نجات سے کیا مفہوم ہوتا ہے۔ آپ نے بھی

ثواب کے معنی

ہزار مرتبہ ثواب کا لفظ سنا ہوگا اور خود بھی بولا ہوگا ذرا سوچئے تو سہی کہ اس سے آپ کی مراد کیا ہوتی ہے۔ اور اگر آپ سے کوئی کہہ دے کہ صاحب! "ثواب" کا لفظ عربی زبان کا ہے، اس کی جگہ اپنی زبان کا کوئی لفظ استعمال کر دیجئے تاکہ ہماری سمجھ میں آ جائے کہ ثواب سے مفہوم کیا ہے تو آپ اس کی جگہ دوسرا لفظ نہیں استعمال کر سکیں گے ایک لفظ تو کیا، ایک فقرہ میں بھی آپ اس کا مفہوم نہیں سمجھا سکیں گے اس لئے کہ اس کا کوئی متعین مفہوم خود آپ کے ذہن میں بھی نہیں۔ ثواب کسے کہتے ہیں، نجات سے مفہوم کیا ہے؟ ان امور کے لئے متعلقہ مقامات دیکھئے اس وقت صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ جب دین کا نظام متشکل ہوتا ہے تو دین کی ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن جب دین مذہب سے بدل جاتا ہے تو یہ اصطلاحات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ خدا اور بندے کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اگر صرف اسی ایک نکتہ کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جائے گی کہ اس باب میں اسلام نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ دنیا کے فکر و عقیدہ میں کہیں اور نہیں ملتا یعنی اسلام نے خدا اور بندے کے تعلق کا جو تصور دیا ہے وہ دیگر تصورات سے یکسر الگ اور ارفع و اعلیٰ ہے جس کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔ وہ تصور ان دو الفاظ میں سمٹا ہوا ملے گا جو نبی اکرم کی زبان مبارک پر وفات کے وقت آخری الفاظ تھے "ھو الرفیق الاعلیٰ" یعنی خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے لیکن ایسی رفاقت جس میں خدا کی حیثیت رفیق اعلیٰ کی ہے اور انسان کی حیثیت رفیق ادنیٰ کی لیکن تعلق بہرحال رفاقت کا ہے۔ سارا قرآن اسی تعلق کی تفسیر ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا خدا اور انسان کا یہ تعلق آپ کو کہیں اور بھی ملتا ہے؟ دنیا کے افکار و مذاہب پر نگاہ دوڑا کر دیکھئے یہ تصور آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔

ظہور میں آتی ہے اس طرح مختلف حوادث کے لئے مختلف شئون الٰہیہ کا ظہور ہوتا ہے لیکن ایک خاص حادثے کے لئے جس قسم کی صفت (شان) کا ظہور ایک مرتبہ ہوتا ہے اس قسم کے حادثہ کے لئے ہر مرتبہ اسی قسم کی صفت کا ظہور ہوتا ہے اس التزام و استمرار کو سنت اللہ کہتے ہیں اس کا نام قانون الٰہیہ ہے جس کا وہ حصہ جو ہمارے حیطۂ ادراک میں آجاتا ہے قانون فطرت کہلاتا ہے اور جو حصہ ماورائے فطرت یعنی عالم امر سے متعلق ہے قانون مشیت کہلاتا ہے۔

سنت اللہ

یہ کچھ عالم آفاق (نظام فطرت) میں ہو رہا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ نوع انسانی کو اپنا تمدنی نظام بھی اسی نہج و اسلوب سے چلانا چاہیے جس انداز و طریق پر نظام فطرت چل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسانی نظام تمدن و معیشت میں کوئی حادثہ یا واقعہ رونما ہوتا ہے تو انسانی طبائع اس پر ایک خاص انداز سے (Re-act) کرتی ہیں یہ ردعمل (Re-action) چونکہ تابع ہوتا ہے ذاتی مصالح و منافع کے، اس لئے مختلف انسانوں کا ردعمل مختلف ہوتا ہے یا انسانوں کے ایک ہی گروہ کا مختلف واقع پر ردعمل مختلف۔ قرآن کی رو سے اس کا نتیجہ فساد فی الارض (تمدنی زندگی میں ناہمواری) ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ جس طرح نظام فطرت میں ایک حادثہ یا واقعہ پر ایک خاص قسم کا ردعمل ہوتا ہے اور اس میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا (ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا) اسی طرح تمہارے اجتماعی نظام میں بھی ایک حادثہ یا واقعہ پر ایک ہی قسم کا ردعمل ہونا چاہیے اب سوال یہ ہے کہ یہ ردعمل کس قسم کا ہونا چاہیے قرآن کہتا ہے کہ نظام فطرت میں ایک حادثہ پر جس قسم کی صفت خداوندی کا ظہور ہوتا ہے انسانی نظام تمدن و معیشت میں اس قسم کے حادثہ پر اسی قسم کی صفت کا ظہور انسانوں کی طرف سے ہونا چاہیے اگر ایسا ہو تو یہ ردعمل سنت اللہ کے مطابق ہوا اور جب یہ ردعمل پورے التزام و استمرار سے ظہور میں آنے لگ گیا تو سمجھو کہ تم میں صفات خداوندی منعکس ہو گئیں اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "خدا کے رنگ" میں رنگے جانا ہے، صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ (عربی زبان میں [illegible] کہتے ہیں کسی شے کو [illegible] یا اونٹ کو سدھا کر سواری کے قابل

بنانا جسے انگریزی میں (Harnessing) یا (Breaking) کہتے ہیں بندؔ

عبادت سے معنی اپنی شخصیت کو قوانینِ خداوندی کے قالب میں ڈھالنا ہیں اس کو صبغۃ اللہ کہتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ کائنات کے ایک حصہ (نظامِ طبعی) میں خاص حوادث و وقائع پر خاص شئون الٰہیہ (صفاتِ خداوندی) ظہور میں آ رہی ہیں جس سے حق (تعمیری پہلوؤں) کے غلبہ سے کائنات اپنے مقصود و منتہیٰ کی طرف چلے جاتی ہے اس کے دوسرے حصہ (یعنی انسانی نظامِ تمدن و معیشت) میں اس قسم کی صفات کا ظہور بشریت کے اندر انسان کی طرف سے ہو رہا ہے جس سے انسانیت اپنی ارتقائی منزل طے کرتی اپنے منزلِ مقصود کی طرف بلند ہوتی جا رہی ہے یہ ہے خدا اور بندے کی رفاقت اس میں خدا رفیقِ اعلیٰ ہے کیونکہ مستقل قانون (سنت اللہ) اسی کا ہے انسان اس کے قانون کی اتباع کرتا ہے یعنی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے آگے آگے خدا (کا قانون) صراطِ مستقیم پر جا رہا ہے (اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۶﴾ یقیناً میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے) اور اس کے پیچھے پیچھے اھدنا الصراط المستقیم کی آرزوؤں کو عمل میں لانے والا انسان اسی راہ پر جا رہا ہے اور اس طرح عالمِ آفاق اور جہانِ انسانیت دونوں اپنی منزل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو یہ کس طرح معلوم ہو کہ فلاں قسم کے حادثہ یا واقعہ پر خدا کی کس صفت کا ظہور ہوتا ہے تاکہ اس کی طرف سے بھی ہر اس قسم کے حادثہ یا واقعہ پر اس قسم کی صفت کا ظہور ہو یہی وہ مقام ہے

وحی کی راہنمائی

جہاں انسان وحی کا محتاج ہوتا ہے اس چیز کو خدا نے خود بتا دیا قرآن میں اسمائے حسنہ (مختلف صفات و شئونِ الٰہیہ) کا ذکر اسی مقصدِ جلیلہ کے لئے آیا ہے کہیں لفظ کے پیرایہ میں اور کہیں نظامِ فطرت یا اممِ سابقہ سے متعلق حوادث و وقائع کے سلسلہ میں، خدائی فیصلوں کی صورت میں قرآن میں غور و فکر سے یہی حقیقت انسان کے سامنے آتی ہے ان چیزوں کو بھی قرآن بلا دلیل و برہان پیش نہیں کرتا وہ بار بار نظامِ فطرت اور احادیثِ اممِ سابقہ (تاریخی یادداشتوں) پر تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے وہ ان کے

ؔ عربی زبان میں جس طرح پیچھے پیچھے چلنے کو صلیٰ کہا جاتا ہے اس سے صلوٰۃ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں

نتائج کو استشہاداً پیش کرتا ہے مقصود ان سب سے یہی ہے کہ انسان سے اس کی حیاتِ اجتماعیہ کے دائرہ میں اس قسم کی صفات ظہور پذیر ہوں بعض امور میں وہ ان شئون کی عملی صورت بھی خود ہی متعین کر دیتا ہے (یہ وہ احکام ہیں جن کا تعین قرآن نے کر دیا ہے) لیکن اکثر امور میں وہ ان صفات کو اصولی طور پر سامنے لاتا ہے تاکہ ان کی عملی تشکیل مقتضیات زمانہ کے پیش نظر خود متعین کر لی جائیں۔ حکومتِ الٰہیہ کے قیام سے مقصود یہ ہے کہ انسانی حیاتِ اجتماعیہ (نظامِ تمدن و معیشت) اس انداز کا ہو جائے کہ اس میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ پر ایک ہی قسم کا ردِ عمل ہو۔ اور وہ ردِ عمل انسانوں کی طرف سے اس صفت کا ظہور ہو جس صفت کا ظہور نظامِ کائنات میں ایسے حادثہ پر خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ خدا کی محکومیت سے یہی مقصود ہے یعنی وہ نظامِ اجتماعیہ جس میں انسان خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں اس ہیئتِ اجتماعیہ میں انسانی نظامِ تمدن اسی قسم کے نظم و ضبط اور توازن و توافق کے ساتھ چلتا جائے گا جس حسن و عدل کے ساتھ نظامِ کائنات چلا جا رہا ہے۔

لہٰذا اسلام میں عبادت سے مفہوم ہے محکومیت اور محکومیت سے مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا کے پیچھے پیچھے چلتا جائے (اتباع) اور یہ اتباع بطیبِ خاطر دل کی مرضی سے ہو نہ کہ کسی جبر و استبداد سے اسی کو اطاعت کہتے ہیں۔ اطاعت کے لغوی معنی ہیں برضا و رغبت کسی کام کو کرنا۔ اس لئے عبادت۔ محکومیت: اتباع۔ اطاعت وغیرہ مختلف الفاظ سے مفہوم وہی رفاقت ہے جس میں خدا رفیقِ اکبر ہوتا ہے اور انسان رفیقِ اصغر۔ خدا کی اس رفاقت و توافق سے انسانی زندگی کا نظام انہی ہمواریوں اور استواریوں کے ساتھ چلتا ہے جن کے ساتھ نظامِ کائنات چل رہا ہے۔ نظامِ کائنات اپنے اختیار و ارادہ سے نہیں چل رہا ہے اسے اسی طرح چلایا جا رہا ہے۔ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے لہٰذا وہ اپنے نظام کو اسی نہج پر اپنے اختیار و ارادہ سے چلائے گا۔ انسانی اختیار و ارادہ کو اگر کسی قانون کا پابند نہ کیا جائے تو اسے سرکشی و طغیان کہتے ہیں۔ اور اس طرح سے قائم کردہ نظامِ اجتماعیہ کو طاغوتی نظام کی اصطلاح سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس اختیار و ارادہ کو سنت اللہ (Bahaviour of Reality) سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو اس نظام کو نظامِ فطرت یا حکومتِ الٰہیہ کہا جائے گا۔ اسلام کے

استخلاف کا مفہوم

تمام شعائر و مناسک اور عبادت[1] کے ذرائع ہیں۔ سب کی سب حکومتِ الٰہیہ کے حصول قیام اور بقا کے ذرائع ہیں اسی کو قرآن نے استخلاف فی الارض کہا ہے۔ اعمالِ صالحہ اس استخلاف کے حصول کے ذرائع ہیں۔ وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصٰلحٰت لیستخلفنہم فی الارض (یہ وعدہ (اٹل قانون) ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں گے (یعنی اپنی زندگی کو صداقتِ الٰہیہ کو تسلیم کرنے کا عہد کریں گے) اور پھر ان سے اعمالِ صالحہ سرزد ہوں گے (یعنی ایسے اعمال جو نظامِ زندگی میں توازن اور درستی پیدا کردیں) تو اس کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ کما استخلف الذین من قبلھم (یہ کوئی نظری بات نہیں بلکہ ایک ایسی محسوس حقیقت ہے جس پر تاریخ شاہد ہے کہ جنہوں نے ایسا کیا ان کے ایمان و عمل کا یہی نتیجہ مرتب ہوا) اس استخلاف فی الارض سے ہوگا یہ کہ تمہارا یہ نظامِ زندگی جس میں تم نے اپنی حیاتِ دنیوی کو مستقل اقدار سے ہم آہنگ کرلیا ہے متمکن ہو جائے گا۔ (ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم) اور تمہارا خوف امن سے بدل جائے گا (ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا) کیونکہ اس نظام میں غلبہ ہمیشہ تعمیری پہلوؤں کو ہوگا جب نظامِ فطرت اور نظامِ انسانی میں ایک ہی قانون عمل پیرا ہوگا تو ہو نہیں سکتا کہ اس کے نتائج مختلف ہوں مختلف نتائج تو مختلف قوانین پر عمل کرنے سے مرتب ہوتے ہیں۔ جسے شرک کہا جاتا ہے (یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا)۔ جب تک تم اس پروگرام پر عمل پیرا ہوگے تمہارا نظام نظامِ فطرت کی طرح ہموار چلتا جائے گا۔ جب تم اس سے منہ موڑو گے تو پھر زندگی کی ناہمواریاں شروع ہو جائیں گی۔ (ومن کفر بعد ذٰلک فاولٰئک ھم الفٰسقون)۔ اس نظام کو قائم رکھنے کا ذریعہ قیامِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا التزام ہے (واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ) اور نظام درحقیقت قائم ہوتا ہے مرکزِ حکومتِ الٰہیہ کی اطاعت سے (واطیعوا الرسول)۔ اس انداز سے خدا کا قانون تمہارے ضعف و ناتوانی کو قوت و توانائی میں بدل دیتا ہے۔ (لعلکم ترحمون ۲۴/۵۵-۵۶)۔

"قیامِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کا مفہوم بڑا تشریح طلب ہے۔ درحقیقت یہی نظامِ دین (نہ کہ رسومِ مذہب) کی اصطلاحیں ہیں لیکن یہ چیز تو ہمارے سامنے آچکی ہے کہ یہ "ارکانِ دین" اس نظامِ اجتماعیہ کے حصول و قیام کا

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "سلیم کے نام" خطوط کا مجموعہ۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں

> فکر کے ذریعے، قلبِ انسانی یہ معلوم کرتا ہے کہ کائنات میں حقیقتِ مطلق کی کارفرمائیاں کیا ہیں لیکن صلوٰۃ میں انسانی فکر اس قسم کی سست رو جستجو سے ہٹ کر اس عمومی سطح سے بلند ہو جاتا ہے تاکہ خود حقیقت کو پالے اور اس طرح اپنی زندگی میں حقیقت کے ایک باشعور رفیق کی حیثیت حاصل کرے اس میں باطنی قسم کی (Mystical) کوئی بات نہیں (بات صاف ہے) صلوٰۃ نفسِ انسانی کے جگمگانے کا ایک ایسا تدریجی عمل ہے جس سے ہماری ذات کا چھوٹا سا جزیرہ حیاتِ کلی کی وسعتوں میں اپنا صحیح مقام پا لیتا ہے...... لہٰذا صلوٰۃ کو مطالعہ فطرت کا ایک ضروری تکملہ (Complement) سمجھنا چاہیئے۔

انسانی ذات حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ انسان اس مادی کائنات ہی کا ایک حصہ (یا اس کی ترقی یافتہ شکل) ہے لیکن اس میں کچھ ایسا بھی ہے جو اپنے آپ کو اس مادی کائنات میں سے نہیں سمجھتا وہ "کچھ" درحقیقت اس مادی کائنات میں سے ہے بھی نہیں۔ یہی وہ ہے جو انسانی حقیقت ہے جسے عام طور پر نفسِ انسانی (Personality) کہا جاتا ہے۔ نفسِ انسانی کائنات کی مادی چاردیواری میں کسی کو اپنا رفیق نہیں پاتا۔ اس لئے یہ اپنی رفاقت، اقطارِ سماوات والارض سے باہر تلاش کرتا ہے اس کی اسی تلاش کا ذریعہ صلوٰۃ ہے اقبال کے الفاظ میں "صلوٰۃ، انسان کی اس قلبی آرزو کا اظہار ہے جس میں یہ کائنات کے مہیب سکوت میں اپنی پکار کا جواب سننا چاہتا ہے"۔ اس حقیقت کو ولیم جیمس نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

> اگرچہ انسان کے تجربۂ نفس کا عمیق ترین گوشہ مدنی الطبع واقع ہوا ہے لیکن اسے رفیقِ[1] حق ہمیشہ (مادی دنیا میں نہیں بلکہ) ایک مثالی دنیا میں ملتا ہے دعا کا جذبۂ محرکہ اس حقیقت کا فطری نتیجہ ہے۔

---

[1] رفیقِ حق۔ مفہوم کے اعتبار سے ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ لفظی ترجمہ ہے جیمس کے الفاظ (Great Companion) میں غور کیجئے! ولیم جیمس دورِ حاضرہ کا عظیم ترین نفسیاتی عالم ہے وہ اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لئے الفاظ تک بھی وہی لاتا ہے جو آج سے تیرہ سو برس پیشتر عرب کے صحرا میں ایک ان پڑھ کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔

اصل یہ ہے کہ جب انسان دیکھتا ہے کہ اس رفیقِ اعلیٰ کی صفات کا عکس (بشری محدودیت کے باوجود) اس کی حیاتِ اجتماعیہ میں ایسا تحیر انگیز انقلاب پیدا کر دیتا ہے تو اس تصور سے کہ ان صفات کی لامحدودیت، کائنات میں کس قدر محیر العقول نتائج پیدا کر رہی ہوگی اس میں وجد و مسرت کی ایک عجیب والہانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اسے ان صفات کے سرچشمۂ ابدی کے لئے پیکرِ حمد و ستائش (Appreciation Personified) بنا دیتی ہے۔ اسی جذبہ کی مشہود صورت کا نام صلوٰۃ ہے۔ اس حمد و ستائش کے اظہار میں جہاں اس کے لئے اپنے مقابلہ میں اس رفیقِ اعلیٰ کی عظمت و کبریائی کا اعتراف مضمر ہوتا ہے وہاں کائنات کے مقابلہ میں خود اپنی ذات کی بلندیوں اور ہمہ گیریوں کا اثبات بھی مقصود ہوتا ہے۔ سجود و قیام اسی خُردی اور بزرگی کے مظاہر ہیں یعنی انائے مطلق (خدا) کے مقابلہ میں اپنی خردی اور جملہ کائنات کے مقابلہ میں اپنی عظمت اور بزرگی۔ اقبال کے الفاظ میں:-

> صلوٰۃ، انکشافِ حقیقت کا ایک عدیم النظیر طریقہ ہے جس میں متجسس انا عینِ نفی کے لمحہ میں اپنی ذات کا اثبات بھی کرتا جاتا ہے اور اس طرح حیاتِ کائنات میں ایک محرکہ عنصر (Dynamic Factor) کی حیثیت سے اپنی ذات کی قدر و قیمت اور وجہ ہستی کا انکشاف کر لیتا ہے۔

یہ ہے مقصود صلوٰۃ سے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ یہ کوئی انفرادی عمل ہے جس میں انسان گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے طور پر نمازیں پڑھ کر، اپنے اندر اس قسم کی کیفیت پیدا کر لیتا ہے۔ اسلام میں نماز (صلوٰۃ) ایک انفرادی عمل نہیں بلکہ اجتماعی عمل ہے اس سے مفہوم یہ ہے کہ فرد ملت کے ساتھ رہ کر قوانین خداوندی کی اتباع سے اپنی ذات کا استحکام کر سکتا ہے اجتماعیت سے الگ ہو کر محض فریبِ نفس حاصل ہو سکتا ہے۔ اجتماعی عمل ایسی بڑی حقیقت ہے جس کے متعلق دورِ حاضرہ کی نفسیاتی تحقیقات اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ یہ ایک عام انسان کی قوتِ مدرکہ کو مضاعف کر دیتا ہے اس کے جذبات میں عمق پیدا کرتا ہے اور اس کی قوتِ ارادی کو اس درجہ محرک بنا دیتا ہے جس کا یہ اپنی انفرادی ذات میں تصور بھی نہیں کر سکتا (اقبال)۔ لہٰذا صلوٰۃ بھی ایک اجتماعی عمل کا نام ہے۔ انفرادی پرستش نہیں۔ یہ اجتماعات درحقیقت نظامِ خداوندی کے قیام کا پروگرام سوچنے اور

ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے ہوتے ہیں۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں عبادت کا قرآنی مفہوم۔ وہی عبادت جو دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے سے پرستش کی چند رسومات اور پوجا پاٹ کی حرکات و سکنات بن کر رہ گئی۔

وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست

یہ مذہب ملّا و جمادات و نباتات

کیا اس سے بڑا انقلاب کبھی سورج کی آنکھ نے کہیں دیکھا ہے؟

نظریۂ ارتقاء اور قرآن

(نومبر [illegible])

قرآن سے پہلے دنیا بالواسطہ یا بلاواسطہ مفکرینِ یونان کے نتائجِ فکر سے متاثر تھی۔ ان فلاسفروں کی رو سے کائنات کا تصور سکونی (Static) تھا۔ یعنی یونان کے فلاسفر یہ کہتے تھے کہ کائنات کی دفعتہً خدا

کائنات کا تصور

کے ہاتھوں سے مکمل شکل میں وجود میں آگئی تھی اور اب ایک بجھے ہوئے ٹیلے کی طرح فضا کی پہنائیوں میں چپ چاپ پڑی ہے۔ اس میں کوئی حرکت ہے نہ اضافہ، نہ تغیر و تبدل۔ اسے جو کچھ بننا تھا، بن چکی، جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اس کو نام دیا جاتا ہے کائنات کا سکونی تصور یعنی ساکت و ساکن کائنات۔

قرآن نے اس نظریہ کا ابطال کیا اور کہا کہ کائنات کا تصور سکونی نہیں بلکہ حرکیاتی (Dynamic) ہے۔ یعنی یہ کائنات ایک بنی بنائی شے کی شکل میں وجود میں نہیں آئی۔ بلکہ کائنات مسلسل تغیر و تبدل کی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ خالقِ کائنات نے اسے وجود میں لانے کے بعد معطل نہیں کر دیا بلکہ وہ اس میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ یزید فی الخلق ما یشاء (۳۵/۱)۔ وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق تخلیق میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے۔ صرف اضافہ ہی نہیں بلکہ یہ تغیر و تبدل۔ ہر وہ شے جو رکھے جانے کے قابل نہیں رہتی اسے مٹا دیا جاتا ہے اور جس میں باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت

ہوتی ہے اسے مستحکم کر دیا جاتا ہے یمحو اللہ ما یشاء ویثبت۔ (۱۳/۳۹) مٹایا اسے جاتا ہے جس کا نتیجہ منفیانہ (یا تخریبی ہو) اسے قرآن کی اصطلاح میں باطل کہا جاتا ہے اور قائم اسے رکھا جاتا ہے جس کا اثر تعمیری ہو اسے حق کہتے ہیں۔

سورۂ شوریٰ میں ہے:-

ویمح اللہ الباطل ویحق الحق بکلمٰتہ (۴۲/۲۴)

خدا اپنے قانون مشیت کے مطابق تخریبی عناصر کو مٹا دیتا ہے اور تعمیری عناصر کو مستحکم کرتا ہے

کائنات میں یہ سلسلۂ تغیر و تبدل، یہ عمل محو و تثبیت کچھ ایسے غیر محسوس انداز سے عمل میں آرہا ہے کہ سطحی آنکھ اس تماشائے تحول و تدرج سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتی پھر یہ تبدیلیاں اتنے طویل طویل عرصوں کے بعد ظہور میں آتی ہیں کہ انسانی یادداشت کے لئے اس کا ریکارڈ رکھنا مشکل ہے اس لئے محققین و متجسسین علوم طبیعی کو ان تدریجی انقلابات کے لئے خود صحیفۂ فطرت کے اوراق اور خزائن و دفائن ارضی کے نقوش و آثار کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے قرآن نے کائنات کے ان تدریجی مراحل کے متعلق ایک اصولی بیان دیا ہے

تدریجی ارتقاء

جو اس بحث کا نقطۂ اساسی ہے وہ کہتا ہے:-

یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون۔ ذٰلک عالم الغیب والشھادۃ العزیز الرحیم۔ (۳۲/۵-۶)

اللہ ایک مرتب سکیم کی تدبیر بلندیوں سے پستیوں کی طرف کرتا ہے (یعنی وہ بہ نفاذ قانون خداوندی سے زمین پر اپنے طبیعی نقطۂ آغاز کے مقام پر آجاتی ہے۔ پھر وہ سکیم (اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی) اس کی طرف بلند ہوتی ہے ایسے طویل طویل عرصوں (یوم) میں جن کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ہزار ہزار سال ہوتی ہے۔ یہ وہ خدا ہے جو ہر شے کی موجودہ اور آنے والی حالت سے باخبر ہے جو ہر شے کی نشوونما کے مناسب ایک (Pattern) نقشہ کرتا ہے (رحیم) اور پھر اسے اپنے نظام کی قوت سے تکمیل تک پہنچاتا ہے۔

یعنی مشیت ایزدی کے سامنے ایک اسکیم ہوتی ہے جسے اس کی انتہائی پستی (نقطۂ ادنیٰ یعنی سب سے نچلی منزل) سے شروع کیا جاتا ہے۔ پھر وہ اسکیم ان خاص قوانین کے ماتحت جو اس کے لئے متعین کئے جاتے ہیں نشوونما کے مراحل طے کرتی ہوئی اس نقشہ (رحم یا Pattern) میں جو اس کی نمود اور پختگی کے لئے تجویز کیا جاتا ہے اپنی تکمیل کے نقطۂ آخریں تک جا پہنچتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے "ایام" (Periods) میں طے ہوتے ہیں کہیں ہزار ہزار سال کا ایک ایک تدریجی مرحلہ کہیں پچاس پچاس ہزار سال کا فی یوم کان مقدارہٗ خمسین الف سنۃ (۴۷) کارگہ مشیت کے ان عظیم المرتبت امور (Schemes) میں سے ایک اہم اسکیم انسان کی تخلیق بھی ہے یہی اسکیم سر دست ہماری زیرِ نظر بحث کا محور ہے۔

انسانی تخلیق

انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے جیسے سورج کا طلوع و غروب لیکن اسباب وعلل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب اس کتاب تخلیق کے اوراق دیکھنے کی طرف اٹھتا ہے تو اس کی نگہ ستعجب کا اس مقام پر جا کر رک جانا ضروری ہے جسے وہ اس سلسلہ تخلیق انسانی کی سب سے پہلی کڑی قرار دیتا ہے اس وادیٔ حیرت میں پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رہ جاتا ہے کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آگیا اس کا تحیر بجا اور تعجب درست ہے انسانی تحقیق و تفتیش کا ماحصل اس کے تمام انکشافات وایجادات کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ کارگہ عالم کے مختلف پرزوں کے اسباب وعلل کی کڑیوں پر پڑے ہوئے پردوں کو اپنی تحقیق کی انگلی سے اٹھا دیتا ہے جہاں اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی آجاتی ہے اس کی نگہ تجسس کے سامنے پردۂ حیرت کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ مقام تحیر و ستعجب انسانی علم وتحقیق کی نسبت سے متعین ہوتا ہے یعنی جس قدر علم و دانش کی منازل آگے بڑھتی جائیں گی اسی نسبت سے یہ مقام بھی آگے سرکتا جائے گا یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ایک خدا فراموش مادہ پرست اور ایک حق شناس عبد مومن کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے اول الذکر اس مقام سے

آگے وادیٔ حیرت کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی آماجگاہ بناتا ہے۔ اور اس طرح خود بھی ٹھوکریں کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی راہ سے گم کرتا ہے لیکن ایک حکیم مومن وہاں پہنچکر بلا تامل پکار اٹھتا ہے کہ اس سلسلہ زندگی کی ابتدا اس قادر مطلق کی اسباب فراموش مشیت اور علل نا آشنا صمدیت کی رہین منت ہے جو انسانی سلاسل اسباب و نتائج سے مستغنی اور علائق و علل سے بے نیاز ہے وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت عظمیٰ کا اعلان کرتا ہے اور اس طرح حیرت و استعجاب کی وہ وادی جو اس خدا فراموش محقق کی قیاس آرائیوں سے تیرہ و تار ہو چکی تھی اس مرد خود آگاہ و خدامست کی مشعل ایمان و شمع ایقان سے جگمگا اٹھتی ہے۔

سب سے پہلا انسان

سب سے پہلا انسان، کس طرح وجود پذیر ہو گیا یہ مقام تحیر ہے جس کو عبور کر گیا ہے انسان نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گرد و پیش ایک نگار خانۂ حیرت کھلا پایا۔ نیچے زمین کی حدود فراموش وسعتیں فضائے آسمانی کی ناپیدا کنار پہنائیاں۔ سامنے ایک خوفناک سمندر، موجیں بپھری، لرزہ انگیز زنجیریں سلسلہ کوہ اور ایک معلق مہیب چھت۔ افق کے اس پار سے ہر صبح ایک ... کی نمود، ہر شام شفق کی خونیں قبا میں اس کا غروب، محفل انجم کی شمع فروزاں کہکشاں کی گرد، بادلوں کا سا طرف وہ انسان ہمہ تن مدہوش رہا کہ دیکھتا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ یہ محیر العقول سلسلہ کیا ہے؟ زمین کہاں سے آ گئی ہے؟ پہاڑ کیسے پیدا ہو گئے ہیں سورج کہاں سے آتا اور کہاں چلا جاتا ہے؟ یہ چاند یہ تارے یہ دریا یہ سمندر کیسے پیدا ہو گئے، یہ سوالات بار بار اس کے سامنے آتے اور ہر بار ایک نئی دنیائے حیرت میں چھوڑ جاتے وہ بیچارہ کیا سمجھ سکتا کہ

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟

ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

اور جب وہ عالم آفاق کے متعلق کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ ان کی تخلیق کس طرح سے ہوئی تو پھر وہ یہ کیسے سمجھ سکتا کہ وہ سب سے پہلا انسان کس طرح پیدا ہو گیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ قیاس کر سکتا تھا کہ یہ

ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ صرف اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

اس منزلِ جمادات میں (جو اس سلسلہ کا نقطۂ آغاز ہے) زندگی محوِ خواب تھی (کنتم امواتاً ۲/۲۸) اس کی بیداری پانی کے چھینٹے سے ہوئی۔

وجعلنا من الماء کل شیء حی افلا یؤمنون ۰ (۲۱/۳۰)

اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی (الماء) سے بنایا کیا یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

سرچشمۂ حیات

زندگی کی جل پری نے اپنی آنکھ پانی کی گہرائیوں میں کھولی، سائنس کی تحقیق اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ حیات کے جرثومۂ اولین (Protoplasm) کی ترکیب سمندری کی سی ہے اسی سے اس میں اسی نوعیت اور اسی تناسب کے املاح (Salt) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں یوں تخلیق انسانی کا قافلہ وادیٔ خاک سے منزلِ آب کی طرف منتقل ہوا۔

وھو الذی خلق من الماء بشرا فجعلہ نسبا وصھرا وکان ربک قدیرا (۲۵/۵۴)

اور اللہ وہ ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا پھر اس کے رشتے اور ناتے بنائے اور تیرا رب (ہر بات پر) قادر ہے۔

پانی اور مٹی کے "خلاصہ" کے امتزاج سے اس جرثومہ نے خلیہ (Cell)[1] کی شکل اختیار کی جس کو قرآن کریم نے طین لازب (کیچڑ کی سی چپچپی مٹی) سے تعبیر کیا ہے۔

انا خلقناھم من طین لازب ۰ (۳۷/۱۱)

ہم نے انسان کو طین لازب (چپچپی مٹی) سے تعبیر کیا ہے۔

طین لازب

یہ طین لازب وہی ہے جو تالابوں کی تہ میں اور جوہڑوں کے کنارے دکھائی دیتی ہے جب پانی سوکھ جاتا ہے تو یہ سیاہ رنگ کی کالی گھنگ مٹی بڑی سخت ہو جاتی ہے۔

ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمإ مسنون ۰ (۱۵/۲۶)

اور بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے۔

---

[1] خلیہ (Cell) مرکب ہوتا ہے مرکزہ (Nucleus) اور پیکر (Cell Body) سے۔

پانی اور مٹی کی آمیزش سے جرثومۂ حیات نے پیکر کی شکل اختیار کی ان خلیات (Cell) میں ایک لیس دار مادہ (Nucleus) زندگی کے تمام عظیم المرتبت امکانات اپنے اندر لئے ہوتا ہے جیسے ایک ننھا سا بیج ایک تن ور درخت کو اپنے اندر سمیٹے نمو و شگفتگی کے لئے ہمہ تن اضطراب ہو حیات کا یہ نقطۂ آغاز نفسِ واحدہ ہے جس سے شجرِ زندگی کی شاخیں پھوٹتی ہیں ایک خلیہ خاص مدت تک پہنچ کر جوشِ نمو سے خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے جنہیں (Deughter Cells) کہا جاتا ہے اس نفس واحدہ سے جاندار

شجرِ ارتقاء

مخلوق کی شاخیں پھوٹیں اور ایک طویل القامت درخت کی طرح سطحِ ارض پر پھیل گئیں۔ ہر شاخ کو مخلوق کی ایک الگ نوع (Species) سمجھئے جو بڑھتی، پھولتی پھلتی اپنی اپنی سمت میں نشو و ارتقاء کے منازل طے کئے جا رہی ہے۔ ان تمام شاخوں میں سربلند نوعِ انسانی کی شاخ ہے جو اس نفس واحدہ کے ننھے سے بیج سے مختلف مراحل طے کرتی درجہ بدرجہ قدم بہ قدم جادہ بہ جادہ منزل بمنزل اسی بلندی تک پہنچی ہے۔

مالکم لا ترجون للہ وقارا ہ وقد خلقکم اطوارا ہ .... واللہ انبتکم من الارض نباتا ہ (۷۱: ۱۳-۱۷)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے آرزومند نہیں ہوتے اور یقیناً اس نے تمہیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا ہے..... اور تمہیں زمین سے اُگایا ہے۔ ایک طرح اُگانا۔

اس خوردبینی نفسِ واحدہ سے سلسلۂ تخلیق آگے بڑھا۔ اس نشأۃِ اولیٰ کے بعد وہ نفسِ واحدہ مختلف منازل میں ٹھہرتا ہوا اور آگے بڑھتا گیا حتیٰ کہ وہ اس پیکرِ بشریت کے مقام تک آ پہنچا جو اس حیاتِ ارضی میں اس کی جائے قرار ہے

وھو الذی انشاکم من نفس واحدۃ فمستقر و مستودع قد فصلنا الایات لقوم یفقھون ہ (۶/۹۸)۔

وہی ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے نشو و نما دی۔ پھر تمہارے لئے قرار پانے کی جگہ (مستقر)

اور سپردگی کا مقام (مستودع)[1] ہے۔ بلاشبہ ہم نے اپنی آیات سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے تفصیل کے ساتھ بیان کر دی ہیں۔

اس انتقال مکانی یعنی ایک مقر سے دوسری منزل تک پہنچنے میں ہزارہا قرن (الف سنۃ) گزر گئے اور یوں جرثومۂ حیات (Life Cells) کے ابتدائی مرحلے کے بعد وہ مقام آگیا جہاں تخلیق کا سلسلہ بذریعہ تناسل شروع ہوا۔

ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مھین ۰ (۳۲/۸)

پھر اس کی (انسان کی) نسل کو حقیر پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

حیوانی زندگی کی ابتداء یعنی ان تمام سابقہ طبقات سے گزر کر ہزارہا سال کی تشکیل و تدبیر سے [illegible] کے بعد اس کا سلسلہ ایک حقیر پانی کے قطرہ سے جاری رکھا۔ یعنی حیوانی زندگی کا سلسلہ افزائش نسل۔

ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین ۔ ثم جعلنٰہ نطفۃ فی قرار مکین ۰ (۲۳/۱۲)

اور دیکھو واقعہ یہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے نطفہ سے بنایا ایک ٹھہر جانے والی جگہ میں۔

قافلۂ حیات کی اس منزل میں جو مخلوق پیدا ہوئی اس میں رینگنے والے اور پاؤں کے بل چلنے والے حیوانات سب شامل ہیں۔

واللہ خلق کل دابۃ من ماء ج فمنہم من یمشی علی بطنہ ج ومنہم من یمشی علی رجلین ج ومنہم من یمشی علی اربع ط (۲۴/۴۵)

اللہ نے ہر جاندار حیوان کو پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے وہ بھی ہے جو اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے اور ان میں وہ بھی ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور ان میں وہ بھی ہے جو چار پاؤں پر چلتا ہے۔

---

[1] غور فرمائیے قرآن کریم نے جائے قرار کو صرف امانت گاہ (مستودع) کہہ کر اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے کہ جسد بشری میں حیات بطور امانت رکھی گئی ہے حیات اس کی پیدا کردہ نہیں ورنہ یہ اس کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔

صرف رینگنے والے یا پاؤں کے بل چلنے والے ہی نہیں - بلکہ پرندے بھی یعنی وہ تمام مخلوق جس کا سلسلہ افزائش بذریعہ تناسل آگے بڑھتا ہے یوں سمجھئے کہ زندگی کی اس بڑی شاخ سے بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں ادھر ادھر پھوٹیں اس لئے اس سٹیج پر مختلف تمام کی مخلوق، دراصل ایک ہی نوع کی مختلف شکلیں اور ایک ہی نفس کے مختلف افراد ہیں۔

وما من دابة في الارض ولا طائر يطير بجناحيه الا امم امثالكم ط
ما فرطنا في الكتاب من شيء ثم الى ربهم يحشرون ٥ (6/38)

اور زمین میں چلنے والا کوئی حیوان اور ہوا میں پروں سے اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمہاری ہی طرح گروہ (امت) نہ ہو۔ ہم نے نوشتہ (الکتاب) میں کوئی بھی بات فروگذاشت نہیں کی پھر (سب) اپنے رب کے حضور میں جمع کئے جائیں گے۔

نر و مادہ کا امتیاز

یہ وہ مقام ہے جہاں ذکور و اناث (نر اور مادہ) کا امتیاز محسوس طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

واللہ خلقکم من تراب ثم من نطفۃ ثم جعلکم ازواجا ط (35/11)

اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے۔ پھر تمہیں جوڑے بنا دیا۔

یعنی اس مقام پر خلیات حیات (Life Cells) میں جنسی تخلیق (Sexual) (Reproduction) نمایاں ہو گیا۔ یہ جرثومے (Germ Cells . Gametes) دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ایک (Ovum) یعنی مادہ کا خلیہ اور دوسرا (Spermatozoon) نر کا خلیہ۔ یعنی ایک جرثومہ زندگی ذوقِ تخلیق سے نر اور مادہ کے خلیوں میں بٹ گیا۔

ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منھا زوجھا .... (7/189)

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ (جرثومۂ حیات) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔

دوسری جگہ ہے:-

ومن کل شیٔ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون (۵۱/۴۹)

اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنائے (اور ان امور کا ذکر سامنے کیا کہ تم) ان بھولی ہوئی حقیقتوں کی یاد تازہ کر سکو۔

اس نفسِ واحدہ نے پیکرِ حیوانی میں بھی قرنہا قرن گذارے ان ادوار میں انسان ابھی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئًا مذکورا (۷۶/۱)

کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گزر چکا جب یہ قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

پیکرِ انسانی

حیوانی زندگی کی ان تمام شاخوں میں سے ایک شاخ اوپر کو ابھری یہ پیکرِ انسانی کی شاخ تھی پیکرِ حیوانی کو بتدریج سنوارا گیا اسے حشو و زوائد سے پاک کر کے اس کے لطیف و نازک جوہروں میں جلا دی گئی۔ اور یوں عروسِ حیات حریمِ بشریت میں جلوہ ریز ہوئی۔

الذی خلقک فسوٰک فعدلک (۸۲/۷)

وہ ذات جس نے تجھے پیدا کیا پھر (ہر طرح سے) درست کیا۔ پھر (اعضاء و جوارح) میں تناسب پیدا کیا۔

پھر اسے احسن تقویم عطا فرمائی:-

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (۹۵/۴)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا۔

یہ احسن تقویم کیا ہے؟ اس بہترین ہیئت میں کون سی امتیازی خصوصیت ہے؟ وہ کون سا جوہر خصوصی ہے جس کی بنا پر انسان سلسلۂ ارتقا کی سابقہ کڑیوں سے الگ متمیز حیثیت کا مالک بن گیا۔ قرآن کریم نے یہ حقیقت بیان فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہی انسان کی امتیازی خصوصیت کو ایک نمایاں جامعیت سے ادا کرتے ہوئے فرمایا ثم سوّٰہ ونفخ فیہ من روحہ (۳۲/۹) (پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی) یعنی شجرِ ارتقا کی اس شاخِ بلند و بالا کو ہر طرح سے درست کیا اس میں مناسب صلاحیت و استعداد پیدا کی اسے سنوارا اور آگے بڑھایا۔ اور جب اس میں یہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں تو اسے درجۂ حیوانیت سے آگے بڑھا کر اس میں خدائی قوت کا کرشمہ

ڈالا اب وہ دیکھنے سننے اور سمجھنے سوچنے والا انسان بن گیا۔

شرف انسانیت

وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ما تشکرون (۳۲/۹) اور اس نے تمہارے لئے سمع بصر اور قلب بنایا لیکن تھوڑے ہیں جو شکر گذار ہیں۔ یہ روحِ خداوندی، کیا ہے جس کی کرشمہ سازیوں نے یک پیکرِ آب و گل کو کائنات کا جانِ مدعا بنا دیا؟ اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں...... اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ اس نفخِ روح سے حاصل کیا ہوا؟ قرآن کریم کے الفاظ میں اس سے سمع و بصر و قلب عطا ہوا۔ کہنے کو تو یہ تین لفظ ہیں لیکن غور سے دیکھئے تو شرف و مجدِ انسانیت کی پوری کی پوری دنیا ان تین گوشوں میں سمٹ آئی ہے۔ دیکھنا سننا یہی ذرائع علم ہیں اور علم ہی وہ امتیازِ خصوصی ہے جس نے انسانی زندگی کو حیوانی زندگی سے نمایاں طور پر الگ کر دیا ہے۔ اس سمع و بصر سے انسان کن ذمہ داریوں کا حامل بن جاتا ہے یہ پھر قرآن ہی کی ایک آیۂ مقدسہ میں دیکھئے۔ فرمایا:-

انا خلقنا الانسان من نطفۃ امشاج نبتلیہ فجعلنہ سمیعا بصیرا۔ انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا و اما کفورا (۷۶/۲-۳)

یقیناً ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا جو باہمی ملنے والے عناصر (کا مرکب) ہے، ہم مختلف حالتوں میں متغیر و متبدل کرتے رہے (آخر کار) اسے سننے اور دیکھنے والا بنا دیا۔ اسے (پھر) ہدایت کا راستہ دکھا دیا خواہ یہ اسے قبول کرے یا اس سے انکار کردے۔

اختیار و ارادہ کا جوہر

یہ ہے وہ سب سے بڑا امتیاز جو انسان کو حیوانی زندگی سے الگ کرتا ہے یعنی شعور و تعقل اور اس کی بنا پر اختیار و ارادہ۔ اس مقام پر پہنچ کر سلسلہ ارتقاء کی یہ کڑی اپنی سابقہ کڑیوں سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ لیکن پچھلے سلسلے کے گزشتہ حقیقت کی استعداد اور صلاحیتوں کا ما حصل جزو (Sum-total) نہیں بلکہ یہاں پہنچ کر ان تمام صلاحیتوں اور جوہروں میں یکسر ہی قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی جو ارتقاء کے اس سلسلے سے بالکل مختلف تھی جو اس وقت تک چلا آ رہا تھا۔ اس تبدیلی کا

نتیجہ انسانی اختیار و ارادہ ہے جس سے نفسِ کائنات میں تنوع اور زندگی کی جوئے رواں میں تلاطم برپا ہے۔ اختیار و ارادہ کے بغیر یہ دنیا پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں کا بے رنگ مجموعہ اور درندوں چرندوں پرندوں کا بے کیف مسکن (ہ ۵۵) رہتی حسن کی ضیائے تابندہ اور عشق کی آتشِ سوزندہ اس کے شبستان میں نہ ہوتی۔ یہ سب "نفخِ روح" کی سحر کاریاں ہیں جن سے یہ ویرانہ رنگ و نکہت کا کاشانہ بن گیا۔ یہی وہ نفخِ روح تھی جس سے یہ آدمی مسجودِ ملائکہ قرار پایا۔

اذ قال ربك للملئكة انی خالق بشرا من طين ٥ فاذا سويته ونفخت فيه من روحی فقعوا له ساجدين۔ (۳۸/۷۱-۷۲)

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں یعنی جب اسے (مختلف مراحل ارتقاء کے بعد) سنوار دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے جواب اس سوال کا کہ سب سے پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا؟ علم و عقل، دانش و بینش، اور علوم و فنون متعلقہ اس سے کچھ زیادہ یا الگ بھی پیش کر سکتے ہیں؟ اور یہ بیانِ حقیقت ہوا کس زمانہ میں؟ اس وقت جب دنیا ہنوز سائنس اور اس کے لوازمات و ماجریات سے آشنا تک نہ تھی؟ آگے بڑھنے سے پیشتر ایک مرتبہ پھر نگہ بازگشت ڈالئے اس آیہ مقدسہ پر جس سے اس موضوع کی ابتداء ہوئی ہے اور دیکھئے کہ یہ پوری کی پوری داستان طول و طویل کس حسن و اعجاز نگاری سے چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

يدبر الامر من السماء الى الارض ثم يعرج اليه فی يوم كان مقداره الف سنة مما تعدون ٥ .... الذی احسن كل شیء خلقه وبدأ خلق الانسان من طين ٥ ثم جعل نسله من سلالة من ماء مهين ٥ ثم سواه ونفخ فيه من روحه وجعل لكم السمع والابصار والافئدة ٥ قليلا ما تشكرون ٥ (۳۲/۵-۹)

وہ اپنے امر (اسکیم) کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے پھر وہ اسکیم (اپنے ارتقائی مراحل طے کرکے)

اس کی طرف بلند ہو جاتی ہے ایک ایسے یوم (دور یا منزل) میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے لحاظ سے ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے...... (مشیت) وہ ذات جس نے اپنی مخلوق میں ٹھیک ٹھیک تناسب پیدا کیا اور انسان کی پیدائش کی ابتدا مٹی سے کی پھر اس کی نسل کو حقیر پانی کے خلاصہ سے بنایا پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے تمہارے لئے سماعت و بصارت اور قلب بنایا۔ لیکن بہت تھوڑے (انسان) ایسے ہیں جن کی مساعی ثمر بار ہوتی ہیں۔

اس سلسلہ ارتقاء سے نوع انسانی (نہ کہ کوئی خاص فرد) وجود پذیر ہوئی۔

لیکن قرآن کریم تخلیق کائنات اور تشکیل انسانی (سلسلہ ارتقاء) کے ان اصولوں کو اس لئے بیان نہیں کرتا کہ اسے طبیعیات کے طالب علموں کے لئے نصاب کی کتاب بننا تھا۔ ان توجیہات و تفصیلات سے اس کا مقصود کچھ اور ہے۔ وہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد انسانوں سے کہتا ہے کہ ذرا غور کرو کہ کائنات میں محو و تثبیت اور فنا و بقا کا کون سا اصول کام کر رہا ہے اور کس جبروت و اقتدار سے کام کر رہا ہے؟ یہ ایسا بطش شدید و متین کا قانون ہے جس کی گرفت سے کوئی باہر نہیں جا سکتا۔

اعمال صالحہ سے مراد

وہ قانون ارتقاء کے اس بنیادی اصول کو مختلف گوشوں اور متنوع پہلوؤں سے دلنشین کرتا ہے کہ اس کارگہ ہستی و عمل میں وہی نوع باقی رہ سکتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو (جس کے اعمال صالح ہوں)، وہی آگے بڑھ سکتی ہے جو اپنے اندر آگے بڑھنے کی استعداد پیدا کرے۔ وہ دیگر انواع کی مثال دے کر اس سے خود انسانی زندگی پر استشہاد کرتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم الشان درخت کو دیکھو اور غور کرو کتنی شاخیں تھیں جو سوکھ سوکھ کر گر گئیں۔ کتنے پھول تھے جو مرجھا مرجھا کر زمین پر آ گرے اور راستہ چلنے والوں کے پاؤں تلے آ کر مسلے گئے۔ اس کے برعکس کتنی شاخیں ہیں جو سرسبز و شاداب ہوئیں کیسے کیسے شگفتہ اور نورستہ پھول لائیں اور کیسے کیسے نفیس و لطیف پھل پیدا کئے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت کے اس قانون پر غور کرو اور سوچو کہ اقوام و ملل گزشتہ

کا کیا حشر ہوا؟ اس کا ارشاد ہے کہ مختلف انواع کی طرح قوموں کی موت و حیات کا بھی یہی قانون ہے۔ جو قوم زندگی کی اہل نہیں رہتی فنا ہو جاتی ہے اسے کوئی رعایت نہیں دی جاتی اس فیصلہ (یعنی ان کے اعمال کے ظہور نتائج) میں ذرہ بھر تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

ولکل امۃ اجل ج فاذا جاء اجلہم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون ﴿۳۴﴾

اور ہر امت (گروہ، جماعت، نوع) کے لئے (ظہور نتائج) کا وقت معین ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر ایک ساعت کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

اس اصولی نکتہ کو بیان کر دینے کے بعد اگلی آیت میں یہ بتا دیا کہ زندہ اور باقی رہنے کے لئے کیا قانون مقرر ہے فرمایا:

یٰبنی ادم اما یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم ایتی لا فمن اتقی واصلح فلا خوف علیہم ولا ہم یحزنون ﴿۳۵﴾

اے اولادِ آدم! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں اور میرے قوانین سے تمہیں مطلع کریں۔ سو (اس وقت) جو ان قوانین سے ہم آہنگی پیدا کر لے گا اور یوں اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لے گا تو اس پر (مٹنے اور زوال پذیر ہو جانے کا) کوئی غم اور اندیشہ نہ ہوگا۔

یہ قومیں وہ جو باقی رہیں گی آگے بڑھیں گی جنہیں ہلاکت و بربادی کا اندیشہ نہ ہوگا برعکس ان کے

والذین کذبوا بایتنا واستکبروا عنہا اولئک اصحاب النار ہم فیہا خلدون ﴿۳۶﴾

لیکن جو لوگ ان قوانین کو جھٹلائیں گے اور ان سے سرکشی برتیں گے تو وہ لوگ اہل جہنم ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

قوموں کے عروج و زوال کے اصول

غور فرمائیے پہلی آیت میں قوموں کی موت و حیات کا ایک اصولی قانون بیان فرما دیا۔ اس کے بعد اس کی وضاحت کر دی کہ ہلاکت سے مامون اور بربادی سے مصئون و بے خوف رہنے کا کیا طریقہ ہے اور وہ کون سا نظام ہے جس پر چل کر انسان امن و سلامتی کی جنت میں پہنچ سکتا ہے اس وقت اس نظام کی تشریح کا موقع نہیں۔ یہاں صرف

استناد کیجئے کہ قرآن کریم کی رو سے اس نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس ضابطہ کو نصب العین حیات بنایا جائے جو حضرت انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو ملا ہے وہ نظام جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قوم میں وہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی جس سے وہ فنا و برباد کر دینے والی مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے اور اسے کسی قسم کا خوف ہلاکت و حزن بربادی نہ رہے لاخوف علیھم ولاھم یحزنون گروہ ایسا نہ کرے گی تو خدا کا قانون تخلف و استبدال (Law Of Succession And Substitution) اپنا اٹل فیصلہ کر دے گا۔ اور اس قوم کی جگہ دوسری قوم آجائے گی۔

وربک الغنی ذو الرحمۃ ان یشا یذھبکم ویستخلف من بعدکم ما یشاء کما انشاکم من ذریۃ قوم اٰخرین ۵ (۱۳۳/۶) [illegible]۔

اور (دیکھو) تیرا پروردگار بے نیاز ہے (اس سے وہ اپنے تو بندوں کے نفع کا کسی کا محتاج نہیں۔ وہ کسی کو دیتا نہیں) اور رحمت والا ہے اگر وہ چاہے (تو اپنے قوانین مشیت کے ماتحت) تمہیں ہٹا دے اور تمہارے بعد اس قانون مشیت کے مطابق جس قوم کو چاہے تمہارا جانشین بنا دے جس طرح اس نے ایک دوسری قوم کی ذریت سے تمہیں اٹھا کھڑا کیا ہے۔

دوسری جگہ ہے :-

وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم ۵ (۳۸/۴۷) [illegible]

اور اگر تم نے (ان قوانین سے) سرکشی اختیار کی تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا اور وہ قوم تمہاری جیسی نہیں ہوگی (بلکہ تم سے بہتر ہوگی اسی لئے تو وہ تمہاری جگہ لے گی)

مغنی آتش نفس، موسیقار کی طرح ایک قوم کی راکھ کے ڈھیر سے دوسری قوم وجود کوش ہوتی ہے۔ مٹنے والی قومیں مٹ جاتی ہیں اور باقی رہنے والی ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں :-

چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند اورا　　وز ہماں آب و گل ایجاد جہاں نیز کنند

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے اس نقطہ کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔ وہ نظام جس سے قوموں کو ثبات و استحکام حاصل ہوتا ہے اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں لیکن اس ضمن میں ایک اصولی گوشہ ایسا ہے جس کی طرف اشارہ کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مغرب کے نظریۂ ارتقاء کی رو سے بقا (Survival) کیلئے اصلح (Fittest) ہونا ضروری ہے لیکن قرآن کی رو سے قانونِ بقا و استحکام کے لئے اصلح کے ساتھ ساتھ انفع ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بقا اس کا حصہ نہیں جو اپنی ذات میں باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ یہ سعادت اس کی قسمت میں آتی ہے جو اپنی ذات میں محکم و خودگیر ہونے کے بعد نوعِ انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع رساں ہو۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ۔

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)،

یاد رکھو! کرۂ ارض میں قیام و بقا اس کے لئے ہے جو نوعِ انسان کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہوتی ہے۔

بقائے اصلح ... (Survival Of The Fittest) کے نظریہ نے اقوامِ یورپ کو یہ سبق دیا کہ جو قوم سب سے زیادہ قوت سمیٹ لے گی اور رزق کے سرچشموں کو اپنے لئے وقف کر لے گی خواہ اس سے باقی اقوام کے جسم میں خون کا قطرہ تک بھی باقی نہ رہے زندگی اور اس کی شادابیاں اس کے حصے میں آئیں گی۔ انہوں نے اس قانون پر عمل کیا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس سے ان اقوام پر غلبہ و تسلط حاصل کر لیا جو قوتِ تخلیق سے عاری ہو چکی تھیں اور جن میں زندگی کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی لیکن چونکہ بقائے اصلح کے قانون سے بقائے دوام حاصل نہیں ہو سکتا تھا (اس سے حیاتِ خلد کا وہ فریب حاصل ہو سکتا تھا جسے ابلیس نے آدم کے وجہ فریبِ نظر بنایا تھا) اس لئے تھوڑے ہی عرصے کے بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ ان اقوام کی اصلیت [illegible] کس قدر بے بنیاد ثابت ہوئی۔ قرآن کی رو سے زندگی کا قانون بقائے انفع ہے یعنی جو نظام نوعِ انسان کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو اسی کو باقی رہنے کا حق حاصل ہے۔ دنیا مغرب کے قانون بقائے اصلح کو تو آزما چکی ہے۔ اور اب اس نظام کی تلاش اور انتظار میں ہے جو خود اپنی ذات ہی میں اصلح نہ ہو بلکہ نوعِ انسان کے لئے بھی انفع ہو۔

تمام صلاحیتیں معطل کر دی جاتی ہیں اس سے اگلی آیت میں ہے۔

وکاین من قریۃ ھی اشد قوۃ من قریتک التی اخرجتک اھلکنٰھم فلا ناصر لھم ۔

اور کتنی ایسی بستیاں تھیں جو قوت میں ان لوگوں سے بڑھکر تھیں جنہوں نے (اے رسول!) تجھے باہر نکال دیا ہے ہم نے انہیں ہلاک کر دیا سو کوئی ایسا نہ ہوا جو ان کی نشوونما کا سامان پیدا کر دیتا۔

اس لئے کہ ان تمام قوموں نے اپنے معاشرہ کو حیوانی قانونِ ارتقاء کے قانون پر قائم رکھا تھا جس میں بقا کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ لہذا قانونِ خداوندی کے مطابق ان کی ہلاکت یقینی تھی اس لئے کہ:-

افمن کان علی بینۃ من ربہ کمن زین لہ سوء عملہ واتبعوا اھواءھم ۔ (۴۷/۱۴)

جو قوم اپنے نشوونما دینے والے کے واضح قوانین کی حامل ہو ان جیسی کبھی نہیں ہو سکتی جن کے اعمال موثر ہیں ناہمواریاں پیدا کریں اور وہ ایسے مقاصد کے پیچھے چلیں جو پستی کی طرف لے جانے والے ہوں لیکن یہ اعمال و مقاصد انہیں دکھائی دیں بڑے خوش آیند کیونکہ وہ سمجھ رہے ہوں کہ یہ اعمال ان کی بقا اور استحکام کے لئے ہیں۔

انسانی زندگی میں عروج و زوال، ترقی و تنزل، صعود و ہبوط، آگے بڑھنے اور رک جانے اور رفتہ رفتہ فنا ہو جانے کا یہی اٹل قانون ہے اسی قانون کے مطابق امتوں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ جس قوم نے ایسا نظام قائم کر لیا جو نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہو (یعنی ان کی ربوبیت کا کفیل) وہ ارتقائے حیات میں ایک منزل آگے بڑھ گئی۔ اسی منزل کا نام جنت ہے جس کی ابتدا اسی دنیا سے ہو جاتی ہے لیکن جس کا خاتمہ موت کے ساتھ نہیں ہوتا کہ

زندگی جوئے روان است و رواں خواہد بود

یہ نظام صرف قرآن کے متعین کردہ خطوط پر متشکل کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ اس کی کوئی اور صورت نہیں۔ لیکن جو قوم نہ اپنی ذات کے لئے صحیح ثابت ہوئی نہ نوعِ انسانی کے لئے نفع، اس کی نشوونما کی تمام صلاحیتیں معطل کر دی گئیں۔

اولئک اصحب النار ھم فیھا خالدون ۔

تکملہ

مندرجہ صدر مضمون پڑھ کر ایک صاحب نے لکھا۔

آپ نے لکھا ہے کہ انسان سلسلۂ ارتقاء کی اوپر کی کڑی ہے۔ ارتقاء کا قانون یہ ہے کہ ایک علت (Cause) سے ایک معلول (Effect) پیدا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ علت و معلول مسلسل آگے چلا جاتا ہے چونکہ انسان کی ارتقاء (بقول آپ کے) مادہ سے ہوئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ انسان میں مادی تغیرات سے زیادہ کچھ نہیں۔ مادہ پرست بھی یہی کہتے ہیں۔ یہ کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

اگر یہ ارتقاء مادی ہے تو انسان کو مزید ارتقاء بھی مادی ہی ہونا چاہیئے کیا صراطِ مستقیم پر چلنے کے یہی معنی ہیں؟ یعنی جس طرح اس وقت تک ارتقاء ہوتا چلا آیا ہے اسی طرح آگے ارتقاء ہو۔

اس کا جواب حسبِ ذیل دیا گیا تھا۔ آپ نے غالباً قانونِ ارتقائے طبعی کا پورا پورا مطالعہ نہیں کیا۔ اس قانون کا اصول یہی نہیں کہ ایک علت سے اس قسم کا معلول پیدا ہو جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی شکل میں جاری رہتا ہے۔ یہ قانون نظریۂ ارتقاء کے ابتدائی دور کی پیداوار ہے بعد میں سائنس کی مزید تحقیقات نے یہ بتایا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک علت (Cause) اپنے سلسلہ کی کتنی ہی کڑیاں پھاند کر کسی ایسے معلول (Effect) تک جا پہنچتی ہے جس کو پہلے تصور بھی نہیں لیا جا سکتا تھا۔ یہ نتیجہ بالکل انوکھا اور یکسر غیر متوقع ہوتا ہے اس نظریہ کا نام جستی ارتقاء (Emergent Evolution) رکھا گیا ہے۔ نباتات میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی قسم کے بیج سے الگ رنگ قسم کے پھول پیدا ہو جاتے ہیں انہیں اصطلاح میں (Sport) کہتے ہیں۔ یہ واقعہ بڑا نادر الوقوع ہوتا ہے اس لئے اربابِ علم و تحقیق اس قسم کے (Sports) کی تلاش میں رہتے ہیں۔ انسانوں میں ایک فطین یا نابغہ (Genius) کی پیدائش اسی قسم کے (Sports) میں شمار کی گئی ہے چنانچہ اس باب میں (Hogben) لکھتا ہے:-

تیس سال کے تجربات سے ہمیں یہ سمجھنے کا بین ثبوت بہم پہنچ جاتا ہے کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر متوقع نسل کے اشخاص اسی قسم کے ذریعہ پیدا ہو جاتے ہیں جن کے خصائص اپنے آباء و اجداد سے بالکل مختلف ہوتے ہیں ان افراد کو

درحقیقت ان صلاحیتوں کا مرکب یا ذریعۂ شہود (پیکر) ہے اس لئے اصل انسانیت یہی صلاحیتیں ہیں (اس کی مزید تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے ان کی خصوصیات کا اہم نتیجہ انسانی اختیار و ارادہ ہے۔ اور جسم اس اختیار و ارادہ کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ) اب اس کا ارتقاء ان صلاحیتوں کے ارتقاء کا نام ہوگا پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے:-

ارتقاء کی اگلی منزل

انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل طبیعی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ہوگی پہلے پہل انسان ارتقاء کی منزلیں طے کرکے حیوانیت سے انسانیت کے درجے پر آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت و حرفت پر پورا کمال حاصل کر لیا ہے اب اس کے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبیعی ارتقاء نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کرکے انسان کے درجے میں قدم رکھے پھر اس کی جبلی ضرورتوں نے اس سے اوزار و آلات بنوائے اور وہ مشین اور انجن کا خالق بنا اسی طرح وہ آج مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ترقی کی طرف ہوگا۔

صرف ذہنی اور نفسیاتی ارتقا نہیں بلکہ ان کے ساتھ انسانی ذات (Personality) کا وہ ارتقاء بھی جو اس پر اس حقیقت کو منکشف کر دے کہ زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے اس لئے ہر فرد کی اپنی صلاحیتوں کے ارتقاء کا راز تمام افرادِ انسانیہ کی صلاحیتوں کی برومندی میں مضمر ہے (اسی کا نام نظامِ ربوبیتِ عامہ ہے جس کی طرف قرآن شروع سے دعوت دیتا چلا آرہا ہے) اور جو قرآنی نظام کا نقطۂ ماسکہ ہے اسی قسم کے جامع ارتقاء کو (کسی اور موزوں اصطلاح کے نہ ہونے کی وجہ سے) "ارتقائے انسانیت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے قرآن نے اس کے لئے تزکیۂ نفس* کی اصطلاح استعمال کی ہے لیکن چونکہ تصوراتِ عجم کی بدولت اس اصطلاح کا عام مفہوم بہ غیر قرآنی ہو چکا ہے اس لئے اس اصطلاح کو اس وقت تک استعمال نہیں کرنا چاہیے جب تک یہ غیر قرآنی مفہوم کی آئینہ داری بن جائے

Realisation, Growth and Development of Nafs (Self)

* یہی ہیں "تزکیۂ نفس" کے معانی۔

یعنی خارجی کائنات تو خود کار مشیت کے پروگرام کو پورا کر رہی ہے لیکن انسان اپنی دنیا میں اپنے اختیار و ارادہ سے اس پروگرام کو پورا کرتا ہے اس طرح خدا اور بندے میں باہمی رفاقت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے یعنی ایک عظیم القدر پروگرام کی تکمیل میں ایک دوسرے کے رفیق۔ بقول علامہ اقبالؒ۔

> اس مسلسل تبدیلی کے طریق میں خدا خود بندے کا رفیق بن جاتا ہے بشرطیکہ انسان اس میں پہل کرے إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ لیکن اگر وہ اس بات میں پہل نہیں کرتا اگر وہ اپنی خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا اگر وہ ابھرنے والی زندگی کے اندرونی تلاطم کا احساس نہیں کرتا تو اس کی روح پتھر کی سی کثافت اختیار کر لیتی ہے اور وہ انسان نہیں رہتا بلکہ جامد مادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (تشکیل جدید)

لیپزگ یونیورسٹی کا پروفیسر ہنس دریش (Hans Driesch) اس مقام کے متعلق کہتا ہے کہ جب یہاں پہنچ کر ہم اپنے آپ کو خدا کا سپاہی کہہ سکتے ہیں قرآن اس جماعت کو "حزب اللہ" کے نام سے پکارتا ہے۔ حزب اللہ وہ معاشرہ ہے جو قرآنی نظام ربوبیت کی رو سے متشکل ہوتا ہے۔

قوتِ فیصلہ

جس چیز کا نام ہم نے "نفخ روح خداوندی" کا نتیجہ رکھا ہے ذرا غور کیجئے کہ اس کی خصوصیت کیا ہے؟ قرآن نے اس نفخ روح کے بعد فرمایا کہ پھر انسان کو سماعت و بصارت اور فواد دیئے گئے۔ سماعت و بصارت وغیرہ حواس خارجی دنیا کی معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں یہ معلومات انسان کی داخلی دنیا میں ایک مقام پر پہنچتی ہیں جہاں سے مختلف امور کے فیصلے ہوتے ہیں۔ فیصلہ کرنے کا یہ وہ خصیصہ ہے جو حیوانات کی نقل و حرکت اس کے جبلی تقاضوں (Instinct) کی رو سے ہوتی ہیں لیکن انسان کے سامنے بیک وقت ایک سے زیادہ ممکنات (Possibilities) آتے ہیں ان ممکنات میں سے وہ صرف ایک کا انتخاب کر سکتا ہے اس انتخاب کو فیصلہ کہتے ہیں۔ اور یہ فیصلہ اختیار و ارادہ کی رو سے ہوتا ہے یہ ایک بنیادی خصوصیت ہے جو انسان کو حاصل ہے۔

انسانی جسم کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ خارجی دنیا کی معلومات حاصل کر کے "اندر" پہنچا دے اور پھر اندر سے جو فیصلہ صادر ہو اس کی تعمیل کرے۔ اس کے برعکس حیوانی سطح کی زندگی میں تمام تقاضے جسم کے ہوتے ہیں (انہیں جبلی خواہشات کہا جاتا ہے)۔ "اندر" کے فیصلے کو وہاں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

یہ دو چیزیں ہمارے سامنے آگئیں۔ ایک حیوانی سطح کی زندگی جس میں جسم کے تقاضے جبلی طور پر (Instinctively) پورے ہوتے رہیں اور انسانی اختیار و ارادے کو اس میں کچھ دخل نہ ہو۔ دوسرے انسانی سطح کی زندگی جس میں اصل شے انسانی فیصلہ ہو۔ جسم اس فیصلہ کرنے والی قوت کے لئے آلہ اور ذریعہ کا کام دے۔ اس اعتبار سے انسانی معاشرے کی تین شکلیں ہو جائیں گی۔

(۱) جس میں نہ جسم کے تقاضے پورے ہوں نہ قوتِ فیصلہ کے استعمال کے مواقع۔ یہ زندگی انسانی سطح تو ایک طرف حیوانی سطح سے بھی گری ہوئی ہوتی ہے۔

(۲) جس میں انسانی جسم کے تقاضے تو پورے ہوتے رہیں لیکن نفسِ انسانی کی تربیت و پرورش کا سامان نہ ہو۔ یہ حیوانی سطح کی زندگی ہوگی۔ اور

(۳) جس میں جسم انسانی کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں اور اس کے ساتھ ہی انسانی اختیارات کی قوتیں بھی زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جائیں۔ یہ انسانی زندگی کی سطح ہوگی۔ قرآن یہی زندگی عطا کرتا ہے۔ اس میں ہر وہ عمل جو انسانی اختیار کو وسعت و تقویت بخشتا ہے عملِ خیر ہوتا ہے (خیر و اختیار کا مادہ ایک ہی ہے)۔ لیکن چونکہ اختیار و ارادہ تخریبی مقاصد کے لئے بھی صرف ہو سکتا ہے اور تعمیری کے لئے بھی، اس لئے وہ اختیار و ارادہ کے استعمال کیلئے ایک روشنی، ایک میزان، ایک معیار بھی دیتا ہے تاکہ ہر اختیار تعمیری نتائج کا حامل ہو، تخریبی کا نہ ہو۔ یہ میزان ضابطۂ

قرآنی معاشرہ

آئینِ خداوندی (قرآن) ہے۔
لہٰذا جس معاشرے میں

(۱) انسانی جسم کے تقاضے بطریقِ احسن پورے ہوتے رہیں۔

(اکتوبر ۱۹۵۱ء)

دنیائے مذاہب میں انسانی زندگی کی تمام تگ و تاز کا منتہیٰ کیا ہے؟ انسان اپنے آپ پر اس قدر کڑی پابندیاں کیوں عائد کرتا ہے؟ یہ اس قدر کمر شکن مشقتیں کیوں اٹھاتا ہے؟ یہ بھوک اور پیاس کی جگر سوز تکلیف یہ مال اور جان کی ہوش ربا قربانیاں یہ غار و جبل کے جانگداز مراحل، یہ گریۂ نیم شبی اور آہِ سحری کے صبر آزما دن یہ تمام جد و جہد یہ ساری سعی و کاوش بالآخر کس غرض و غایت کے لئے ہے آپ کسی مذہب پرست انسان سے پوچھئے ان تمام سوالات کا ایک اور صرف ایک جواب ملے گا یعنی اس تمام تگ و تاز کا مقصود

مقصودِ سعی و کاوش

اس کد و کاوش کا منتہیٰ یہ ہے کہ کسی طرح نجات حاصل ہو جائے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی، ہر ایک کی مذہبی سعی و کاوش کا مطمحِ نگاہ ایک نقطۂ نجات کے سوا نہیں ہے۔ اسی کے لئے دعائیں ہیں۔ اسی کے لئے التجائیں۔ یہی تمام آرزوؤں کا مرکز ہے۔ یہی سب تمناؤں کا محور۔ آہِ سحرگاہی ہے تو اسی کے لئے اور نالۂ شبگیر ہے تو اسی کی خاطر۔ چمکتی ہوئی پیشانیوں کی سجدہ ریزیاں اور لرزتے ہوئے قلوب کی زمزمہ خیزیاں، دمکتی ہوئی آنکھوں کی شبنم فشانیاں اور تھرتھراتی ہوئی زبانوں کی تسبیح خوانیاں سب اسی ایک مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی ایک منزل تک پہنچنے کی راہیں ہیں۔ برہمن کے ناقوس ہیں، مُلا کی اذان ہیں، گرجا کی بانگِ جرس ہیں صومعہ کی پکاریں ہیں۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر اسی محملِ لیلیٰ کی تلاش اور اسی ناقۂ سلمیٰ کے سراغ کی تپش و خلش نہاں ہے۔

نجات حاصل ہو گئی تو سب کچھ مل گیا اور سب کچھ ملنے پر بھی نجات کی طرف سے ناامیدی رہی تو کچھ بھی نہ ملا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ نجات سے مقصود کیا ہے؟ اس لفظ کو تو ہم ہزار بار سنتے ہیں لیکن بالآخر اس کا مفہوم کیا ہے؟

نجات کا مفہوم

ہندو دھرم میں بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان اپنے موجودہ جنم میں کسی سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے اس کا نام آواگون (یا تناسخ) ہے جب تک اس سے گناہ سرزد ہوتے رہیں گے یہ چکر قائم رہے گا انسان کی تگ و دو کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اس آواگونی چکر سے مخلصی حاصل کر لے اسی کا نام ان کے نزدیک نجات (مکتی) ہے۔ یہ رہا ان کا دھرم۔ (یا شریعت) ان کے یوگ (طریقت یا تصوف) میں عقیدہ یہ ہے کہ انسان کی آتما (روح) درحقیقت پرماتما (روحِ مطلق۔ خدا) کا ایک حصہ ہے جو اپنے کل سے الگ ہو کر پراکرتی (مادہ) کی کیچڑ میں آ پھنسی ہے۔ آتما کا اپنے آپ کو اس مادی دلدل سے نکال کر پھر سے اپنی اصل کے ساتھ جا ملنا مقصودِ حیات ہے جب آتما اس طرح اپنے آپ کو مادی تلویث سے چھڑا لیتی ہے تو اس کا نام مکتی یا نجات ہوتا ہے۔

بدھ مذہب کے نزدیک بھی نجات کا یہی تصور ہے وہ کہتے ہیں کہ انسانی روح اس دنیا کے جیل خانے میں پھنس رہی ہے جس میں ہر طرف کشش و جاذبیت کے پھندے پھیلے ہوتے ہیں ان کے نزدیک انسان کی ہر آرزو ایک تکلیف کا پیش خیمہ ہے جوں جوں آرزوئیں بڑھتی جائیں گی تکالیف میں زیادتی ہوتی جائے گی اس لئے تکلیف کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آرزوؤں کو ترک کر دیا جائے۔ جب آرزوئیں کلیتہً فنا ہو جائیں گی تو انسان کی روح تکالیف کے بندھن سے آزاد ہو کر نروان حاصل کر لے گی۔ جہاں کامل سکوت و سکون ہو گا اسی کا نام نجات ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہوں کو ساتھ لئے پیدا ہوتا ہے اور ان کی پاداش میں دنیا کی تکالیف بھگتتا ہے کوئی انسان اپنے اعمال کی بدولت اس عذاب سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دیدی تاکہ وہ نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن جائے لہٰذا انسانوں کے لئے اس ازلی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ انسان حضرت مسیحؑ کے

کر دیا جاتا ہے زندگی کے ہر دوراہے پر نشانات کے کھمبے (Sign Posts) نصب کر دیئے جاتے ہیں
کا نشان بتا دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تمہاری اپنی سعی و عمل پر ہے کہ منزل تک پہنچو
جو وہاں تک پہنچ جاتا ہے وہ کامیاب ہے جو نہیں پہنچتا وہ نامراد و ناکام ہے۔ غور فرمایئے قرآن نے اس حقیقت کو کس
دلکش اور جامع انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۃ الدہر میں ہے:-

هل أتى على الانسان حين من الدهر لم يكن شيئاً مذكوراً (۷۶/۱)

انسان پر یقیناً وہ زمانہ بھی گزرا ہے جب وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ انسانی تگ و تاز سے مقصود یہ ہے کہ انسان
جس پہلی حالت میں تھا پھر وہیں پہنچ جائے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) تو قرآن کی رو سے اس کا مطلب یہ ہوگا
کہ وہ قابلِ ذکر انسان کے درجے سے پھر ناقابلِ ذکر شے کے درجے میں پہنچ جائے۔ اس قدر بیّن ہے یہ تصور!

اس کے بعد فرمایا۔

إنا خلقنا الانسان من نطفة أمشاج نبتليه فجعلناه سميعاً بصيراً (۷۶/۲)

ہم نے انسان کی تخلیق کی ابتدا مخلوط نطفے سے کی پھر اسے گردشیں دیتے ہوئے اس حالت تک لے آئے کہ وہ
سننے اور دیکھنے والا انسان بن گیا۔

مخلوط نطفے سے تخلیق درجۂ حیوانیت ہے لیکن انسان کو سماعت و بصارت (اور دوسرے مقام پر ہے فؤاد
(دل و دماغ) عطا کرنے کے بعد (۳۲/۹)) علم ہے ان صلاحیتوں کے ساتھ اسے راستے کے پیچ و خم سے آگاہ کر دیا۔ انا ھدینہ
السبیل (۷۶/۳)۔ اب یہ اس کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ راہ اختیار کرے جو اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کرے
کرے یا وہ راہ جو انہیں دبا کر برباد کر دے (اما شاکراً واما کفوراً) (۷۶/۳)۔ اس کے بعد کی آیات میں ہے
کہ صحیح راہ پر چلنے والوں کی منزل جنت ہے اور غلط راہ پر جانے والوں کا مقام جہنم۔ یعنی انسان جب دنیا میں آتا ہے
تو وہی قانونِ ارتقاء جو اس سے پہلے کی کڑیوں میں جاری و ساری تھا اس پر منطبق ہوتا ہے مغرب کے میکانکی تصور

حیات کی رو سے انسان اس سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی ہے اس سے آگے وہ زندگی کو طبعی تبدیلیوں سے زیادہ کچھ نہیں
مانتے لیکن قرآن اس مقام سے آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ علم و عقل کے یہ مدعی کس دھوکے میں پڑ گئے۔ زندگی کا
ارتقائی سلسلہ ختم نہیں ہو گیا حقیقی ارتقاء تو اب شروع ہوا ہے یہ منزل تو شعور و ادراک اور اختیار و ارادہ کی
اولیں منزل ہے یہ تو انسانیت کا گہوارہ ہے اسے ابھی اور بہت سی منازل طے کرنی ہیں

بہ زمینی آدم نگر از من چہ می پرسی ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں را دل از تاثیر او پر خوں شود روزے

خاک کے ذروں کا معراجِ کمال بیشک یہی تھا کہ وہ پیکرِ انسانی میں متشکل ہو جائیں لیکن معراجِ انسانیت کے لئے
تو ابھی سینکڑوں منازل اور باقی ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

انسانی ارتقاء

انسان نے اس حیاتِ ارضی سے بلند و بالا، ہیولیٰ مادی سے نفیس و لطیف اور امن محسوس
عنصر سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیتوں کو نشوونما دینا ہے وہ اعمالِ حیات جو
اس کے اندر اس بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیتیں بیدار کر دیں اعمالِ صالحہ کہلاتے ہیں یہ صلاحیت جس سے انسان
اس زندگی سے اگلی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے بہت بڑی کامیابی اور قابلِ قدر کامرانی ہے اس لئے قرآن نے
فلاح اور فوز کے الفاظ استعمال کئے ہیں فلاح کے معنی کھیتی کا بار آور ہونا ہے اور فوز کہتے ہیں (Achievement)
کو اصحٰب الجنۃ ھم الفائزون (۵۹:۲۰) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے قرآن کی رو سے زندگی کی حرکت دوری نہیں
بلکہ حیات صراطِ مستقیم پر جا رہی ہے وہ صراطِ مستقیم جو زندگی کو نشوونما دینے والے خدا کی راہ ہے (ان ربی علیٰ
صراط مستقیم) یہ راہ صرف آگے لے جانے والی ہی نہیں بلکہ بلندیوں کی طرف لے جانے والی بھی ہے کیونکہ
خدا کی یہ راہ ذو المعارج (سیڑھیوں والا) بھی ہے۔ وہ ہی سیڑھیوں (ارتقائی منازل) کی رو سے انسان
کو درجہ بدرجہ بلندیوں کی طرف لے جا رہا ہے لترکبن طبقاً عن طبق (۸۴:۱۹) تم یقیناً طبقاً عن طبق بلند ہوتے

مشہود و محسوس طور پر سامنے آجاتا ہے اسے یوم الجزا یا یوم الدین کہا جاتا ہے یعنی ظہورِ نتائج کا زمانہ۔ سورۂ نحل میں ہے :-

ولو یؤاخذ اللہ الناس بظلمھم ما ترک علیھا من دابۃ ولکن یؤخرھم الی اجل مسمی۔ فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون ()

اگر ایسا ہوتا کہ اللہ لوگوں کو ان کے ظلم پر (فوراً) پکڑتا تو ممکن نہ تھا کہ زمین پر کوئی چلنے والا باقی رہتا لیکن وہ انہیں ایک خاص ٹھہرائے ہوئے وقت تک مہلت دیتا ہے پھر جب ظہورِ نتائج کا وقت آپہنچتا ہے تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک گھڑی آگے۔

پانی کو آگ پر رکھئے وہ خاص طور پر تدریجاً حرارت جذب کرتا جائے گا حتیٰ کہ رفتہ رفتہ وہ اس نقطہ پر پہنچ جائے گا جہاں وہ کھولنے لگے گا اب اس کے اشتعال و اضطراب کو ہر آنکھ دیکھ لے گی۔ آپ مرض کے متعلق ڈاکٹر سے مشورہ کیجئے وہ کہہ دے گا کہ آپ بیشک درست کہتے ہیں کہ یہ مرض آپ کو ابھی محسوس ہوا ہے لیکن درحقیقت اس مرض کی ابتدا تو چھ ماہ قبل ہو گئی تھی آپ کو اس کا احساس اس وقت ہوا جب وہ شکایت ظاہر صورت میں نمودار ہو گئی۔

قانونِ تدریج فطرت کے قانون ارتقاء میں اس آئینِ تدریج و تاجیل (رفتہ رفتہ، وقتِ معین پر نتیجہ کے ظاہر ہونے کے قانون) کو بڑا دخل حاصل ہے۔ سطح بین نگاہیں سمجھتی ہیں کہ کچھ نہیں ہو رہا لیکن جو نگاہیں سطح سے نیچے اتر کر حقیقت کو بے نقاب دیکھتی ہیں ان پر صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس بظاہر سکون و سکوت کے نیچے کتنی قیامتیں کروٹ بدل رہی ہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ جس طرح طبعی دنیا ([illegible]) میں ہر عمل ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے اسی طرح معنوی دنیا میں بھی ہر عمل ایک نتیجہ کا منتج ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض نتائج انسان کی اسی زندگی میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں لیکن اگر قانونِ تدریج و امہال کے مطابق ظہورِ نتائج کا وقت اس زندگی میں نہیں آتا تو یہ نتائج اس کے بعد کی زندگی میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ حیات مسلسل حرکت کا نام ہے اور اس میں کہیں انقطاع نہیں اس لئے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ کسی عمل کا

(فولاد) کو بھی نازل کیا ہے۔ (دیکھئے سورۂ حدید) اس لئے حق کی حمایت کرنے والی جماعت سے یہ کہہ دیا کہ حق
کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ (۸/۶۰) مخالفین کے مقابلے کے لئے قوت
فراہم کرو۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ اس دنیا میں اعمال کے نتائج مادی ذرائع کی رو سے مادی

طبیعی قوانین دونوں پر یکساں

پیکروں میں ہی نمودار ہوں گے۔ اس حد تک مومن اور کافر دونوں برابر ہیں۔ ایک مادہ پرست
قوم اگر قوت فراہم کرے گی تو اس کے ہاتھ میں بھی سلطنت و حکومت اسی طرح آجائے گی جس
طرح ایک خدا پرست قوم کے ہاتھ میں لیکن اس کے بعد ان دونوں میں فرق شروع ہو جائے گا۔ وہ قوم جو قوانین
خداوندی سے بیگانہ ہوگی وہ قوت و حکومت کو انسانی معاشرے میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے لئے استعمال کرے گی
اس کے برعکس حکومت و سلطنت کو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ رکھنے والی قوم اس حکومت کو نظام ربوبیت
کے قیام کا ذریعہ بنائے گی تاکہ ہر فرد انسانیت کی نشوونما کا انتظام ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس قوم کے ان اعمال کے بھی تو
نتائج مرتب ہوں گے ان میں سے جن اعمال کے نتائج یہیں مرتب ہو جائیں گے ان کا ظہور مادی پیکروں میں ہوگا جن
کا ظہور آگے جا کر ہوگا وہ وہاں کے قوانین و ضوابط کے مطابق متشکل ہوں گے۔ وہاں معنوی نتائج بھی محسوس ہو
کر سامنے آجائیں گے کیونکہ وہاں کا قانون یہ ہے کہ فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید (۵۰/۲۲) جب آنکھوں
سے پردے ہٹا دیئے جائیں گے اور نگاہیں تیز ہو جائیں گی جس سے مستور حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں گے۔

(وبرزت الجحیم لمن یری)

ہم کائنات کے آئینی سلسلہ پر غور کیجئے۔ کائنات میں تخریبی اور تعمیری دونوں قوتیں کارفرما ہیں۔ تعمیری
قوتیں فطرت کے تقاضے کے نشوونما کا ذریعہ بنتی ہیں لیکن تخریبی قوتیں ان کے ضعف و انتشار میں کوشاں رہتی ہیں۔

تخریبی اور تعمیری قوتیں

جب تعمیری قوتیں غالب رہیں تو نشوونما کا سلسلہ جاری رہتا ہے اگر تخریبی قوتیں
غالب ہو جائیں تو نشوونما رک جاتی ہے اور رفتہ رفتہ اضمحلال و پژمردگی شروع ہو جاتی ہے۔

انسانی جسم میں اس تعمیری قوت کا نام توانائی (Vitality) ہے۔ اور تخریبی قوتیں جسم میں مختلف جراثیم ہیں جو تعدیہ (Infection) سے پیدا ہوں یا غلط غذا کے کھانے سے جسم کے اندر زہریلی دبائی صورت میں پرورش کر کے آجاتے ہیں یہ جراثیم نفسِ میں پھیلے رہتے ہیں اور ہر جسم پر حملہ کرتے ہیں جس شخص کی توانائی زیادہ ہو اس پر جراثیم اپنا اثر نہیں کر سکتے یا یوں کہئے کہ وہ توانائی ان کے تخریبی اثرات کی مدافعت کر دیتی ہے جب یہ توانائی کم ہو جاتی ہے جراثیم غلبہ پا جاتے ہیں اسی کا نام ابتداً بیماری، اور اس کے بعد (ان کے مسلسل غلبہ کے بعد اسی کا نام) موت ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہی قانونِ فطرت جوہرِ انسانیت کے نشو و نما میں کارفرما ہے انسان کا ہر عمل نتیجہ خیز ہوتا ہے یعنی اس کی ذات پر ایک اثر مرتب کر دیتا ہے یہ وہ اعمال نامہ ہے جو ہر شخص کی گردن میں حمائل رہتا ہے اس کے ہاتھ پاؤں بلکہ خود اس کی اپنی ذات شاہد ہے۔ یہ اثرات یا تو توانائی پیدا کرنے والے ہوتے ہیں یا تخریب کا سبب یعنی انسانی اعمال یا ایجابی (Positive) اثر مرتب کرتے ہیں یا سلبی (Negative) بقول اقبال وہ انسانی ذات (خودی) کے استحکام و استقلال کا موجب ہوتے ہیں یا اس کے اضمحلال و تخریب کا باعث۔ لیکن سلبی ہوں یا ایجابی بلا نتیجہ کوئی عمل نہیں رہتا۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ (۹۹/۷-۸)

جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھی ایجابی عمل کرے گا اس کا نتیجہ سامنے آئے گا اور جو ایک ذرے کے برابر تخریبی عمل کرے گا اس کا بھی نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا۔

یہ عملِ تعمیر و تخریب جاری رہتا ہے یہ "کشمکشِ خیر و شر" ہر آن موجود رہتی ہے ان نتائج کا توازن (میزان) ہر وقت ہوتا رہتا ہے اگر تعمیری نتائج کے اعمال کا پلڑا بھاری ہو تو انسان کی نشو و نما جاری رہتی ہے اگر وہ ہلکا ہو جائے تو نشو و ارتقا کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ فمن ثقلت موازینہ فاولئک ہم المفلحون۔ جس کی تعمیری قوتوں کا پلڑا بھاری رہا اس کی کھیتی بارآور ہوگی۔

ومن خفت موازینه فاولئك الذین خسروا انفسهم اور جس کا پلڑا ہلکا ہو گیا تو اس کی ذات (نفس)
وہ مستحکم نہ بن سکی۔ انسانی خودی کی (Disintegration) ہو گئی اس کا نام جہنم ہے۔
فی جہنم خالدون (۲۳:۱۰۳) یہی ہیں جہنم میں رہنے والے۔

جن لوگوں کی تعمیری قوتوں (حسنات) کا پلڑا بھاری ہوتا ہے اس میں تخریبی قوتیں یکسر معدوم نہیں ہو جاتیں وہ قوتیں موجود ہوتی ہیں لیکن تعمیری قوتیں ان کے عمل تخریب کو غالب نہیں آنے دیتیں اور اس طرح ان کا توازن قائم رہتا ہے اس عمل کا نام قرآن کی اصطلاح میں مغفرت ہے مغفرت کے معنی ہی حفاظت ہیں اس حقیقت کو قرآن نے مختلف انداز میں پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ ان الحسنات یذھبن السیات (۱۱:۱۱۴) توازن قائم رکھنے والے اعمال، توازن بگاڑنے والے اعمال کے تخریبی اثرات کو زائل کر دیتے ہیں دوسری جگہ ہے:-

مغفرت

ومن یؤمن باللہ ویعمل صالحاً یکفر عنه سیاته ویدخله جنت ...... ذالك الفوز العظیم۔ (۶۴:۹)۔

جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے، ہمواری پیدا کرنے والے کام کرے تو اللہ کا قانون ان کے توازن بگاڑنے والے اعمال کے اثرات کو زائل کر دے گا اور ان کی صلاحیتوں کی بنا پر انہیں، "جنت" میں داخل کر دیگا۔
...... یہ بہت بڑی (Achievement) ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ خدا کا قانون تخریبی قوتوں کے اثرات کو زائل کر کے ان کی حالت کو صلاحیتوں سے ہم آغوش بنا دے گا۔ واصلح بالھم (۴۷:۲)۔

جو طالب علم امتحان میں ساٹھ فیصدی نمبر حاصل کر لے اسے اگلی کلاس میں جانے کے قابل سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کی چالیس فیصدی غلطیاں اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتیں (Pass Marks) کی یہ (Percentage) اس قانون کے مطابق مقرر ہوتی ہے جسے قانونِ مشیت کہا جاتا ہے۔ یغفر لمن یشاء و

(جن میں ابدالآباد) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے خود لفظ عذاب اسی حقیقت کی تفسیر ہے۔ اعذاب کے معنی ہیں کسی کو کھانے پینے سے روک دینا۔ عاذب اس اونٹ کو کہتے ہیں جو شدتِ پیاس کی وجہ سے کھانا بند کر دے وہ اس سے اس قدر لاغر ہو جائے کہ اس سے چیزی جائے اور نہ ہی پھر کھانے پینے کی ہمت باقی رہے یعنی جو زندگی کی شیرینیوں سے اس درجہ محروم ہو جائے کہ اس میں پھر زندگی کی شیرینیوں سے متمتع ہونے کی صلاحیت ہی باقی نہ رہے۔

عذاب کے معنی

غور کیجئے! اس طرح نشوونما پا کر آگے بڑھنے والے کی تعمیری قوتوں کے ساتھ تخریبی اعمال کے اثرات بھی موجود تھے لیکن چونکہ اس میں تعمیری قوتوں کا غلبہ تھا اس سے تخریبی قوتوں کا اثر زائل ہو گیا اسی طرح جب تخریبی قوتوں کا غلبہ ہو گا تو پھر تعمیری قوتیں بیکار ہو کر رہ جائیں گی عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جب نیکیاں زیادہ ہو گئیں تو انسان سیدھا جنت میں چلا گیا یہ نہیں کہ پہلے برائیوں کی سزا بھگتنے کے لئے جہنم میں بھیج دیا جائے اور پھر قید کی میعاد پوری کرنے کے بعد جنت کی طرف منتقل کر دیا جائے یا اگر برائیوں کی زیادتی ہو گئی تو ایک مدت مدید تک جہنم میں رکھ کر پھر نیکیوں کی جزا کے لئے جنت میں بھیج دیا جائے یہ تصور قرآنی نہیں ہے نجات کا غیر قرآنی تصور ہے۔ چنانچہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے بالتصریح فرما دیا کہ جس کا پلڑا بھاری ہو گا وہ سیدھے جنت میں چلے جائیں گے اور جس کا پلڑا ہلکا ہو گا وہ سیدھے جہنم میں۔ نہ ان کی کمزوریاں انہیں عذابِ جہنم کی طرف لے جائیں گی نہ ان کی نیکیاں انہیں عذاب بھگتنے کے بعد جنت کی طرف منتقل کریں گی اسی لئے فرمایا کہ:۔

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (۲/۸۱)

یاد رکھو! قانونِ خداوندی یہ ہے کہ جس نے توازن بگاڑنے والے کام اس حد تک کئے کہ اس کی کمزوریوں نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا تو یہ لوگ سیدھے جہنم میں جائیں گے جس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یہ ہیں وہ کہ جن کے لئے میزان قائم کرنے کی بھی ضرورت نہ ہو گی (فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا) اس لئے کہ

؎ عذب کے معنی شیریں یا میٹھے پانی کے بھی ہیں۔

حبطت اعمالہم

لاخلاق لھم فی الآخرۃ (۳:۷۷) ان کا حصہ آخرت میں کوئی حصہ نہیں
اولٰئک حبطت اعمالھم ان کے تعمیری قوتوں والے اعمال سب ضائع ہو
گئے۔ حبط کے لفظ پر غور کیجئے۔ اگر کوئی مویشی اتنا کھالے کہ تیزی سے اس کا پیٹ پھول جائے اور اس کا چارہ بغیر
بدن میں جذب ہوئے بلکہ یوں ہی (غیر ہضم شدہ) خارج ہو جائے تو اس کیفیت کو حبط سے تعبیر کرتے ہیں۔ حبطت اعمالہم
کے معنی ہیں کہ سطح بین نگاہوں کو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ان کے اعمال کا وزن ہے لیکن چونکہ تخریبی قوتوں کی
زیادتی کی وجہ سے ان میں نشو و نما کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی اس لئے ان کی تھوڑی سی تعمیری قوتیں بے نتیجہ
ہو کر رہ جاتی ہیں۔ غور کیجئے جب انسان مرتا ہے تو اس میں اس وقت بھی کچھ نہ کچھ توانائی تو باقی ہوتی ہے لیکن یہ
توانائی اس کے کسی کام نہیں آتی کیونکہ تخریبی قوتیں اس درجہ غالب آجاتی ہیں کہ وہ نظام بدن کو درہم برہم
کر دیتی ہیں۔ جہنم میں بھی یہی ہو جاتا ہے جسے جنت میں جانے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ مرنا یعنی جسم
میں زندہ رہنے کی قوت نہیں رہتی۔ آگے بڑھنے سے رکتا ہی وہی ہے جس میں نشو و نما کی استعداد مفقود ہو جاتی
ہے۔ یہ استعداد کبھی تو بتدریج مفقود ہوتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ایک غلط قدم ان صلاحیتوں کو
سلب کر لیتا ہے۔ مثلاً خود مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ (ومن یقتل مؤمناً متعمداً فجزاؤہ جہنم خالداً فیہا ۴:۹۳)
جس نے کسی مومن کو بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یا مثلاً سورۃ انفال میں
جنگ بدر کے ضمن میں ہے کہ اللہ نے کہا کہ آج کے دن جو شخص میدان جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جائے گا تو
(ماواہ جہنم ۸:۱۶) تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اس قسم کا ایک غلط قدم نشو و نما کی ساری قوتوں کو تباہ کر دیتا
ہے جیسے سنکھیا کی ایک پھانکی عمر بھر کی خوراک سے حاصل کردہ قوتوں کو ایک لمحہ میں زائل کر دیتی ہے یا جیسے تیزاب کی
ایک چھینٹ ساری عمر کے لئے آدمی کو اندھا بنا دیتی ہے یعنی بعض تخریبی قوت اس قدر تیز اثر ہوتی ہے کہ عمر بھر کی
تعمیری قوتیں اس کے سامنے بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض تعمیری قوتیں اس قدر تقویت بخش ہوتی ہیں
کہ تخریبی قوتوں کا ہجوم بھی انہیں بے اثر نہیں کر سکتا۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ جوہرِ انسانیت کے نشوونما پا لینے کے بعد سلسلۂ ارتقا میں آگے بڑھ جانا جنت کی زندگی ہے اور نشوونما کی صلاحیت کے سلب ہو چکنے کے بعد سلسلۂ ارتقا میں رک جانے کا نام جہنم کا عذاب ہے۔ اور چونکہ کیفیت ایسی ہے جس میں نشوونما کی استعداد ہی باقی نہیں رہتی اس لئے جہنم سے سزا بھگتنے کے بعد جنت کی طرف منتقل ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ من ثقلت موازینہ فہو فی عیشۃ راضیۃ۔ واما من خفت موازینہ فامہ ھاویۃ (۱۰۱/۶-۹) نظامِ ارتقا کا اٹل قانون ہے۔

جو کچھ اس وقت تک لکھا گیا ہے اس سے اتنی بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ قرآنِ کریم کی رو سے کائنات میں سلسلۂ ارتقا جاری و ساری ہے یہی قانونِ ارتقا خود انسانی زندگی پر بھی حاوی ہے۔ موجودہ پیکرِ انسانی اس کے طبیعی ارتقا کی آخری کڑی ہو تو ہو لیکن جہاں تک اصل انسان یعنی اس کے جوہرِ شرفِ انسانیت کے ارتقا کا تعلق ہے۔ اس ارتقا (نشوونما) کا آغاز اسی زندگی سے ہو جاتا ہے اور طبیعی موت اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی جو اس سلسلہ میں اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے اس کی زندگی جنت کی زندگی کہلاتی ہے۔ جنت و جہنم سے مقصود ہی یہ ہے کہ کون آگے بڑھتا ہے اور کون پیچھے رہتا ہے۔ لمن شاء منکم ان یتقدم او یتاخر (۷۴/۳۷) جو تم میں سے چاہے آگے بڑھ جائے جو چاہے پیچھے رہ جائے۔ کل نفس بما کسبت رھینۃ (۷۴/۳۸) اس کا فیصلہ ہر شخص کے اعمال پر منحصر ہے۔ جہنم میں نشوونما نہ کیہ [illegible] رک جاتی ہے چنانچہ اہلِ جہنم کے متعلق سورۂ بقرہ میں ہے کہ ولا یزکیھم (۲/۱۷۴) اللہ ان کی نشوونما روک دیگا (نیز ۳/۷۶)

جنت اور جہنم مقام نہیں

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے چونکہ حیات مسلسل آگے بڑھتی ہے اس لئے جنت اور جہنم (آگے بڑھنے کی صلاحیت اور رک جانے کی حالتیں) اسی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے اسی لئے جنت یا جہنم کسی خاص مقام کا نام نہیں یہ کیفیات زندگی کی تعبیر ہے یہی وجہ ہے کہ جنت کے متعلق قرآن میں ہے کہ عرضھا السموات والارض (۳/۱۳۳) اس کی وسعت تمام کائنات (ارض و سماوات) کو

محیط ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جنت کسی خاص مقام کا نام نہیں۔ اسی طرح جہنم کے متعلق فرمایا کہ وان جھنم لمحیطۃ بالکٰفرین (9/49) جہنم نے کفار کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ دوسری جگہ ہے نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ (104/6-7) اللہ کی سلگائی ہوئی آگ جو دلوں پر چڑھ جاتی ہے۔

اس دنیا میں جنت اور جہنم کی آگ لگی ہوتی ہے۔ اسے ہم دیکھ بھی سکتے ہیں اور محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ قرآن نے متعدد مقامات پر اس کی تصریح کر دی ہے (یہ عنوان ایک مستقل موضوع ہے جس کے متعلق ضمنی طور پر کچھ کہنا کافی (فلہذا مفید) نہیں ہوگا اسے مستقل طور پر لکھا جائے گا) ان تصریحات کے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اصولی طور پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ قرآن کی رو سے ایک خاص اجتماعی نظام کے ماتحت جنت کی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ اور اس کے برعکس، غلط نظام اجتماعی (معاشرے) میں جہنم کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ جنت کی زندگی کے لئے شرط اولین وراثتِ ارض (یعنی اپنی مملکت) کا وجود ہے۔ جس میں کسی

دنیا میں جنت

دوسرے کا عمل دخل نہ ہو۔ چنانچہ سورۂ زمر میں اہل جنت کے متعلق ہے کہ

وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء فنعم اجر العاملین (39/74)

وہ (اس کیفیت کو دیکھ کر) پکار اٹھیں گے کہ ساری حمد و ستائش اس خدا کی ہے جس نے اپنے ان وعدوں کو ہم سے سچ کر دکھایا۔ اور ہمیں اس مملکت کا مالک بنا دیا۔ ہم اس جنت میں جہاں چاہیں رہیں، صاحبِ [illegible] ہیں۔ قوانینِ خداوندی کے مطابق کام کرنے والی قوموں کے لئے یہ کس قدر خوشگوار اجر ہے۔

اس مملکت میں قوانینِ خداوندی کے مطابق نظامِ ربوبیت کی ترویج و تنفیذ سے جوہرِ شرفِ انسانیت کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے اور یہی نشوونما جنت کی زندگی کا آغاز ہے۔ اس کے برعکس جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے غلط نظام میں یہ نشوونما رک جاتی ہے۔ وہ تقدم جہنم کی زندگی کی تمہید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جنت و جہنم کو اجتماعی زندگی کا مظہر بتایا ہے۔ جنت میں بھی قوموں کی قومیں داخل ہوتی ہیں (وسیق الذین اتقوا ربہم

فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین، جزاء بما کانوا یعملون (۳۲/۱۷)

کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے اعمال کے بدلے میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کیلئے جو کچھ پس پردہ چھپا ہوا ہے وہ کیا ہے؟

آج ان حقائق کا ادراک اور ان کوائف کا احساس ناممکن ہے لہٰذا ان کے متعلق قرآن کی بیان فرمودہ تشبیہات یا اشارات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اُس وقت یہ چیزیں مشہود پیکروں میں سامنے آجائیں گی۔ دوزخ والوں کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے مجسم ہو جائیں گے بایں ہمہ کہ نشوونما سے محروم رہ جانے والے جنت میں جانے والوں کی خوش بختیوں پر اپنے ہاتھ کاٹیں گے۔ اور فرطِ حسرت سے پکار اٹھیں گے کہ

یا لیتنی قدمت لحیاتی (۸۹/۲۴)

اے کاش! میں نے اس زندگی کے لئے پہلے سے کچھ بھیجا ہوتا۔

یہی وہ شدتِ احساس ہوگی جو اصل جہنم کی زندگی کو اس درجہ درد انگیز و کرب آمیز بنا دے گی کہ وہ پکار اٹھیں گے یلیتنی کنت ترابا۔ (اے کاش! میں ذی احساس انسان ہونے کے بجائے بے حس مٹی کا تودہ ہوتا)

اعراف قرآن کریم میں جنت اور دوزخ کے علاوہ ایک تیسرے مقام کا بھی ذکر ہے جسے اعراف کہا گیا ہے۔ اعراف اس زمین کو کہتے ہیں جو ہل چلا کر کاشت کے قابل بنائی جائے (لیکن ابھی اس میں کھیتی نہ اگی ہو) نیز بلند جگہ کو بھی اعراف کہتے ہیں جیسے زمین کی منڈیریں۔ ان کے متعلق ہے:۔

وعلی الاعراف رجال یعرفون کلا بسیمٰھم .... (۷/۴۶)

اس مقام پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک (اہل جنت و جہنم) کو ان کی پیشانی سے پہچانتے ہوں گے۔ وہ جنتیوں سے پکار کر کہیں گے تم پہ سلام ہو۔ وہ ابھی تک ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے لیکن اس کے آرزو مند ہیں۔

اور جب ان کی نگاہ جہنم والوں کی طرف مڑے گی تو کہیں گے کہ اے نشوونما دینے والے! ہمیں ان
ظالم قوم کے ساتھ شامل نہ کرنا۔

ابن مسکویہ کا نظریۂ ارتقاء

قرآن میں اہلِ اعراف کے متعلق مزید تصریح نہیں۔ ماہرین سلسلۂ ارتقا ہمیں بتاتے ہیں کہ پہلی منزل سے اگلی منزل کی طرف تدریجی ترقی کرتے وقت ایک درجہ ایسا بھی آتا ہے جس میں کچھ خصوصیات سابقہ منزل کی باقی ہوتی ہیں اور کچھ آنے والی منزل کی آجاتی ہیں۔ یہ درجہ دونوں منازل کے بین بین کا ہوتا ہے چنانچہ ابن مسکویہ نے (متوفی ۴۲۱ھ) جو حکمائے اسلام میں نظریۂ ارتقا کا محقق ہے، اپنے رسالہ الفوز الاصغر میں اس درمیانی منزل کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے نباتات کے تدریجی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

> پودا تدریجی ترقی کرتے کرتے کھجور کے درخت میں جاکر شرف ظہور کرتا ہے اور نبات کے مرتبہ اعلیٰ پر پہنچتا ہے کہ اس مرتبہ سے ذرا بھی بڑھے تو حدِ نباتی سے نکل جائے اور صورتِ حیوانی اختیار کرلے۔ خرما کے درخت میں نفس کا اثر اس درجہ قوی اور نمایاں ہوتا ہے کہ حیوان سے کثیر مشابہت اور قوی نسبت پیدا ہوتی ہے۔ یہ مثلِ حیوان کے اس میں نر اور مادہ ہوتے ہیں اور بارآور ہونے کے لئے نر کو مادہ سے ملنا ضروری ہوتا ہے۔ اس عمل کو تلقیح کہتے ہیں جو حیوانات کے جماع کے مثل ہے۔ پھر خرما کے درخت میں علاوہ جڑ اور رگوں کے ایک چیز مثل دماغ حیوانات کے ہوتی ہے۔ یہ اس کے لئے ایسی ضروری ہے کہ اگر اسے کوئی آفت پہنچ جائے تو درخت خرما تلف ہوجاتا ہے۔ بخلاف دیگر اشجار کے کہ ان کا صرف ایک ہی مبدا ہوتا ہے یعنی جڑ جو زمین میں قائم رہتی ہے جب تک جڑ باقی رہے گی درخت بھی رہے گا ورنہ ضائع ہوجائے گا۔

جس طرح حکیم موصوف بندر اور اس کے مثل اور حیوانات کو حیوانات اور انسان کی درمیانی کڑی قرار دیتا ہے اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اہلِ اعراف اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کی درمیانی کڑی ہیں یعنی ان میں نشوونما کی صلاحیت تو ہے لیکن وہ صلاحیت مشہود نہیں ہوئی وہ زمین ہل چلا کر کاشت کے قابل تو بنا دی گئی ہے لیکن اس میں ابھی

ان الذین سبقت لہم منا الحسنیٰ اولٰئک عنہا مبعدون ـ لا یسمعون حسیسہا وھم فی ما اشتہت انفسہم خالدون (۲۱/۱۰۱-۱۰۲)

وہ لوگ جن کے لئے ہمارے قانون کے مطابق توازن قائم رکھنے والی صلاحیتیں (پہلے ہی) آگے پہنچ چکی ہیں وہ اس (بے برگ و بار کر دینے والے مقام کی صعوبات) سے دور رکھے جائیں گے وہ اس کی آہٹ تک بھی محسوس نہیں کریں گے اور وہاں ان کے دل کی آرزوئیں پوری ہوں گی عارضی طور پر نہیں دوامی۔

دوام سے مراد

گذشتہ صفحات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے جنت اور جہنم میں قیام ہمیشہ کے لئے ہوگا (خالدین فیہا ابدا)۔ لیکن اس دوام اور ہمیشگی سے وہ ابدیت مراد نہیں جو صرف ذات خداوندی کے لئے مختص ہے۔ یہ دوام قانون مشیت کے ماتحت ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود میں جنت اور دوزخ دونوں کے متعلق فرمایا کہ خالدین فیہا ما دامت السموات والارض الا ما شاء ربک (۱۱/۱۰۷-۱۰۸) وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک کہ ارض و سماوات قائم ہیں مگر یہ کہ جو تیرے نشوونما دینے والے کے قانون مشیت میں ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ سلسلۂ ارتقاء میں پیچھے رہ جانے والی نوع کچھ عرصہ تک علیٰ حالہ باقی رہتی ہے پھر ختم ہو جاتی ہے۔ آگے بڑھنے والی نوع کچھ عرصہ تک اس اگلی منزل میں رہتی ہے اس کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ غیر منقطع ہوتا ہے۔

زندگی جوئے روان است و روان خواہد بود این مے کہنہ جوان است و جوان خواہد بود

لیکن اس غیر منقطع دوام کی ابدیت، خدا کی ابدیت کی طرح مطلق نہیں ہو سکتی۔

قرآن کی رو سے نظریۂ نجات کے متعلق یہ چند اجمالی اشارات ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کیلئے

۱؎ آیت (۱۰۸) میں اہل جنت کے متعلق الا ما شاء ربک کے بعد عطاءً غیر مجذوذ ہے یعنی غیر منقطع ہے۔

ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے (اس کے لئے میں نے معارف القرآن کی آخری جلد کو مخصوص کر رکھا ہے)۔
اس اجمالی اشارات کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد غور کیجئے کہ یہ تصور کس قدر علم و بصیرت پر مبنی ہے اور کیوں نہ ہو؟ قرآن اس خدا کی کتاب ہے جو علم حقیقی کا سرچشمہ اور دنیا بھر کو بصیرت عطا کرنے والا ہے۔ یہ آئینہ مقدس ذہنِ انسانی کی آمیزش سے پاک و صاف ہے۔ اس لئے اس میں جو کچھ ہے علم و یقین ہے۔ ظن و تخمین کا اس میں کہیں گذر نہیں۔ اس تصور کے برعکس اس نظریۂ نجات کو دیکھئے جو ہمارے ہاں عام طور پر مروج ہے۔ جو سراسر غیر اسلامی تصورات سے اخذ کردہ اور ذہن انسانی کی پیداوار ہے۔ جس میں ہر بات کو تمثیلی رنگ دے دیا گیا ہے۔ قرآنی تصور کی رو سے ہماری زندگی کی ایک ایک سانس میں "حساب و کتاب" پوشیدہ ہے۔ ہماری زندگی

قدم قدم پر قیامت

کے ایک ایک قدم پر میزان قائم ہے جس میں ہمارے اعمال تلتے اور ہمیں [illegible] زندگی کے پورے ملتے ہیں۔ بقا ان کے لئے ہے جو نوع انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہوں۔ (و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔ (۱۳/۱۷) یاد رکھو! باقی وہی رہتا ہے جو نوع انسانی کو نفع دیتا ہے۔ بقا اور نشوونما کے لئے صرف اپنی ذات میں اصلح (The fittest) ہونا ہی کافی نہیں، نفع بخش (سب سے زیادہ نفع پہنچانے والا) ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ "انفعیت" صرف نظامِ ربوبیت میں ممکن ہے۔ اگر معاشرہ نظامِ ربوبیت کے خطوط پر متشکل ہے تو اس میں ہر لمحہ جوہرِ انسانیت کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح ہمارے اندر باغ جنت کے شگوفے کھلتے اور پھول لہلہاتے چلے جاتے ہیں اور موت کا پردہ ان کی شادابی میں کہیں حائل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اگر ہماری زندگی نفسا نفسی (انفرادیت) کے انسانیت سوز آتشِ دوزخ میں

بقا الانفع

گذر رہی ہے تو مزرعِ حیات کی شادابیاں لمحہ بہ لمحہ خشک ہوتی چلی جاتی ہیں۔ وہاں تو نشوونما کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اور بدبختی ہے ان سوختہ سامانوں کے لئے جن کی جبینیں اس طرح جھلس کر رہ جائیں۔ حتی جعلنٰھم حصیدًا خامدین (۲۱/۱۵)۔

یہ بھی واضح ہے کہ حقائق قرآن کے متعلق جو کچھ ہم سمجھ سکتے ہیں اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں جوں جوں زمانہ تجارب و مشاہدات اور علم و بصیرت کے صحیح خطوط پر آگے بڑھتا جائیگا قرآنی حقائق اور بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ حتیٰ یتبین لھم انہ الحق۔ (۵۳/۴۱)۔

ثواب

(اکتوبر سنہ ۱۹۵۱ء)

انسان اپنا مفہوم الفاظ کے ذریعے بیان کرتا ہے اسی لئے اسے حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ رفتہ رفتہ الفاظ باقی رہ جاتے ہیں اور جس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے وہ وضع ہوئے تھے وہ مفہوم گم ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ چیز کچھ عجیب سی نظر آئے گی کہ الفاظ باقی ہوں اور ان کا مفہوم گم ہو چکا ہو لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو بادنیٰ تعمق ابھر کر سامنے آجاتی ہے متعدد الفاظ ہیں جنہیں ہم صبح سے شام تک بے تکلف استعمال کئے جاتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ بالآخر ان کا مفہوم کیا ہے؟ مذہبی دائرہ حیات میں اس قسم کے الفاظ کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔ مروجہ مذہب کو زندگی کے عملی مسائل سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا اس کے مباحث نظری (Theoretical) ہوتے ہیں اور نظری مباحث میں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کہ یہ سوچا جائے کہ جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مذہب، چونکہ انسان کے دورِ سحر (Magic age) کی یادگار ہے اس لئے اس میں سارا زور الفاظ پر دیا جاتا ہے ان کے مفہوم سے کچھ مطلب نہیں ہوتا۔

الفاظ بلا مفہوم

سحر کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ الفاظ بلا مفہوم کے الٹ پھیر اور اعداد سے نتیجہ پیدا ہو۔ تعویذوں کے الفاظ کو دیکھئے عجیب مہملات کا مجموعہ دکھائی دیں گے لیکن تعویذ لکھنے والے ان کی پابندی پر اس قدر زور دیں گے کہ اگر ایک حرف میں بھی رد و بدل ہو جائے تو وہ سمجھ لیں گے کہ اب نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ "الفاظ بلا مفہوم" یہ

"بے مذہب" کی صحیح تعریف۔

"مزعومہ مذہب" کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھا۔ وہ مذہب کے بجائے دین لیکر آیا تھا جسے آج کی اصطلاح میں آئینی نظام زندگی کہا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک نظام زندگی نظری مسائل سے نہیں بلکہ زندگی کے عملی مسائل سے بحث کرے گا۔ اور جب اس کی بحث کا دائرہ عملی مسائل حیات پر مشتمل ہوگا تو اس کے الفاظ واضح اور متعین مفہوم کے پیکر ہوں گے۔ اس میں الفاظ بلا معنی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکے گا۔ قانون دانوں کی دنیا میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا جس کا مفہوم ٹھیک ٹھیک متعین نہ کر دیا گیا ہو۔ اگر کسی لفظ کی تعریف (Definition) میں ذرا سا فرق ہو جائے تو اس سے پورے کا پورا قانون بدل جاتا ہے اسی لئے قانون کی کتابوں میں ہر لفظ کی تعریف متعین کر دی جاتی ہے۔ مثلاً چوری جرم ہے۔ مگر قانون کی کتاب میں پہلے یہ بتایا جائیگا کہ چوری کہتے کسے ہیں۔ اس لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ اس متعینہ مفہوم کے مطابق یہ فیصلہ ہوگا کہ فلاں عمل چوری کہہ سکتے ہیں یا نہیں (مثلاً عمل نہ)۔

متعین مفہوم

"مذہب" ایک نہیں۔ دین قانونی نظام زندگی اپنے ساتھ لایا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے ہر لفظ اور ہر اصطلاح کا مفہوم متعین ہوگا۔ بلا تعیین مفہوم نہ قانون قانون ہو سکتا ہے نہ آئین آئین۔ اسلام کا ضابطۂ آئین قرآن ہے اور قرآن کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ کا مفہوم خود متعین کرتا ہے اسی لئے وہ کتاب مبین ہے "مذہبی منتروں" کی کتاب نہیں ہے۔ لیکن جب قرآن کا دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو جس طرح ہر مذہب کی حالت ہے اس کے الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان الفاظ کا مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم صبح سے شام تک ان الفاظ کو دہراتے رہتے ہیں۔ لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ انہی الفاظ میں ایک لفظ ثواب بھی ہے مذہب پرست حلقوں میں دیکھئے بات بات میں اس لفظ کو دہرایا جاتا ہے۔ "یہ کرنے سے اتنا ثواب ہوتا ہے وہ کرنے سے اتنا ثواب ملتا ہے" جس بات کے متعلق پوچھئے کہ "ایسا کرنے سے کیا ہوگا" تو اس کا جواب یہی ملے گا کہ "اس سے ثواب ہوگا"۔ لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ صاحب ثواب ہوتا کیا ہے تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ اس کا کوئی معقول جواب آپ کو نہ

؎ اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے "اسباب زوال امت"۔

ثواب کیا ہے؟

ملے گا آپ کو یہ بات بظاہر تعجب انگیز ہی دکھائی دے گی۔ (اور ہر وہ بات جس پر پہلے پہل غور کرنے کی دعوت دی جائے تعجب انگیز نظر آیا کرتی ہے) لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ امر واقعہ ہے آپ دور نہ جائیے خود اپنے آپ سے سوال کر کے دیکھئے آپ نے بھی تو اس لفظ کو متعدد بار بولا ہوگا۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کے ذہن میں اس کا مفہوم کیا ہے آپ کو اپنے ذہن سے زیادہ سے زیادہ یہ جواب ملے گا کہ "ثواب" کوئی ایسی چیز ہے جس سے قیامت میں جہنم کے عذاب سے نجات ملے گی یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا کوئی اثر آپ کی ذات پر مرتب ہوتا ہو۔ یا جس کا تعلق آپ کی اس زندگی سے ہو اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے اور وہاں کے متعلق کہا نہیں جا سکتا کہ کیا ہوگا اور کیسے ہوگا۔ یہ "ثواب" کا وہ مفہوم جو آپ کے ذہن میں آئے گا یا آپ کو وہ شخص بتائے گا جس سے آپ اس کا مفہوم پوچھیں گے۔

غور کیجئے کہ یہ لفظ ایسا ہے جس کا استعمال بات بات میں ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم ایسا مبہم بتایا جاتا ہے جس سے کچھ پلے ہی نہیں پڑتا۔ کہ بات کیا ہوئی! آپ سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ مذہب پرست طبقہ یہ شکایت کرتا رہتا ہے کہ مسلمان اسلامی احکام کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کی زندگی مذہبی نہیں رہی، وہ اوامر اور نواہی کے پابند نہیں یہ لوگ شکایت تو مسلسل کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ اس کی

عمل کیوں نہیں ہوتا

وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ آپ ایک بچے سے تو اس طرح کام کرا سکتے ہیں کہ یہ کرو وہ نہ کرو۔ بغیر بتائے ہوئے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا۔ لیکن جب وہی بچہ صاحب فکر و شعور ہو جائے تو اس وقت آپ اس سے اس طرح احکام نہیں منوا سکتے اس وقت آپ کو بتانا ہوگا اسے سمجھانا ہوگا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا۔؟ "مذہب کی" بنیاد یہ ہوتی ہے کہ ان معاملات میں عقل کو کوئی دخل نہیں اس لئے کہ تم "کیوں"، نہ پوچھو جو کچھ کہا جاتا ہے چپکے سے کئے جاؤ انسانی ذہن اپنے عہد طفولیت میں تو اس طریق کار پر عمل پیرا ہو سکتا تھا لیکن جب وہ "کیوں" کے مقام تک پہنچ جائے تو پھر مجرد حکم اس کے لئے محرک عمل نہیں ہو سکتا۔ وہ حکم کی لم بھی سمجھنا چاہتا ہے چونکہ قرآن مذہب نہیں بلکہ دین ہے

کے ساتھ ساتھ مسلسل قائم رہے اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ اپنے سامنے ہمیشہ یہ آرزو رکھو ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ دنیا اور آخرت دونوں میں ایسی زندگی جس میں ہر شے کا توازن ٹھیک ٹھیک طور پر

مستقبل کی درخشندگی

قائم رہے قرآن کی رو سے نظام زندگی کے تین انداز ہو سکتے ہیں ایک وہ نظام جس کے خوشگوار نتائج انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ رواں دواں چلتے رہیں اور اس طرح یہاں سے وہاں تک شاہراہ حیات شگفتہ و شاداب رہے یہ ہے الدین کا وہ نظام جس میں ثواب الدنیا والاٰخرۃ دونوں حاصل ہوتے ہیں۔

دوسرا نظام وہ ہے جسے دنیا کی قومیں اپنی مصلحت کوشیوں کے ماتحت وضع کرتی ہیں اور جن کی نگاہیں صرف اسی زندگی تک محدود رکھتی ہیں اس نظام زندگی کے نتائج اسی دنیا تک محدود رہتے ہیں وما لہ فی الاٰخرۃ من خلاق۔ اس کے بعد کی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا یہ خالص دنیاداری کی زندگی ہے۔

نہ یہ نہ وہ

تیسرا نظام وہ ہے جس میں نہ اس زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں نہ اس کے بعد کی زندگی کی یہ ہے "مذہب کی زندگی" اس زندگی میں انسان سمجھتا ہے کہ اس دھوکے میں رہتا ہے کہ اگر ہماری موجودہ زندگی ذلت و خواری کی زندگی ہے تو کوئی بات نہیں یہ زندگی چند روزہ ہے مرنے کے بعد حیات ابدی کی ہمیشہ رہنے والی خوشگواریاں ہم ہی کو ملیں گی۔ لیکن قرآن کی رو سے یہ بہت بڑا دھوکہ ہے نفس کا فریب ہے وہ کہتا ہے کہ ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا۔ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے اعمال کا نتیجہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ الذین ضل سعیہم فی الحیٰوۃ الدنیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں غلط راہوں پر پڑ جاتی ہیں۔ وھم یحسبون انہم یحسنون صنعا۔ لیکن وہ بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک کام کر رہے ہیں۔ اولٰئک الذین کفروا بآیات ربہم ولقائہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو درحقیقت قوانین خداوندی کا انکار کرتے ہیں اس طرح کہ حقائق کا سامنا کرنے (To Face Realities) کی بجائے وہ ان سے گریز کی راہیں ڈھونڈتے ہیں۔ فحبطت اعمالہم ان کے کام بظاہر بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا نتیجہ کچھ نہیں

نہیں ہوتا۔ فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا۔ (۱۸/۱۰۲-۱۰۴) یہ اعمال ایسے بے نتیجہ ہوتے ہیں کہ قیام الساعت کے سلسلہ میں ان کا وزن تک معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی وہ بالکل بے وزن ہوتے ہیں۔ "مذہب پرست" خبطہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتا ہے کہ اگر ہماری آج کی دنیا خوشگوار نہیں تو نہ سہی آخرت کی نعمتیں تو ہمارے ہی لئے ہیں لیکن یہی ان کی بھول ہے قرآن کہتا ہے کہ

جو اس دنیا کا اندھا ہے اُس دنیا میں بھی اندھا ہی رہے گا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ آج کی دنیا ذلیل اور خوار ہو اور کل کی دنیا میں ساری سرفرازیاں انہی کے حصہ میں آجائیں لہذا۔ (۱) اسلام کے نظام حیات میں امروز اور فردا دونوں خوشگوار ہوتے ہیں ——— (۲) عام دنیاوی نظام میں صرف امروز خوشگوار ہوتا ہے ——— (۳) اور انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی دنیا میں نہ آج خوشگوار رہتا ہے نہ کل۔ ایک مقدس دھوکا ہوتا ہے اور بس۔ وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا۔ مسلمان صدیوں سے اس مقدس دھوکے میں مبتلا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے ثواب کے معنی ہیں:۔

اعمال حیات کے وہ زندہ اور مثبت نتائج جو محسوس شکل میں ہمارے سامنے آجائیں اور جس سے ہماری دنیا کی زندگی بھی خوشگوار ہو اور اس سے مستقبل کی زندگی بھی۔

جو اعمال حیات اپنے محسوس نتائج پیدا نہیں کرتے یاد رکھئے کہ ان کا کوئی ثواب نہیں ملتا ——— اب آپ اپنے لئے خود میزان قائم کر کے دیکھ لیجئے کہ آپ کے کون کون سے اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب ہوتا ہے اور کون کون سے ایسے ہیں جن کا کوئی ثواب نہیں ہوتا۔

اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ

(اکتوبر ۱۹۵۰ء)

ایک اہم اور اصولی بحث

حکومت پاکستان نے ایک زکوٰۃ کمیٹی مقرر کی ہے تاکہ وہ زکوٰۃ کی وصولی اور خرچ کے متعلق غور و تحقیق کرے۔ اس کمیٹی نے ایک سوالنامہ مرتب کیا ہے جو زکوٰۃ کی جزئیات سے متعلق بہت سے سوالات پر مشتمل ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی تعریف کیا ہے؟ کن کن لوگوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟ زکوٰۃ کس طرح ادا کرنی چاہیئے۔ زکوٰۃ کی رقم کن مصارف میں خرچ ہونی چاہیئے۔ کیا موجودہ حالات کے پیش نظر نصاب زکوٰۃ کی شرح میں تبدیلی کی ضرورت ہے وغیرہ۔ سکریٹری زکوٰۃ کمیٹی نے یہ سوالنامہ میرے پاس بھی بھیجا ہے کہ میں امور مستفسرہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ میں نے اس سوالنامہ کے جواب میں جو "یادداشت" سکریٹری زکوٰۃ کمیٹی کو بھیجی ہے اسے طلوع اسلام میں شائع کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا کیونکہ اس میں ایسے نکات آگئے ہیں جو اس مسئلہ کے بنیادی نقطہ نگاہ کو سامنے لاتے ہیں۔ سوالنامہ اور اس کا جواب انگریزی میں تھا۔ ذیل میں اس یادداشت کا اردو ترجمہ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

زکوٰۃ کمیٹی کی تشکیل اس کے متعلقہ فرائض اور سوالنامہ کی تفصیل سے ترشح ہوتا ہے کہ حکومت

تقاضوں کے مطابق قرآنی اصولوں کی روشنی میں مدون کرے اس نظامِ حکومت کی شریعت کہلائے گا ان جزئیات کے مدون کرنے میں ہر زمانے کی اسلامی حکومت ان جزئیات سے مدد لے سکتی ہے جو اس سے پہلے دور کی کسی اسلامی حکومت نے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق مدون کی تھیں یعنی سابقہ دور کی شریعت بعد کے دور کی اسلامی حکومت کے لئے بطور نظائر (Precedents) کام دے گی۔ قرآن کے ابدی اصولوں کی روشنی میں سب سے پہلی حکومت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی اور آپ کے بعد آپ کے خلفائے حقہ نے اس اسلامی حکومت نے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق قرآنی اصولوں کی جزئیات خود متعین کیں اگر یہ سلسلہ خلافت اسی طرح قائم رہتا تو ہر دور کے تقاضوں کے مطابق تدوینِ شریعت کا یہ سلسلہ بھی جاری رہتا لیکن وہ عہد ختم ہو گیا اور اس کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آگئی جس میں رفتہ رفتہ امورِ دنیاوی کو حکومت نے اپنے ذمے لیا۔ اور مذہبی امور کو ارباب مذہب کے سپرد کر دیا ان حکومتوں نے کبھی اپنی ضروریات کے لئے قوانین مرتب کر دیئے تو یہی اس وقت کے لئے شریعت اسلامی قرار پائے لیکن دین کو دنیا سے الگ کر دینے سے نظامِ اسلامی کی اصل میں خرابی آگئی اور ایسے قوانین بھی مرتب ہونے شروع ہو گئے جو قرآن کی واضح تعلیم کے خلاف تھے اب مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ جہاں جہاں ان کی اپنی حکومتیں ہیں امورِ سلطنت سے متعلق وہ حکومتیں اپنی منشاء کے مطابق قوانین مرتب کرتی ہیں لیکن امورِ مذہب کے متعلق (جسے Personal Law کہا جاتا ہے) مفتیوں سے فتاویٰ لے لئے جاتے ہیں اور جہاں ان کی اپنی حکومت نہیں وہاں یہی فتاویٰ انفرادی طور پر نافذ ہوتے ہیں۔ اگر آج ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان میں قرآنی منشا کے مطابق شریعت کا نفاذ ہو تو اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہم قرآنی اصولوں کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین خود متعین کریں یہی قوانین شریعتِ اسلامی کہلائیں گے نہ کہ وہ قوانین جو اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق کسی سابقہ اسلامی حکومت نے وضع کئے تھے۔

اس پس منظر کی روشنی میں اب زکوٰۃ کے اہم مسئلہ پر غور کیجئے قرآن ان اسباب و ذرائع کو جن کی مدد سے

کریں گے میں سے ظاہر ہے کہ قرآنی حکومت کا کام افرادِ ملت کو زکوٰۃ (سامانِ نشوونما) دینا ہوگا ان سے زکوٰۃ لینا نہیں ہوگا۔ لیکن بجائے زکوٰۃ (سامانِ نشوونما دینے) کے لئے حکومت کو آمدنی (REVENUES.) کی ضرورت ہوگی۔ سو اس نظامِ اسلامی حکومت کی تمام آمدنی ذرائع زکوٰۃ بن جائے گی اور اس آمدنی سے نظامِ ربوبیت قائم کیا جائے گا۔ اس اعتبار سے ملت کا ہر فرد "ایتائے زکوٰۃ" کی فریضہ کی ادائیگی میں شریک ہو جائے گا (یہ نظامِ ربوبیت کس طرح سے قائم کیا جائے گا یہ موضوع تفصیل طلب ہے اور مسئلہ زیرِ نظر کی حدود سے باہر ہے۔ اس لئے ہم سردست اپنے آپ کو زکوٰۃ تک ہی محدود رکھتے ہیں اگر حکومت نے اس کی ضرورت سمجھی تو اس نظام کی قرآنی تفاصیل بھی پیش کی جا سکیں گی)، قرآن نے زکوٰۃ کی اہمیت پر اس قدر زور دیا ہے لیکن اس کی تفاصیل کو کہیں متعین نہیں کیا۔ درحقیقت یہ ہے کہ اس اصولی نظام کی روشنی میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ان تفاصیل کے متعین کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ زکوٰۃ کا اصول غیر متبدل ہے لیکن اس کی جزئیات زمانے کی ضروریات کے مطابق ادلتی بدلتی رہیں گی لہٰذا آج جو اسلامی حکومت نظامِ ربوبیت کو قائم کرے گی وہ اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی مدات آمدنی کی جزئیات خود متعین کرے گی۔ اور اس طرح حاصل کردہ آمدنی کو ملت کی نشوونما (زکوٰۃ) پر صرف کرے گی۔ یہ جزئیات حکومت کی طرف سے عائد کردہ ہر ایک ٹیکس کی شرح انداز، طریق وصولی نیز اس آمدنی کے مناسب مخارج، اخراجات وغیرہ سب کو محیط ہوں گی۔ ہم ان جزئیات کی تمہید میں ان جزئیات سے بطور نظر زائد دیں گے جو اس سے پہلے کسی اسلامی حکومت نے اپنے دور کے لئے متعین کی تھیں اس طرح ہماری متعین کردہ جزئیات ہماری شریعت بن جائیں گی بشرطیکہ ان کی اساس قرآن کے غیر متبدل اصولوں پر ہو لیکن اگر یہ آمدنی قرآنی منشا کے خلاف وصول کی جائے یا اسے نظامِ ربوبیت کے خلاف مقاصد میں صرف کیا جائے تو یہ سب کچھ غیر شرعی ہو جائے گا۔

صدقات

قرآن نے زکوٰۃ کے علاوہ ایک اصطلاح صدقات کی بھی استعمال کی ہے اور اس کے لئے اس نے خرچ کی مدات کا بھی ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:-

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (۹/۶۰)

صدقات کا مصرف یہ ہے کہ وہ فقراء و مساکین کو دیئے جائیں اور ان لوگوں کو جو تحصیل صدقات میں کام کریں اور جن کے قلوب کی تالیف مقصود ہو نیز قیدیوں (یا غلاموں) کے رہا کرانے میں (دیئے جائیں) اور مقروض لوگوں کا تاوان (یا قرض) ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لئے۔

میں اس وقت مختلف مدات کی تشریح میں نہیں جانا چاہتا لیکن یہ حقیقت بادنیٰ تامل سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جن جن ضروریات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ ایسی ہیں جو ہنگامی حوادث یا اتفاقی حالات کے تحت پیدا ہوتی ہیں اور اسلامی سوسائٹی (جس کا فریضہ ہی ربوبیتِ عامہ ہے) کی مستقل ضروریات قرار نہیں پا سکتیں۔ مثلاً جیسے مغربی پاکستان میں پناہ گزینوں کا مسئلہ درپیش ہے یا کسی علاقہ میں سیلاب زدگان کی امداد کا سوال سامنے آ جائے وغیرہ۔ ایسی ہنگامی اور غیر متوقع (Unforeseen) ضروریات کے لئے حکومت کے مستقل بجٹ میں گنجائش (Provision) نہیں ہوا کرتی۔ اس قسم کی ہنگامی ضروریات ہنگامی ٹیکس کے ذریعے پوری کی جایا کرتی ہیں یا لوگوں کے عطیات سے۔ ہمارے ہاں صدقہ کسی بڑی مصیبت کے ٹالنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ عربوں میں عطیات کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا تھا۔ قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات میں عطیات بھی شامل ہیں اس لئے کہ اس نے صدقات کو علانیہ طور پر دینے کا بھی ذکر کیا ہے اور چھپا کر بھی (۲/۲۷۱) نیز یہ بھی کہا ہے کہ اپنے صدقوں کو احسان جتا کر اور جن کی مدد کی گئی ہے ان کی دل آزاری کر کے تعمیر کی جگہ تخریب (باطل) کا ذریعہ نہ بناؤ۔ (۲/۲۶۴) یہ صدقات خواہ ٹیکس کی شکل میں ہوں خواہ عطیات کی صورت میں ان کا وصول کرنا اور خرچ کرنا اجتماعی کام ہے جس کا ذمہ دار حکومت کو قرار دیا گیا ہے چنانچہ صدقات کے وصول کرنے کا واضح حکم قرآن میں موجود ہے (۹/۱۰۳) اور حکومت ہی کو اس کے صرف کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے (۹/۶۰)۔ اس قسم کے ہنگامی ٹیکس کی شرح کیا ہونی چاہیے؟ یا عطیات کی حدود کیا ہونی چاہئیں؟ قرآن اس کا تعین

ہوتا جو اوپر بیان کیا گیا ہے تو انہیں کوئی ایسی مشکل پیش نہ آتی جس کے لئے ناسخ و منسوخ کا غیر قرآنی عقیدہ وضع کرنا پڑا۔ قرآن کی اکملیت اسی میں ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کی ہر ارتقائی حالت سے متعلق مناسب احکام اپنے اندر رکھتا ہے جو معاشرہ (سوسائٹی) جس وقت اپنے آپ کو قرآنی نظام کے تابع لانا چاہے قرآن اس وقت کے ارتقائی مقام کے مناسب احکام دے دیگا۔ مثلاً ہم تقسیم ہند سے پہلے اپنے معاشرتی ارتقا میں جس مقام پر تھے قرآن میں اس سے آگے بڑھنے کے اصول دئیے گئے تقسیم کے بعد ہم جس حالت میں ہیں اس کے لئے بھی اس کے پاس ہدایت موجود ہے اور اس کے بعد اگر ہم نے اپنی زندگی کو قرآنی نظام کے تابع لانے کا فیصلہ کر لیا تو اس کے لئے بھی قرآن کے پاس ہدایت موجود ہے اس لحاظ سے قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور جس مقام سے کوئی سوسائٹی اپنے آپ کو قرآن کے تابع لائے قرآن اسے اس مقام سے آگے جانے کے لئے واضح روشنی عطا کر دیتا ہے اور کوئی مقام ایسا نہیں ہوتا جہاں پہنچ کر وہ کہہ دے کہ میں مزید ہدایت سے قاصر ہوں۔

ما حصل

زکوٰۃ و صدقات سے متعلق تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ قرآن کی رو سے

(۱) زکوٰۃ ان بنیادی مقاصد میں سے ہے جن کے لئے اسلامی حکومت کا قیام وجود میں آتا ہے

(۲) ایتائے زکوٰۃ سے مقصود ہے ایسا نظام قائم کرنا جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا پورا سامان موجود ہو۔

(۳) قرآنی حکومت کے تمام ذرائع آمدنی زکوٰۃ ہی کے مدات ہوں گے۔

(۴) قرآن نے ان مدات کی تفصیل معین نہیں کیں۔ ہر حکومت اپنی ضروریات کے مطابق انہیں خود متعین کرے گی

(۵) بعض ہنگامی اور غیر متوقع ضروریات کے لئے جو کچھ وقتی طور پر وصول کیا جائے گا۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں صدقات کہا جاتا ہے۔

(۶) صدقات ہنگامی ٹیکس یا عطیات پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔

(۷) صدقات کی شرح کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں۔ البتہ ان کی مدات خرچ کی ایک فہرست قرآن نے دی —

میں ذیلی مد کی تشریح کے مطابق اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

(۸) صدقات کی تحصیل اور صرف کا انتظام بھی حکومت ہی کے ذمہ ہوگا اور اس کے لئے جو عملہ متعین کیا جائے گا اس کے اخراجات اس مد سے لئے جائیں گے۔

یہ ہے میرے فہم قرآن کے مطابق مختصر الفاظ میں زکوٰۃ اور صدقات سے متعلق قرآن کی تعلیم کا ماحصل۔ ہمارے مروجہ نظریہ کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے زکوٰۃ و صدقات کو ایک ہی چیز سمجھ رکھا ہے اور صدقات سے متعلق احکام و تفصیل کو زکوٰۃ کے احکام قرار دے لیا ہے حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے بہ نہایت وضاحت سے ان دو الفاظ کو الگ الگ استعمال کیا ہے۔ اگر صدقات سے مراد زکوٰۃ ہی ہوتی تو وہ صدقات کی جگہ زکوٰۃ ہی کا لفظ استعمال کرتا۔ قرآن میں غور کرنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک زکوٰۃ کا تصور صدقات سے الگ ہے۔ اسلامی معاشرہ کے ابتدائی دور میں صدقات کا عمومی مفہوم خیرات ہی تھا لیکن بعد میں جب اپنا نظام حکومت قائم ہوگیا تو صدقات سے مراد عطیات وغیرہ ہوگئے جو اسلامی حکومت بعض ہنگامی ضروریات کے لئے طلب کرتی ہے لیکن یہ ہنگامی عطیات ہوں یا دیگر مدات آمدنی ان سب کا سرچشمہ قلب کا یہ میلان ہے کہ ہم نے وہ نظام ربوبیت قائم کرنا ہے جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما کے لئے یکساں مواقع بہم پہنچائے جانے ہیں۔ یہ وہ ربوبیت ہے جس کا مقصد متعین کرتے ہوئے فرمایا کہ یمحق اللہ الربوٰ ویربی الصدقٰت۔ (۲/۲۷۶) خدا اس معاشی نظام کو محو کر دیتا ہے جس میں دوسروں کی آمدنی کو اپنی پرورش کا ذریعہ بنایا جائے اور اس نظام کو بڑھاتا ہے جس میں ہر فرد کی ربوبیت پیش نظر ہے۔
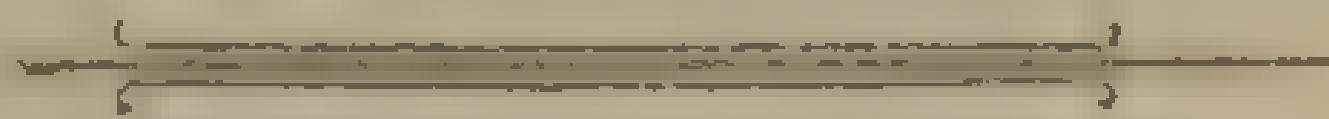
میثاقِ خداوندی

(جولائی ۱۹۴۹ء)

عام طور پر قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی حکومت کی ملازمت اختیار کرتا ہے تو اسے ایک پروانۂ تقرر دیا جاتا ہے جس میں اس کے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کی تصریح اور اس کے حقوق و حیثیت کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ اسے کہا جاتا ہے کہ وہ اس منشور کی ایک ایک شق کو بغور پڑھے اور اس کے بعد اپنے عہدۂ ملازمت کا چارج سنبھالے۔ گویا یہ منشور ایک عہد نامہ ہوتا ہے جو حکومت اور اس کے اعوان کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں اگر کہیں اسلامی حکومت قائم ہو تو اس کے عمال کو کس قسم کے منشورِ فرائض کا پابند ہونا پڑے گا اور وہ کون سا عہد نامہ ہوگا جس کی پابندی ان پر لازم ہو۔ اس منشور کی ترتیب کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اسلامی حکومت کا مدار قرآنی آئین پر ہوگا اور قرآن نے ان تمام فرائض و واجبات کی بھی تصریح کر دی ہے۔ جو اس حکومت کے اربابِ نظم و نسق پر عائد ہوں گے لہٰذا یہ منشور قرآن کے مطالب سے بآسانی مرتب ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ہم اسی قسم کے منشور کا ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ عمالِ حکومت کا یہ عہد نامہ ان کے اور حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ[1] (یعنی ان کے خدا) کے مابین ہوگا اس لئے ہم نے اس کا عنوان میثاقِ خداوندی مناسب سمجھا ہے۔

یہ میثاق یوں مرتب کیا جا سکے گا۔

---

[1] یہ لفظ (SOVEREIGN) کے مفہوم میں استعمال ہیں کیا گیا۔

۱۔ بنیادی اصول

تم ایک ایسی حکومت کے اربابِ حل و عقد کے زمرہ میں داخل ہو رہے ہو جو اس ابدی صداقت پر قائم ہے کہ

حکومت کی سزاوار صرف خدا کی ذات ہے۔ (۱۲/۴۰)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہیں اپنے معاملات اور کاروبار، احکام اور فیصلوں میں ان غیر متبدل قوانین کی اتباع کرنی ہوگی جو خدائے حکیم و بصیر نے انسانی معاملات کے حل اور اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے مرتب فرمائے ہیں اور اس اصل الاصول کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا ہوگا کہ تم اپنے ہر کام کے لئے اس خدا کے سامنے جوابدہ ہوگے۔

جو نگاہ کی خیانت اور دل کے رازوں تک سے باخبر ہے (۴۰/۱۹)

تم یہ عہد اپنے خدا کے ساتھ استوار کر رہے ہو اس لئے اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ اس کو ہر حالت میں نباہنا ہوگا وہ خدا جس کا ارشاد ہے کہ

نصیحت وہ صاحبانِ عقل و فکر حاصل کرتے ہیں جو اللہ کے ساتھ
بندھے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور قرار کو کبھی نہیں توڑتے (۱۳/۲۰)

۲۔ مقصدِ اولیٰ

تمہاری زندگی کا بنیادی اصول۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ (۲۲/۴۱)

ہونا چاہیئے یعنی خدا کے احکام کی تنفیذ جس چیز کا اس نے حکم دیا ہے اور اس حکم کو رائج کرنا اور جس سے اس نے منع کیا ہے اس سے لوگوں کو روکنا۔

۳۔ عمل

اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے ضروری ہوگا کہ پہلے تم خود ان احکام کی پابندی کرو اگر تمہارے قول و فعل میں تضاد اور احکام اور ہدایت میں تخالف ہوگا یعنی جو حکم تم دو خود نہ کرو گے ان کی ثبت

خود تمہارے عمل سے نہ ملے گی تو وہ ایمانداری نہیں۔ منافقت ہوگی اور حکومت خداوندی میں منافقین کو کوئی جگہ نہیں اس حکومت کا تو پہلا حکم یہ ہے کہ۔

> اے ایمان والو! تم وہ کچھ کہتے کیوں ہو جو کچھ خود کرکے نہیں دکھاتے! یاد رکھو اللہ کے نزدیک یہ طرزِ عمل نہایت مبغوض ہے کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جس کی تائید تمہارے عمل سے نہ ہوتی ہو (۶۱/۳)۔

۴۔ عدل

تمہیں لوگوں کے مقدمات میں محکم بننا ہوگا۔ ان کے نزاعی امور کے فیصلے کرنے ہوں گے۔ جب معاملات تمہارے پاس لائیں گے اس باب میں ہمیشہ یاد رکھو کہ۔

> اللہ کا حکم یہ ہے کہ .... جب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرو تو ہمیشہ عدل و انصاف سے کام لو (۴/۵۸)۔

خواہ یہ فیصلہ تمہارے دوستوں یا رشتہ داروں کے بھی خلاف کیوں نہ جائے کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ۔

> جب تم بات کرو تو عدل و انصاف کی کرو خواہ وہ تمہارا قریبی ہی کیوں نہ ہو اور (اس طرح) اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ (۶/۱۵۲)

بلا لحاظ اس امر کے کہ فریق متعلقہ امیر ہے یا غریب حتیٰ کہ اس کی زد خواہ تمہاری اپنی ذات پر بھی کیوں نہ پڑے

> اے ایمان والو! انصاف کی پوری حفاظت کرنے والے اور فقط اللہ کی خاطر شہادت دینے والے بنو خواہ معاملہ خود تمہاری اپنی ذات، ماں باپ یا قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو خواہ غریب ہو یا امیر۔ اللہ کا دونوں پر تمہارے رجحانات کی نسبت زیادہ حق ہے سو تم اپنے رجحانات و میلانات کی پیروی نہ کرو تاکہ تم عدل کر سکو۔ اگر تم سچی بات سے اعراض برتو گے یا گول مول بات کرو گے تو یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (۴/۱۳۵)

عدل! نہ صرف اپنے لوگوں کے ساتھ ہی بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل۔

اے ایمان والو! اللہ کے عہد نامہ کی حفاظت کرنے والے اور انصاف کی شہادت دینے والے بن
جاؤ۔ (یاد رکھو) کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو
(ہر صورت میں اور ہر شخص کے ساتھ انصاف کرو) یہی روش تمہارے [illegible] سے قریب تر ہے۔ (۵/۸)
صرف عدل ہی نہیں بلکہ مستحق لوگوں سے احسان بھی کرو کیونکہ

(تمہارا) اللہ عدل اور احسان (دونوں) کا حکم دیتا ہے۔ (۱۶/۹۰)

۵۔ امانت

یاد رکھو! اس ادارہ حکومت کی رکنیت قبول کر کے تم نے ایک بارِ عظیم اپنے ذمہ لیا ہے۔ یہ خدا کی امانت ہے۔ اس امانت کو نہایت دیانت داری سے پورا کرو۔ اسی طرح باہمی امانات کو بھی۔

اگر تم میں سے ایک شخص دوسرے کا اعتماد کرتا ہے تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے اسے چاہیئے کہ اپنی اس امانت
کو بحسن وخوبی پورا کرے (۲/۲۸۳)۔

اس لئے تمہارے خدا کا یہ حکم اور بھی واضح ہے کہ

امانات ان کے اہل تک پہنچایا کرو۔ (۴/۵۸)

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہر منصب اور عہدہ کے لئے معیار انتخاب اہلیت و قابلیت ہونا چاہیئے نہ کہ اقربا نوازی و قرابت پروری۔ مناصب و مدارج جن کا انتخاب تمہارے ذمہ رکھا گیا ہے خدا کی امانت ہیں ان امانات کو ان لوگوں تک پہنچاؤ جو ان کے اہل ہوں نااہل لوگوں کو منتقل نہ کئے جاؤ۔

جن جن معاملات میں تم پر اعتماد کیا جاتا ہے اس اعتماد میں پورے اترو۔

اور اپنے اعتماد کو ہمیشہ بحال رکھو کیونکہ تم جانتے ہو کہ عہد شکنی غداری ہے اور غداری سے قومیں تباہ
ہو جایا کرتی ہیں۔ (۸/۵۸)

اور شر انگیز سازشوں میں نہ الجھو کیونکہ مآل کار

شر انگیز سازش خود سازش کرنے والے پر ہی پلٹ پڑتی ہے جو اسے وضع کرتا ہے (۳۵/۴۳)

۶- باہمی تعاون

حسنِ نظم و نسق کا راز باہمی تعاون میں ہے لیکن تعاون فلاح و بہبود کے کاموں میں ہونا چاہیئے نہ کہ فتنہ و فساد کے کاموں میں۔ لہٰذا

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں باہمی تعاون کرو۔

برائی اور سرکشی کے معاملات میں تعاون نہ کرو۔ (۵/۲)

تم تمام عمالِ حکومت ایک ہی برادری کے افراد اور ایک ہی مشین کے پرزے ہو اس لئے تمہیں باہمی رقابتیں اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہرگز ہرگز نہیں ہونی چاہئیں۔ اگر تمہیں بعض مصالحِ وقت کی بنا پر خفیہ مشورے ہی کرنے ہوں تو مشورے جرم و بغاوت کے مشورے نہیں ہونے چاہئیں بلکہ نیکی اور

تقویٰ کے مشورے ہونے چاہئیں۔ (۵۸/۹)

اور نیکی و تقویٰ کے معاملات میں اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے کہ کوئی کہے تو دستِ معاونت بڑھاؤ۔ خود ہی بڑھ کر آگے بڑھو اور دوسروں کو اس میں شریک ہونے کی تاکید کرو اس لئے کہ مومنین ایسے ہی ہوتے ہیں۔

جو حق و استقامت کی تلقین و تائید کرتے رہتے ہیں (۱۰۳/۳)

ہر ایک کو اپنا اپنا کام اپنے عہدے کے مطابق کرنے دو۔ خواہ مخواہ دوسروں کے کاموں میں دخل اندازی نہ کرو لیکن اگر دیکھو کہ کسی معاملہ میں آپ کا کوئی ہم جلیس حقیقتِ حال سے بے خبر ہونے کی وجہ سے غلط فیصلہ کر رہا ہے تو اسے حالات سے باخبر کر دو۔ اس قسم کی دخل اندازی (سفارش) موجبِ فلاح و فوز ہو گی۔ اس لئے کہ

جو کوئی بھی بات میں سفارش کرے گا تو اس کو اس میں حصہ ملے گا اور جو کوئی

بری بات کی سفارش کرے گا تو اس کی پاداش میں بھی اس کا حصہ ہو گا (۴/۸۵)

محنت سے اس قسم کا مقام حاصل کر لو کہ اسلامی حکومت میں
ہر شخص کو اس کی کوشش کا صلہ ملتا ہے۔ (۵۳/۳۹)

۱۰- مختصراً اپنے تمام ارادوں اور فیصلوں، کام اور تدبیروں میں ہمیشہ اس اصل اصول کو پیش نظر رکھو کہ جس حکومت کی مشینری کے تم پرزے ہو اس کا قیام اس مقصد کے حصول کے لئے عمل میں آیا ہے کہ وہ قیام صلوٰۃ (یعنی شرف انسانیت کے استقرار کا ذریعہ بنے) ایتائے زکوٰۃ (یعنی تمام لوگوں کی معاشی ضروریات کی بہترین کفیل ہو) ہمیشہ نیکی کو پھیلانے اور برائی کو روکنے کی تدابیر کرے اور تمام معاملات خدا کی طرف رجوع کرے۔ (۲۲/۴۱)۔

اور کبھی نہ کہو کہ جب دوسرے لوگ غلط راہ پر چل رہے ہیں تو میں بھی کیوں نہ انہی کی روش پر چلوں۔ یاد رکھو! تم پر (سب سے پہلے) تمہاری اپنی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جو غلط راہ پر چل رہا ہے وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا اگر تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو تو تم سب کو خدا کی طرف لوٹنا ہے (اس لئے کہ تم تمام ارکین حکومتِ خداوندی اپنے معاملات میں خدا کے سامنے جوابدہ ہو) وہ تم سب کو بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے تھے۔

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اس منشور کا جو اسلامی حکومت کے عمال کو دیا جائے گا کہ وہ اس کے مطابق عمل کریں اور یہ ہے وہ عہد نامہ جس پر انہیں کاربند رہنا ہوگا۔
کس قسم کی جنت ہوگی وہ سرزمین جس پر ایسی حکومت قائم ہو جس کے عہدہ داران اور ارباب حکومت اس میثاقِ خداوندی پر عامل ہوں۔

باعظمت ہوگا وہ گوشہ جہاں سے یہ آواز بلند ہوئی ہوگی اور کیسی بے باک و پرخلوص ہوگی وہ زبان جس نے اس آواز کو بلند کرنے کی جرأت کی ہوگی۔ فی الحقیقت ایک بڑے انسان کی عظمت کا راز ہی اس میں ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے دھارے کے ساتھ نہیں بہہ جاتا۔ بلکہ ادراکِ حقیقت کے بعد ان کے ذہنی رجحانات کے دھارے کا رُخ موڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ گوشہ تھا عظیم آباد (پٹنہ) کا ایک محلہ، اور یہ آواز تھی "مولانا حافظ محب الحق صاحب" کی جن کی ذات کے ساتھ منتساب سے "شمس العلماء" کے خطاب نے بعد میں فخر حاصل کیا۔ اس مردِ مومن نے قریب ستر اسّی برس پہلے یہ آواز بلند کی اور پھر ساری عمر اسی دعوت کے عام کرنے میں صرف کردی اس آواز کی کس قدر مخالفت ہوئی ہوگی اس کا ہم صحیح اندازہ نہیں کرسکتے۔ اس لئے کہ آج مسلمانوں میں اس قدر مذہبی تشدد باقی نہیں رہا جو آج سے ستر اسّی برس پہلے تھا (یہ وسعتِ قلب کی بنا پر ہے یا مذہب سے تعلق کم ہوجانے کی وجہ سے، یہ الگ سوال ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ آج مذہبی تشدد میں بالعموم ایسا تشدد باقی نہیں رہا جیسا اس سے پہلے تھا) اس زمانہ میں عوام کے میلانات و معتقدات کے خلاف لب کشائی کرنا اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالنا تھا اور پھر لب کشائی بھی ایسے نازک مسئلہ میں جس سے مخالفین عوام کے نازک ترین جذبات کو فوراً مشتعل کردیں یعنی انکارِ حجیتِ حدیث اور دعوتِ اکملیتِ قرآن۔ اس مسئلہ کی نزاکت کا تو یہ عالم ہے کہ آج جب کہ (جیسا کہ ابھی ابھی لکھا جا چکا ہے) مذہبی تعصب بہت کم ہوچکا ہے عوام اور سب کچھ برداشت کرلیں گے لیکن جس شخص کے ساتھ منکرِ حدیث کا لیبل چسپاں کردیا جائے اسے کسی صورت میں بھی مسلمان ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے چنانچہ عوام کی یہی وہ دُکھتی ہوئی رگ ہے جس سے ہماری ملائیت فائدہ اٹھاتی رہتی ہے جب کبھی ان کے کسی مسلک کو قرآن کے خلاف ثابت کیجئے وہ اپنے مسلک کی تائید میں فوراً کوئی نہ کوئی روایت پیش کردیں گے اور جوں ہی آپ نے یہ کہا کہ جو روایت قرآن کے خلاف جاتی ہو اسے کیسے صحیح مان لیا جائے وہ فوراً منکرِ حدیث کا لیبل چسپاں کردیتے ہیں اس کے بعد کوئی شخص اس کی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ ہماری مُسلّمہ ملائیت و پیری کی ساری کی ساری عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے اور اس کی حفاظت عوام کے انہی نازک جذبات کے اشتعال سے کی جاتی رہی ہے اور آج بھی کی جارہی ہے غور فرمائیے کہ آج سے ستر اسّی برس ادھر اس آواز کو بلند کرنا کتنے بڑے حوصلہ و ہمت کا کام ہوگا یہی وجہ

اس کے بعد کتاب کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد ایک اور گرامی نامہ میں یوں فرمایا۔

میں نے معارف القرآن بالاستیعاب پڑھا۔ سبحان اللہ کیا کتاب لکھی گئی ہے۔ محض جزئیات میں کہیں کہیں اختلاف ہو تو یہ تو فطرتِ انسانی ہے جو قابل توجہ ہے۔ اس کتاب میں چند خصوصیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ سارے خیالات و اختلافات کو پیٹھ پیچھے پھینک کر خدا اور خدا کی صراطِ مستقیم نصب العین بنی ہے تاکہ خدا اسے قبول کرے مقبول کرے اور قوم کی نسبت اپنے ساتھ جوڑ دے جو اس کتاب کا نصب العین ہے۔ دوسرے اختلافات و نزاعات باہمی نے جو قرآن کے معنی بدل دیئے ہیں جو فطال علیہم الامد فقست قلوبہم کے اصول پر معانی قرآن محرف بنا دیا گیا تھا اس کی اصلاح ہو گئی ہے۔ تیسری ضرورت اور باقی ہونے کی امید ہے کہ قرآن کا یہ صحیح ترجمہ جس کی ضرورت قوم کو شدید در شدید ہے وہ انشاءاللہ پوری ہو جائے گی مگر افسوس یہ ضرور ہے کہ یہ ضرورت کئی جلدوں میں پوری ہو گی اس لئے اگر آپ کو ساری جلدوں کی تصنیف سے فرصت ہو گئی ہو تو اس کا موقع ہے کہ ساری کتاب جو ابھی غیر مطبوعہ ہے اس سے قرآنی الفاظ کے موزوں کی محنت کر کے قرآن کا ترجمہ شائع کیا جائے جو سارے ترجموں پر مقدم ہو اور جس کی تبلیغ آسان اور عام ہو سکے اور اس انقلابی دور میں جس کے مقبول اور صحیح ہونے کی فضا خدا نے پیدا کر دی ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ آپ مع الخیر ہوں میں بھی اب تک تو زندہ ہوں۔

قوم نہ بدلے گی اس کا دل نہ بدلے گا جب تک اس میں روحانیت اور پاکیزگی نہ آئے گی اور یہ چیزیں بغیر قرآن کی محبت کے حاصل نہیں ہونے کی۔ ضرورت اس طرف توجہ کرنے کی ہے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ قوم کو قرآن کی قرأت معانی و مفہوم کے ساتھ کرنے کی تبلیغ کی جائے زبانی بھی عملی بھی۔ ایسی صحبت نہیں بلکہ مسجدوں میں جمعہ کو چند لوگوں میں بطور مشورت پیش کرنے کا ڈھنگ نفاذ کیا جائے۔ افسوس کہ اس کی توفیق میں اب نہیں رہا۔

اس کے بعد یہ تعلق ایسا قائم ہو گیا کہ میں نے اس حقیقت کو اپنے سامنے محسوس پیکر میں دیکھ لیا کہ جو قلبی تعلق قرآن کے رشتہ سے استوار ہوتا ہے، اس سے زیادہ گہرا اور محکم تعلق اور کسی صورت میں ممکن نہیں۔

کہ اپنے یقین کے باوجود تم غلطی پر ہو۔ یقین اس بات کا کہ اللہ کے ہاں سے معافی کی امید ہو سکتی ہے پہلی صورت میں نہیں۔

چونکہ دن بڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی تمازتِ آفتاب بھی اس لئے کچھ دیر کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے یہ تھی وہ زرّیں صبح جو میری زندگی کے یادگار لمحات میں رہے گی ان ہستیوں کا وجود مغتنمات میں سے ہے ان کے بعد یہ کرسیاں خالی ہو جائیں گی اور ہماری آنکھیں اس روشنی کے لئے ترستی رہیں گی۔

تقویٰ اور دینداری کی بے داغ زندگی اور تمام عمر قرآن میں تدبر اور اس کی تبلیغ! یہ ان کے بعد کہاں ملے گا۔ مبارک تھیں یہ ہستیاں اور مبارک ہیں ان کے تذکرے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ذالک ہو الفوز العظیم

(ریڈیو کی تقریریں)

عقائد

(دسمبر ۱۹۳۸ء)

انسان نے جب دیکھا کہ وہ ان مخالف قوتوں کا جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں اکیلا مقابلہ نہیں کر سکتا تو اس نے ایک جگہ رہنے کا انداز زندگی اختیار کیا یہیں سے خاندان کی بنیاد پڑی۔ خاندان پھیل کر قبیلہ کی شکل اختیار کر گیا اور قبائل پھیلے تو اقوام بن گئے۔ اجتماعی زندگی کی ابتدا ہوئی تھی اس ضرورت کے تحت کہ کس طرح غیر انسانی قوتوں سے مدافعت کا سامان بہم پہنچایا جائے مثلاً جنگل کے درندے، ارضی و سماوی آفات و حادثات وغیرہ۔ لیکن جب باہمی مفاد کا تضاد ہوا تو خود ایک خاندان دوسرے خاندان کا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اور ایک قوم دوسری قوم کی دشمن ہو گئی۔ بلکہ عقائد بعض اوقات اشتراک مفاد کے ماتحت ایسا بھی ہوا کہ کچھ خاندان ایک طرف اور کچھ دوسری طرف ہو گئے۔ بعض قبائل نے باہمی اتحاد سے دوسرے قبائل کے مقابل متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ کچھ اقوام باہمی معاہدات سے ایک گروپ میں شامل ہو گئیں اور دوسری قوم فریق ثانی بن گئیں۔ انسانی زندگی کی سیاسی تاریخ پر غور کیجئے وہ اسی قسم کی گروہ بندیوں اور فرقہ سازیوں کی مسلسل داستان نظر آئے گی حتیٰ کہ آج بھی جب کہ انسان بزعم خویش فلسفۂ اجتماع اور سیاست مدن کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکا ہے تمام عالم انہی گروہ سازیوں کی دیگ بن میں مصروف تعمیر و تخریب ہیں۔ قومیت کی بنیاد آج بھی اسی طرح خون، رنگ نسل، زبان، وطن کے اشتراک پر ہے جس طرح انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں تھی۔ صدیوں کے تجربہ اور قرنہا قرن کے علمی ارتقاء کے باوجود یہ ان حدود سے بلند نہیں ہو سکا اور اس کا خمیازہ بھگت رہا ہے

اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھے گی جس کا قانونِ مکافاتِ عمل دل کے ارادوں اور نگاہ کی جنبشوں تک کو محیط ہے۔ اور جس کی رو سے زندگی کا سلسلہ سانس کی آمد و رفت تک ہی محدود نہیں، اس سے آگے بھی مسلسل چلتا ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف کا نام ایمان بالآخرت ہے۔

یہ ہیں عقیدہ یا (Ideology) کے وہ اجزائے ترکیبی جن سے اسلامی قومیت متشکل ہوتی ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جدید شعور کے مطابق اسلامی قومیت کی تشکیل سے مقصود کیا ہے۔ جیسا کہ شروع میں بیان کیا جا چکا ہے، انسان کے لئے اجتماعی زندگی بسر کرنے کا محرک جذبہ یہ تھا کہ وہ ان قوتوں کے شر سے محفوظ رہے جو اس کی ہلاکت کے درپے ہیں تو کیا اسلامی قومیت سے بھی یہی مفہوم ہے کہ اس اجتماعی حصار کے اندر اس کی فردی زندگی محفوظ رہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ تحفظِ ذات نہایت ضروری ہے اور اس کا جذبہ ہر ذی حیات کی فطرت میں داخل۔ لیکن اسلام کی رو سے محض زندہ رہنا مقصودِ زندگی نہیں۔ اگر محض زندہ رہنا ہی مقصد زندگی ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ارتقاء انسانیت پیکر انسانی میں پہنچ کر ترقی کی آخری منزل میں آگیا ہے اور اب اس کی مزید ترقیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ نظریہ اسلامی تعلیم کے منافی ہے۔ قرآن کی رو سے زندگی کا تصور حرکیاتی (Dynamic) ہے سکونی (Static) نہیں۔ اس لئے زندگی کا کسی مقام پر بھی آگے بڑھنے سے رک جانا اس کے نزدیک زندگی کی فطرت کے خلاف ہے۔ اسلامی قومیت سے مقصود ایک ایسی ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہے جو انسانیت کے قافلہ کو آگے بڑھاتی ہوئی چلی جائے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ اس جماعت کی پوزیشن ایسی ہو کہ یہ تمام دنیا کے انسانوں کے اعمال کی نگران ہو اور ان پر محتسب رہے۔ قرآن نے ملتِ اسلامیہ کے اسی منصب کو شہداء علی الناس کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ نگرانی اور احتساب اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ قوم تمام اقوامِ عالم سے زیادہ طاقتور اور انسانیت کی بلند ترین سطح پر ہو۔

یہ تھی وہ قوم جو انسانیت کے معلمِ اعلیٰ جناب محمد رسول اللہ کے مبارک ہاتھوں سے وجود میں آئی اور جس کی تکوین وحدتِ افکار و کردار پر مبنی تھی اس لئے اس میں کوئی اختلاف اور کسی قسم کا تفرقہ نہیں تھا۔ اختلاف و تفرقہ اس قوم کے منافی تھا لیکن تاریخ اس سے بڑی بوالعجبی کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ یہی قوم آج دنیا میں سب سے زیادہ

اختلافات کی مظہر اور تفرقہ انگیزی کا پیکر ہے۔ اس قوم کی بنیاد عقیدہ کی وحدت پر تھی لیکن عقائد ہی کے اختلافات سے ان میں بہتر اور درحقیقت بہتر سو فرقے موجود ہیں۔ اس قوم کی تشکیل وطنی اور نسلی امتیازات کو مٹانے سے ہوئی تھی لیکن آج وہی ملتِ واحدہ نسلوں اور وطنوں کے اختلافات سے سینکڑوں قوموں میں بٹ چکی ہے اور ہر ایک کو ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ اور ایک قوم کو دوسری قوم سے بعد و مغائرت ہی نہیں بلکہ عداوت اور مخاصمت ہے۔ دنیا کی قومیں وطنی و نسلی امتیازات کے مہلک نتائج سے تنگ آ کر عقیدہ یعنی (Ideology) کی بنا پر قومیت اور حکومت کی ترتیبِ نو کی تجویزیں سوچ رہی ہیں۔ اشتراکیت (Communism) یا عالمگیریت (Universalism) کی تحریکیں اسی زاویہ نگاہ کی ترجمان ہیں۔ ہمیں سردست اس سے بحث نہیں کہ یہ عقائد صحیح ہیں یا غلط۔ اس وقت کہنا صرف یہ ہے کہ دنیا اب آہستہ آہستہ وحدتِ فکر و نظر کی بنا پر تشکیلِ قومیت کی طرف آ رہی ہے اور دنیا کے مسلمان جو محض وحدتِ فکر و نظر کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد تھے اپنی قومیتوں کا مدار نسلوں اور وطنوں پر رکھ رہے ہیں۔ یقیناً سورج کی آنکھ نے اس سے بڑا تغیر کہیں نہیں دیکھا۔ سنی، شیعہ، حنفی، وہابی، مقلد، غیر مقلد، یا ایرانی، تورانی، مصری، شامی، افغانی، ہندی کے مقتدا اسلام کے خلاف ہیں یا نہیں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایرانی افغانی وغیرہ امتیازات بغرضِ تعارف روا رکھے جا سکتے ہیں لیکن ان کا مدارِ قومیت قرار پا جانا یکسر خلافِ اسلام ہے۔ مسلمان کی قومیت جغرافیائی حدود سے نہیں وحدتِ ایمان سے متعین ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک دنیا میں قومیں صرف دو ہیں مسلم اور غیر مسلم۔ ھو الذی خلقکم فمنکم کافر و منکم مؤمن (۶۴/۲)۔ نہ اسلام میں کوئی فرقہ ہو سکتا ہے کہ فرقہ سازی قرآن کی رو سے شرک ہے۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ حالتِ تشتت و افتراق سے جب مسلمان بے شمار فرقوں اور متعدد قوموں میں بٹ چکا ہے اس حالت کی طرف کیسے لوٹا جا سکتا ہے جب وہ ایک ہی جماعت اور ایک ہی قوم تھے۔ یہ چیز نہ تو مناظروں اور مباحثوں سے ہوگی اور نہ ہی اقوامِ مسلم کے باہمی روابط و اتحاد کی تحریکوں سے۔ ہوگی اسی طرح جس طرح سے پہلی

بارہویں تھی ان کے خدا نے ان کی وحدت کے لئے ایک ہی طریقہ بتایا تھا اور وہ یہ تھا: اعتصموا بحبل اللہ جمیعا۔ تم سب تمام کے تمام بلاتفریق رنگ و نسل قرآن کو اپنی حیاتِ اجتماعیہ کا مرکز مقرر کر لو اسی سے تمہارے قلوب میں باہم الفت پیدا ہو جائے گی (فالف بین قلوبکم) اور اسی سے تم بھائی بھائی بن جاؤ گے۔ (فاصبحتم بنعمتہ اخوانا) قرآن کی یہ مرکزیت عملاً اس طرح ہوگی کہ تمام دنیا کے مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں قرآنی ضابطۂ آئین کو اپنی حکومت کے قانون کی اساس قرار دے لیں قانون کی وحدت سے جسے حکومت کی وحدت کہنا چاہیئے قوم میں وحدت پیدا ہو جاتی ہے اور جب ساری دنیا کے مسلمانوں کا قانون ایک ہو جائے گا تو ان کی قوم بھی ایک ہو جائے گی اس طرح دنیا کی قومیتیں باقی رہیں گی بجز اس کے کہ ان سے مقصود صرف تعارف ہو اور نہ ہی مذہبی فرقے۔ اور یہ کچھ مشکل نہیں آپ نے حکومتوں کے لئے لامحالہ قانون مرتب کرنے ہیں ایک مسلمان کے لئے خدا کے قانون سے بڑھ کر اور کون سا قانون؟ جب یہ نتائج ہیں تو پھر کیوں نہ قرآن ہی کو قانون کی اساس بنایا جائے اگر مسلمانوں کی ہر حکومت اپنی جگہ یہ آئینی تبدیلی کرلے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد یہ تمام حکومتیں کس طرح غیر شعوری طور پر ایک ہی حکومت بن جاتی ہیں یہ ہے وہ طریقِ وحدت جسے خدا نے تجویز کیا اور اس کے رسول نے اسے عملی طور پر کر کے دکھایا۔ اس کے سوا اخوتِ اسلامی اور وحدتِ ملی کا اور کوئی طریق نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ جب ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

لیکن ؎

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمد کا تمہیں پاس نہیں

(۲) عالم اسلامی میں حج کی اہمیت

(نومبر ۱۹۴۸ء)

اس زمین پر جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے وہ ایک اہم سوال کے حل میں غلطاں و پیچاں نظر آرہا ہے۔ بظاہر یہ ہے کہ انسانوں نے باہمی مل جل کر رہنا ہے اور جب وہ مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اس تصادم اور ٹکراؤ سے فساد کی چنگاریاں اٹھتی ہیں جو ان کے خرمن امن و سلامتی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہیں۔ وہ سوال جس نے انسان کو ہمیشہ مضطرب و بے قرار رکھا ہے یہ ہے کہ کون سی شکل پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن و سلامتی سے رہ سکیں۔ انسانیت کی تاریخ اسی سوال کے حل میں مسلسل داستان ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے اس باب میں کیا کیا سوچا اور تجربہ نے اسے کس طرح غلط ثابت کر دیا۔ قرآن نے انسان کی اس کوشش اور کوشش کے مآل کو ایک چھوٹی سی مثال میں اس طرح واضح کر دیا ہے کہ نگاہ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے وجد و کیف سے جھوم اٹھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا ۔ تمہاری مثال اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور پھر خود اپنے ہی ہاتھوں سے اسے بکھیر ڈالا۔ قرآن کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھیے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کر کے دیکھیے کہ عبرت و موعظت کی کتنی داستانیں ہیں جو اس کے اندر لپٹی ہوئی ہیں اور انسان کی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے حوادث ہیں جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کے انسان کی جد و جہد کی تاریخ پر غور کیجیے وہ اپنے لیے ایک عظیم الشان نظام تمدن تعمیر کرتا ہے اس فلک بوس عمارت کی تکمیل

میں انسانیت کی تکمیل کا راز مضمر دیکھتے ہوئے وہ ایک عرصہ تک اپنے تصورات کی دنیا میں مخمور رہتا ہے لیکن یہ عمارت تکمیل تک کبھی نہیں پہنچ پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے کہ وہی انسان اس عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا دیتا ہے اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ حسین مرقع خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتا جس کی ٹھیکریاں اپنے مٹے ہوئے نقوش سے آنے والوں کو اپنی حدیثِ الم سے آگاہ کرنے کے لئے باقی رہ جاتی ہیں بابل اور نینوا، مصر اور یونان، چین اور ایران کے کھنڈرات کو چشمِ عبرت سے دیکھئے اور سوچئے کہ انسانوں نے اتنی محنت سے کاتتے ہوئے سوت کو کس طرح بار بار خود اپنے ہی ہاتھوں سے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔

ادوارِ سابقہ کی طرح عصرِ حاضر کے انسان نے بھی اس سوال کے حل میں دماغ سوزی کی اور اس کی فکر و کاوش کا نتیجہ نیشنلزم (قومیت پرستی) کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا جس پر اقوامِ مغرب اور ان کی دیکھا دیکھی دیگر اقوامِ عالم کی موجودہ سیاست کی بنیاد ہے۔ یورپ نے اس نسخۂ کیمیا کو اس قدر کامیاب قرار دیا کہ ان کے آئینۂ فکر میں قومی محبت (Patriotism) کو شرفِ انسانیت کی انتہا تصور کر لیا گیا ہے لیکن جنگِ اول نے بالعموم اور جنگِ دوم کے اسباب و علل اور نتائج و عواقب نے بالخصوص اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ جسے تریاق سمجھا جاتا تھا وہ انسانیت کے لئے زہرِ قاتل ہے چنانچہ اب دانایانِ مغرب اپنی اس سوت کی نئی کو خود اپنے ہاتھوں سے بکھیرنے کی فکر میں ہیں ڈاکٹر ہکسلے نے پچھلے سال ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا۔

> قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بہ حیثیت انسان کچھ نہیں سمجھتی دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس بھی ٹھہراتی ہے۔

اب اس مسئلہ کا حل یہ سوچا جا رہا ہے کہ مختلف اقوام کے گروہوں کو ملا کر متحدہ حکومتیں قائم کی جائیں حتیٰ کہ تمام اقوامِ عالم کی ایک مشترکہ حکومت قائم ہو جائے چنانچہ اقوامِ یورپ کو ایک گروپ بنا لینے کی تجویز، مجلس اقوامِ متحدہ اور ان کی حفاظتی کونسل کا قیام یا وَنڈل وِکی کا (One-World) کا تصور اسی انتہا کا نقطۂ آغاز سمجھا

جاتا ہے بہر حال اقوام مغرب کے موجودہ تصورحیات کے ماتحت عملی طور پر اس کا امکان ہو یا نہ ہو نظری طور پر اب یہی سمجھا جانے لگا ہے کہ اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ تمام دنیا کو ایک برادری تصور کر کے ان کے تمدنی مسائل کی پیچیدگیوں کا حل سوچا جائے چنانچہ ڈاکٹر (Gauld) اپنی کتاب (Man, Nature And Time) میں لکھتا ہے ۔

اب جو چیز بالکل نظری نظر آتی ہے وہ یہ کہ تمام نوعِ انسانی کی ایک منظم برادری قائم کی جائے ۔

یہ ہے وہ حل جس تک ذہنِ انسانی بیسویں صدی تک پہنچ سکا ہے لیکن آج سے چودہ سو سال پیشتر جب کہ دنیا کی یہ حالت تھی کہ ایک گاؤں کے رہنے والے دوسرے گاؤں کے باشندوں سے بھی بمشکل واقف ہو سکتے تھے قرآن نے یہ بتایا کہ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ چونکہ تمام نوعِ انسانی کو ایک قوم بن کر رہنا ہے اس لئے اس مقصد کے پیشِ نظر ان کے مفاد کے باہمی تصادم سے فساد کی چنگاریاں نہ ابھریں اس نے ایسی تعلیم بھیجی جس پر عمل پیرا ہونے سے فساد کا امکان نہ رہے چنانچہ اس نے حضرات انبیائے کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد جو اس تعلیم کے حامل تھے فرمایا کہ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ـــ کہ تمہاری امت ایک امت واحدہ ہے اور اس کی وجہ جمعیت اس حقیقت پر ایمان کہ ان سب کا پروردگار ایک ہے اور اس وحدت انسانی کی عملی شکل اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہ ہو سب انسان خدا کے قوانین کے محکوم رہیں یہ تعلیم اپنی آخری شکل میں قرآن کی رو سے انسان تک پہنچی جس کا مقصود تمام نوعِ انسانی کو ایک برادری تصور کر کے جمعیتِ اقوام کے بجائے جمعیتِ آدم کی عملی تشکیل کرنا ہے اگرچہ اسلام کے تمام احکام اور فرائض اسی مقصد کی طرف قدم بڑھاتے ہیں لیکن اس کی تکمیل حج کے اجتماع میں ہوتی ہے جو اسلام کا آخری رکن ہے ۔

حج سے مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان بلا تفریق رنگ و نسل اور بلا امتیاز وطن و زبان جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہے محکومیت صرف خدا کے قوانین کی جائز ہے جو انسان ان قوانین کا ترجمان ہو اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ

امیر کی زیر قیادت مرکزِ وحدتِ انسانیت یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو پھر یہ تمام امرائے ملت اپنے میں سے ایک امیر الامراء کا انتخاب کر لیں اور مختلف ممالک کے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایک ایسا پروگرام مرتب کر لیں جو آئندہ سال کے لئے عملی طور پر بطور منشور کے یہی اختیار کیا جائے اور جو امن و سلامتی انسانیت کا ضامن اور فلاح و سعادت آدمیت کا کفیل ہو ان کا منتخب کردہ امام اپنے خطبۂ حج میں اس پروگرام کا اعلان کر دے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے اس کے بعد یہ تمام نمائندگان مقام منیٰ میں جمع ہو کر اس عملی پروگرام کی تفصیلات و جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر اس کا عملی اثر اور ردعمل کیا ہو گا وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی جس کے لئے قربانی تجویز کی گئی ہے اس کے بعد یہ نمائندگان اپنے اپنے ملکوں میں واپس آجائیں اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں کو چلائیں یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن کریم نے تمام نوع انسانی کو ایک امت واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بتایا ہے قرآن حکیم نے حج کے اس مقصد و غایت کو دو مقامات پر دو دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے آپ ان مختصر ٹکڑوں کی جامعیت پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند اور کوئی انداز بیان اس سے زیادہ بلیغ بھی ہو سکتا ہے؟ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کے اجتماع سے مقصود یہ ہے لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں ان کے لئے کس قدر منفعتیں ہیں اور اس کی غایت؟

قِيَامًا لِّلنَّاسِ یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

غور کیجئے کیا دنیا میں کسی کانفرنس کسی اسمبلی کسی پارلیمنٹ کسی انجمن کا مقصد اس سے بھی بلند ہو سکتا ہے کہ وہ اجتماع دنیا میں شرف انسانیت کے قیام کا باعث ہو قِيَامًا لِّلنَّاسِ۔ کسی خاص قوم، خاص جماعت، خاص ملک، خاص ملت کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کے قیام کا باعث! یہ ہے حج کے اجتماع کا مقصد! لیکن شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج اقوام متحدہ کی مجلس (U.N.O.) کے اجتماعات میں تمام دنیا کی قوموں کے نمائندے جمع ہوتے ہیں اور ان کے سامنے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ دنیا میں امن و سلامتی ہے پھر یہ جماعتیں اپنے مقصد میں کیوں کامیاب نہیں ہوتے اور حج کے اجتماع میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر وہ اجتماع ایسے بلند و درخشندہ

مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے حج کے تمام ارکان میں فی الواقع یہ خصوصیت ہے اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ ایک بندۂ مومن
کی اس عہد و پیمان کی جو وہ اپنے خدا سے باندھتا ہے اور جس کی تجدید حج کا نقطۂ آغاز ہے۔ ایک بندۂ مسلم اپنے خدا سے اقرار کرتا ہے
اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ میری نمازیں اور میری قربانیاں، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ فقط
اللہ کے لئے ہے کسی اور غرض کے لئے نہیں۔ اور چونکہ اللہ کی ذات تمام زندگی کی روحانی اساس ہے لہٰذا اس عہد
پیمان سے مقصود یہ ہے کہ میری تمام جد و جہدِ زندگی ارتقائے شرفِ انسانیت کے لئے ہے۔ یہ ہے وہ اقرار جس کی تجدید اس
اجتماعِ عظیم سے پہلے تمام نمائندگانِ انسانیت خدا کا ادا کر کے خدا کے گھر یعنی ملتِ حنیفہ کے مرکزِ محسوس کے گرد گھوم کر کرتے
ہیں اور اس طرح زمین و آسمان کو بھی اس عہد پر گواہ ٹھہراتے ہیں۔ اس نصب العین کو دل میں لئے ہوئے یہ نمائندگانِ ذریۂ
انسانیت کی فلاح و سعادت کا پروگرام مرتب کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا عہد باندھتے ہیں۔ یہ ہے وہ خصوصیت جو دنیا
میں کسی اور اجتماع کو حاصل نہیں خواہ وہ اجتماعات، لمبے لمبے دعووں کے باوجود انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے
آج تک کچھ کر سکے ہیں نہ آئندہ کر سکیں گے۔ پہلی جنگ کے بعد اقوامِ مغرب نے جمعیت الاقوام (League of Nations)
کی طرح ڈالی لیکن علامہ اقبال کے الفاظ میں کفن چوروں کی یہ جماعت بری طرح سے ناکام ہوئی۔ واقعات اس پر شاہد ہیں
کے متعلق ([illegible]) اپنی کتاب Anatomy of Peace میں لکھتا ہے کہ لیگ آف نیشنز کی ناکامی کی وجہ یہ تھی
کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم کی گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ دنیا کے مختلف قوموں کے نمائندوں کو یکجا
کر کے باہمی بحث و تمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اقوامِ مغرب نے پھر اپنے ناکام
تجربے کو دہرایا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ لیگ آف نیشنز کا نام (United Nations Organisation)
رکھ دینے سے کامیابی ہو جائے گی۔ یہ جمعیت اقوامِ متحدہ کس بری طرح ناکام ثابت ہو رہی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے
کہ ابھی دو ہفتے ہوئے لندن کے اخبار ڈیلی میل نے لکھا ہے کہ یہ جمعیت اقوام اپنی موجودہ ہیئت میں امنِ عالم کے لئے سخت
خطرے کا موجب ہے اس لئے اسے فوراً ختم کر دینا چاہیئے اور اس کی وجہ (Mr. Reves) کے الفاظ میں
یہ ہے کہ ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم نے انسانی

معاشرہ میں جو خلجان پیدا کر رکھا ہے اسے کس طرح دور کیا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان نیشنلزم یا ٹیریٹوریلزم
کے ذریعہ دور نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ نوعِ انسانی کی برادری ہے نہ کہ بین الاقوامیت یعنی وہی چیز جسکو
علامہ اقبال نے آج سے بہت پہلے ان الفاظ میں کہا تھا کہ۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام — پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام — جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

حج سے مقصود اسی "جمعیتِ آدم" کی تشکیل تھا۔ اس حج پر نگاہ رکھئے اور پھر اس حج پر جو آج چند رسوم کا بے جان
اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے لیکن اس آئینِ کہن میں آج بھی وہی روح پیدا کی جا سکتی ہے جو انسانیت کی زندگی کی
کفیل ہے۔ آج عالمِ اسلامی چاروں طرف سے مصائب و آلام سے گھرا ہوا ہے۔ غیر اسلامی قوتیں ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم
کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کے نقشے پر کہیں ان کا نشان نہ رہنے پائے۔ مسلم اقوام کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کرتے
ہیں کہ باہمی اتحاد سے ان مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور رابطہ کی تحریکیں جاری ہو رہی ہیں
باہمی میل ملاپ کے سلسلے ڈھونڈے جاتے ہیں یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن کسی کی نگاہ اس طرف نہیں اٹھتی جو طریقِ رابطہ و اخوت
ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا تھا جس سے ہمارے دلوں میں الفت اور نگاہوں میں یکرنگی پیدا ہو جاتی تھی۔ ہم اسے ایک
بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں اور اس میں روح پھونکنے کی کوئی تجویز نہیں سوچتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم دیگر قوموں کی
تقلید میں کانفرنسیں طلب کرتے رہیں گے ہماری گتھیاں انہی کے ہاتھوں سے الجھتی جائیں گی۔ جس وقت اپنے اللہ سے باندھا
ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اسی مرکز کو زندہ کر دیا جس کی زندگی سے تمام نوعِ انسانی کی زندگی وابستہ ہے تو اقوامِ عالم کی امامت
ہمارے حصے آئے گی ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے جبل سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشتِ حیات سرسبز و
شاداب ہو گی آج مسلمانانِ عالم کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر

حج کی اہمیت (۲)[1]

(اکتوبر ۱۹۵۱ء)

انسان کی ابتدائی زندگی پر غور کیجئے زمین پر بڑے بڑے پُرآشوب دریا اور ان کی حدود فراموش طغیانیں، مہیب جنگل اور ان میں بسنے والے خوفناک درندے، آسمان پر کڑکتی ہوئی بجلیاں اور گرجتے ہوئے بادل اس ہیبت انگیز ماحول و لرزہ انگیز حالات میں گھرا ہوا انسان تن تنہا، انہی خطرات کے ہجوم نے اس کے جذبۂ مدافعت (Herd Instinct) کو بیدار کیا اور اس نے الگ رہنے کے بجائے خاندانوں میں مل جل کر رہنے کا طریق اختیار کیا۔ انسانی معاشرتی زندگی کی یہ پہلی شکل تھی اس سے ذرا آگے بڑھے تو خاندانوں نے قبائل کی صورت

معاشرتی زندگی کے

اختیار کرلی اس اجتماعی زندگی سے اس نے فطرت کی قوتوں کو رفتہ رفتہ مسخر کرنا شروع کردیا لیکن خود انسان مشترکہ مفاد کے ٹکراؤ سے خاندانوں اور قبیلوں میں باہمی مخالفتیں شروع ہوگئیں اور اس طرح خارجی خطرات کی جگہ داخلی تصادم نے لے لی۔ یہی قبائل پھیل کر قومیں بن گئے اس وقت تک دنیا قوموں میں بٹی چلی آرہی ہے اور مختلف قوموں کی باہمی تصادم اور رقابت کا جو عالم ہے وہ کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں، اسی اعتبار سے اس دورِ تہذیب و تمدن کا انسان بھی ٹھیک اسی مقام پر ہے جہاں ابتدائی دورِ وحشت و بربریت کا انسان تھا بس اتنے فرق کے ساتھ کہ اس وقت اسے صرف ایک دوسرے پر پتھر پھینکنا آتا تھا اور آج یہ ترقی کرتے کرتے ایٹم بم پھینکنا بھی سیکھ گیا ہے۔ قوم پرستی کی اس لعنت سے صرف یہی نہیں ہوا کہ دنیا میں کہیں امن و سکون باقی نہیں رہا اس نے انسانیت کے بنیادی تصورات تک بدل دیئے ہیں ڈاکٹر ہکسلے کے الفاظ میں

---

[1] یہ تقریر سابقہ تقریر ہی کی ملتی جلتی شکل ہے۔

قومیت پرستی

قومیت پرستی خلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور خدائے واحد کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی بہ حیثیت انسان کی کچھ قیمت نہیں سمجھتی دوسری طرف یہ باہمی تفرقہ انگیزی کا موجب ہے انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے باہمی نفرت بڑھاتی ہے وہ جنگ کو ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس ٹھیراتی ہے۔

اہل مغرب پر یہ حقیقت پہلی جنگ کے بعد ہی بے نقاب ہو گئی تھی کہ ان کی تباہیوں اور بربادیوں کی بنیادی وجہ ان کی قومیت پرستی ہے لیکن چونکہ انسانی عقل ابھی تک قومیتوں کے دائرے سے آگے بڑھ نہیں سکی۔ اس لئے انہوں نے اس کا علاج جمعیت اقوام یعنی لیگ آف نیشنز کی تشکیل میں سوچا لیکن علامہ اقبال کے الفاظ میں کفن چوروں کی یہ جماعت بری طرح ناکام رہی۔

لیگ آف نیشنز

(Reves) اپنی کتاب (Anatomy Of Peace) میں اس کے متعلق لکھتا ہے کہ لیگ آف نیشنز کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم کی گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے نمائندوں کو یکجا کر کے باہمی بحث و تمحیص سے دنیا کا امن قائم کیا جا سکتا ہے دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام مغرب نے پھر اپنے ناکام تجربہ کو دہرایا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ لیگ آف نیشنز کا نام (U.N.O.) رکھ دینے سے ناکامی کامیابی میں بدل جائے گی (U.N.O.) کامیاب ہوتی ہے یا ناکام اس کا فیصلہ وقت کر دے گا یہ ہے انسانی معاشرہ کی وہ شکل جسے انسانی عقل آج تک تجویز کر سکی ہے لیکن انسانی عقل سے ماوراء ایک ذریعہ علم بھی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے اب دیکھئے کہ وحی نے اس مسئلہ کا حل کیا بتایا ہے۔

آج سے قریب چودہ سو سال پہلے کی دنیا کا تصور کیجئے۔ جب سامان رسل و رسائل اور ذرائع مواصلات اس قدر محدود تھے کہ ایک بستی کے رہنے والے دوسری بستی کے باشندوں سے بھی بمشکل واقف ہو سکتے تھے اور یہ چیز کسی کے حیطہ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ مختلف قوموں کے افراد میں کوئی شے قدر مشترک بھی ہو سکتی ہے عین اس زمانہ میں وحی کی زبان نے یہ اعلان کیا۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ یاد رکھو تمام نوع انسان ایک برادری ہے اس لئے نسل اور وطن کی بنیادوں پر انسانوں کی تقسیم تمہاری خود ساختہ و حقیقت کے خلاف ہے [illegible]

وحدتِ انسانی

مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ اللہ نے تمام انسانوں کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ جب تمام انسان ایک ہی برادری کے افراد ہیں تو ان کے معاشرے کی بنیادیں بھی ایک ہی آئین پر استوار ہونی چاہئیں۔ یعنی دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ (One Mankind and One-World Government) اسکے بعد اس نے کہا کہ اس حقیقت کے پیشِ نظر تمام دنیا کے انسانوں کے دو حصے ہو جائیں گے ایک وہ جو اس آئیڈیالوجی کو اپنا ضابطۂ حیات بنا لیں۔ ایسا ماننے والوں کی جماعت کو امتِ مسلمہ کہا جائے گا دوسرے وہ جو اس روشِ زندگی سے انکار کریں۔ اور نسلوں کی قومی گروہ بندیوں کو قائم رکھتے ہوئے انہیں ایک دوسرے سے ٹکراتے رہیں۔ انہیں غیر مسلم کہا جائے گا۔ امتِ مسلمہ کے سالانہ اجتماع کا نام حج ہے

صرف دو قومیں

اس سے مقصود یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان جو اس ضابطۂ حیات پر ایمان رکھتے ہوں کہ تمام دنیا میں اس آئین کے مطابق حکومت ہونی چاہئے جو وحی نے مرتب کیا ہے اپنے اپنے ملکوں سے نمائندے منتخب کریں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی قیادت میں مرکزِ وحدتِ انسانیت یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان کا باہمی تعارف ہو پھر یہ سب نمائندگانِ امت اپنے میں سے ایک صدر کا انتخاب کریں اور تمام دنیا کے حالات کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے پروگرام مرتب کریں جسے آئندہ سال کے لئے بطور مشترکہ اصول اختیار کیا جائے۔ ان کا منتخب کردہ صدر اپنے خطبۂ حج میں اس پروگرام کا اعلان کر دے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے اس کے بعد یہ تمام نمائندگان اس پروگرام کی جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ مختلف ممالک پر ان کا کیا اثر پڑے گا۔ ان مذاکرات کے بعد یہ نمائندے اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے جائیں اور اس طے شدہ پروگرام کی روشنی میں اپنے اپنے ہاں کا نظم و نسق چلائیں۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن کریم نے تمام دنیا کے انسانوں کو ایک امت بنانے اور ان کے معاشرتی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے تجویز کیا ہے۔ قرآن نے حج کے اس مقصد کو نہایت مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ آپ ان مختصر الفاظ پر غور کیجئے۔ اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند و بالا کوئی اور ہو سکتی ہے؟ ایک جگہ فرمایا کہ حج کا اجتماع کیا ہے جس کے ذریعے ابھر کر سامنے آ جائے لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ دوسری جگہ اس کی غرض و غایت یہ بتائی ہے قِيَامًا لِّلنَّاسِ۔ یعنی اس اجتماع سے مقصود یہ ہے کہ نوعِ انسان اپنے پاؤں پر اٹھ کھڑی ہو جائے۔ غور کیجئے کہ دنیا میں کسی کانفرنس، کسی اسمبلی، کسی پارلیمان، کسی اجتماع کا مقصد

اس سے بھی بلند ہو سکتا ہے کہ وہ اجتماع دنیا میں شرفِ انسانیت کے قیام اور انسانی معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کا ذریعہ ہو کسی خاص قوم، خاص ملک، خاص ملت کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوعِ انسان کے قیام کا موجب ہے۔

دنیا وہیں آ رہی ہے

حج کے اجتماع کا مقصد قیاماً للناس۔ آج دنیا چاروں طرف سے تنگ ہو کر اس نقطہ تک تو آ پہنچی ہے کہ دنیا سے قومیتوں کی تفریق کو مٹا کر اس کی جگہ ایک عالمگیر برادری کا قیام نہایت ضروری ہے چنانچہ ڈاکٹر (Gauld) اپنی کتاب (Man, Nature And Time) میں لکھتا ہے کہ۔

> اب یہ چیز بالکل فطری نظر آتی ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی ایک منظم برادری قائم کر دی جائے۔

اور ساری دنیا میں ایک حکومت کا خیال بھی روز بروز پھیلتا جا رہا ہے چنانچہ (H.G.Wells) نے ۱۹۳۲ء میں سائنس کانفرنس میں کہا تھا کہ۔

> بُعدِ مکانی جو دنیا کی الگ الگ حکومتوں کے لئے وجہ جواز تھا اب ختم ہو چکا ہے اب ان حکومتوں کی حدود ایک دوسرے پر چڑھ چکی ہیں تمام نوعِ انسانی ایک ملت بن چکی ہے ۱۹۰۰ء میں یہ ناممکن تھا کہ تمام دنیا کے معاملات کو ایک نظامِ امن کی شکل میں منضبط کیا جا سکتا۔ اس وقت ایک حکومت صرف اپنے خاص رقبے میں ہی نظم و نسق قائم رکھ سکتی تھی۔ عالمگیر نظام قائم نہیں کر سکتی تھی۔ اب بُعدِ مکانی کے ناپید ہو جانے سے ایک عالمگیر نظام نہ صرف ممکن العمل ہو چکا ہے بلکہ موجودہ جنگ اور اس کے بعد کے لوازمات کے پیشِ نظر اس کی ضرورت بھی شدید ہو چکی ہے۔

یعنی تمام دنیا میں ایک حکومت قائم کرنے کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہو رہا ہے لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس خیال کو عمل میں کس طرح لایا جائے اس کا حل بھی وہی ہے جو قرآن نے بتایا ہے یعنی ساری دنیا کے لئے اصول و آئین بھی ایک ہو اور یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا آئین وہی ہو سکتا ہے جو مختلف اقوام کی مصلحت کوشیوں اور مفاد پرستیوں کے بجائے تمام نوعِ انسانی کی مشترکہ نشو و نما کے اصول پر قائم ہو اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں نظامِ ربوبیت ہے

جس دن دنیا کی سمجھ میں یہ بات آگئی اسی دن ایک عالمگیر حکومت کا خیال عملی شکل اختیار کرلے گا۔ حج کا اجتماع اسی نظام کی طرف دعوت کا پیغام ہے۔

حج کی حقیقت

یہ ہے حج کا قرآنی مفہوم۔ آج عالمِ اسلام چاروں طرف سے مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ غیر مسلم قومیں ان کے خلاف متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں۔ مختلف ممالک کے مسلمان مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں کہ انسانی عقلوں کا متحدہ طور پر مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور رابطہ کی تحریکیں چلائی جارہی ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن کسی کی نگاہ اس طرف نہیں اٹھتی کہ جو رابطہ و نظم ہمارے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا اسے ہم ایک بے کیف رسم نبھاتے ہوئے ہیں۔ اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ اگر کہیں ہمارے اس اجتماع میں صحیح زندگی کی حرارت پیدا ہو جاتی تو اس وقت عرفات کے میدان میں جو اجتماع ہو رہا ہے ساری دنیا کی نگاہیں اس کے فیصلوں پر لگی ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کا مقام ہی یہی تجویز کیا تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی مرکزی امت بنایا ہے اور تمہارا فریضۂ حیات یہ ہے کہ تم تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ تمام نوعِ انسانی کو حق و انصاف کے راستہ پر چلاؤ اور انہیں ظلم و سرکشی کی راہوں سے روکو۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کو اس قسم کی پوزیشن اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب اس کے پاس اتنی قوت ہو کہ وہ اپنے فیصلوں کو تمام اقوامِ عالم سے منوا سکے۔ اس قسم کی قوت مرکزیت کے بغیر ممکن نہیں۔ آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ۸۰ کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ جغرافیائی حیثیت سے دیکھئے تو انہیں ایک ایسی مرکزی پوزیشن حاصل ہے جو دنیا کی کسی دوسری قوم کو میسر نہیں۔ انڈونیشیا سے لیکر مراکش تک ایک ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر ہے جو مسلسل یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ سب سے خام پٹرول کو دیکھئے تو اس کا سرچشمہ اسلامی ممالک ہی ہیں۔ لیکن حالات کی ایسی قابلِ رشک سازگاری کے باوجود ہماری حالت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کی امامت و قیادت تو ایک طرف ان کی ہمسری اور برابری بھی نصیب نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہماری مرکزیت گم ہو چکی ہے۔ اگر یہ مرکزیت زندہ ہو جائے تو ہماری بے پناہ قوتوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ یہ مرکزیت کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کی دوبارہ زندگی اسی صورت میں ممکن ہے کہ آج حج کا اجتماع قرآنی خطوط پر متشکل ہو جائے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر

(ستمبر ۱۹۴۹ء)

مذہب کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے اس میں شبہ نہیں کہ ذاتی اصلاح نہایت ضروری ہے لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں عمدہ گھڑی کے ہر پرزہ کے لئے مضبوط اور درست ہونا ضروری ہے لیکن اگر یہ پرزے الگ الگ پڑے ہوں تو ان کی پائداری اور مضبوطی کسی کام کی نہیں یہی پرزے جب ایک نظام کے ماتحت ایک خاص ترتیب سے ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو ان میں سے ہر پرزہ کی حرکت دوسرے پرزوں پر اثر انداز ہو گی اور اس طرح ان کی مجموعی حرکت کا جیتا جاگتا نتیجہ محسوس شکل میں گھڑی کے ڈائل پر نمودار ہو جائے گا اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نظامِ انسانیت کو عمل پر چلا سکے اس مقصد کے حصول کیلئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے نماز کے اجتماعات، تقویٰ، ضبطِ نفس، غیر اللہ کی محکومی سے انکار، اللہ کی حاکمیت کا اقرار، مرکزیت، جمعیت اطاعتِ امام کے عملی مظاہرے ہیں جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں اور بالآخر حج کے میدان عرفات کی وسعتیں ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں رمضان المبارک کے پورے مہینے کی مشق اور ریاضت کے بعد جب ذہنوں میں جلا، دلوں میں تازگی، ایمان، نگاہوں میں مومنانہ فراست، اور خون میں مجاہدانہ حرارت پیدا ہو گئی تو عید الفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کے لئے بہترین فرد کا انتخاب ہو، مسلم نمائندوں کے یہ قافلے دنیا کے دور دراز گوشوں سے جنگل بیابان کوہ و دریا کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے من کل فج عمیق، اپنی بین الملی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے

چاروں طرف سے ایک مرکز کی طرف سمٹے چلے آتے ہیں دنیا میں کوئی جماعت بلا مرکز قائم نہیں رہ سکتی مسلمانوں کے فکر و نظر کا مرکز قرآن اطاعت کا مرکز امیر۔ اور اجتماعیت کا مرکز وہ بیت الحرام ہے جو ایک خدا کے ماننے والوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں

کعبۂ ملت

سے وجود میں آیا اور دنیا کے بتکدے میں خدا کا پہلا گھر کہلایا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ بلاشبہ پہلا گھر جو تمام انسانوں کے لئے ابتداءً مرکز بنایا گیا ہے وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ۔ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ۔ جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن و حفاظت میں آگیا۔

اسلام دنیا میں جس نظام کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے اس کی بنا اس اصول پر ہے کہ تمام انسان ایک برادری کے فرد ہیں وہ ان تمام غیر فطری حدبندیوں کو توڑنے کے لئے آیا ہے جس سے انسانوں کی یہ برادری مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے نسل کا امتیاز، رنگ و نسب کا امتیاز، جغرافی حدود کا امتیاز اس کے نزدیک سب غیر فطری حدبندیاں ہیں اس لئے خدا کے اس گھر میں جب انسان جمع ہوں گے تو ان کے ان امتیازات میں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا چینی، جاپانی، ہندی، افغانی، ایرانی، تورانی، حبشی، فرنگی سب ایک ملت کی شکل میں اس عظیم الشان حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہوں گے کہ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔

یہی نہیں بلکہ مختلف قسم کے لباسوں سے جو اعلیٰ و ادنیٰ کے امتیاز کی تمیز نمودار ہو سکتی ہے اسلام نے اسے بھی روا نہیں رکھا۔ اور حکم دیدیا کہ حدود حرم میں داخل ہونے سے پہلے سب ایک ایک بن سلی چادر میں لپٹے ہوئے حاضر ہوں تاکہ [illegible] یہ ہے وہ وردی جو اس بین الملی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لئے تجویز کی گئی ہے یوں باہر کے ہر امتیاز کو مٹاتے ہوئے ننگے سر ننگے پاؤں چاروں طرف سے اپنے مرکز کی طرف بڑھتے چلے آتے ہیں یہ سب ایک ہی قوم کے فرد، ایک حاکم کے محکوم، ایک ہی وطن کے رہنے والے، ایک خیمہ کے باشندے ایک سا لباس، ننگے سر، گدایانہ وضع، قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال، دنیا بھر کی آسائشوں سے بے نیاز، مستانہ وار گھر سے نکلے ہوئے بیت کی چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے بیتاب، دل ذوق و شوق سے بیقرار، آنکھیں آتشِ محبت سے اشکبار لبیک اللّٰھم لبیک کہتے ہوئے یوں رواں دواں جانبِ مرکز کھنچے چلے آتے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں رنگ و بو کی فضاؤں سے گوہر اپنے سینوں میں بھر کر سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے شام کے وقت اپنے چھتے کی طرف پرواز کرتی چلی آرہی ہوں کہ اپنی محنتوں کا سرمایہ اور تگ و دو کا حاصل مرکز میں لا کر اکٹھا کر دیا جائے۔

زمانہ بربریت میں رواج تھا کہ عہد پیمان کی پختگی کے لئے ایک پتھر پر ہاتھ مارتے تھے جب ان رہروان شوق کے قافلے حریم کعبہ میں پہنچے تو

حجر اسود

اس عہد وپیمان کی تجدید کے لئے جو انھوں نے اپنے اللہ سے باندھ رکھا ہے حجر اسود کو چھوا بعض نے ہجوم کی وجہ سے دور ہی سے اشارہ کردیا کسی نے پیمان کے تقدس کی رعایت سے ہاتھ کو چوم لیا اور یوں اس عہد کی تجدید ہوئی کہ ان صلاتی ونسکی ومحیای

ومماتی للہ رب العالمین لاشریک لہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین ۔

میری نماز میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کیلئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمان برداروں میں سب سے پہلا فرمان بردار ہوں۔

اس عہد وپیمان کی تجدید سے، وجد و مسرت اور سرمستی و شیفتگی کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ والہانہ انداز میں خانۂ کعبہ کے گرد پروانہ وار گھوم رہے ہیں کوئی کعبہ کی چوکھٹ پر سر رکھے ہوئے ہے کوئی اس کا غلاف تھامے عالم وارفتگی میں جھولی پھیلائے کھڑا ہے مقدس زائرین کا ہجوم آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو، لب پر دعائیں، محویت کا عالم، آسمان سے نور کی بارش، رحمتوں کا نزول، غرض کہ دنیا اور یک عجیب سماں ہے۔

غرض حجاز کے متوالوں کے یہ قافلے ۸ تاریخ کو عرفات کے میدان کی طرف روانہ ہو گئے پاک اور صاف، مسرت و انبساط میں ڈوبے ہوئے، قدم وادی مکہ میں نگاہیں عرش معلی پر، کوئی تیز گام کوئی آہستہ خرام، کشاں کشاں ۹ تاریخ کو اس میدان میں پہنچ گئے

میدان عرفات

کیسا حسین نظارہ ہے سب ایک آقا کے غلام، ایک ملت کے فرد، ایک ہی وضع ایک ہی لباس، ایک ہی زبان ہر ایک بھائی تھا۔ ایک کا دوسرے سے تعارف ہوا کہ اس مقام کا نام ہی عرفات کا میدان ہے اخوت، یگانگت، مساوات اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس میں ہر قطرہ اپنے آپ کو خود سمندر محسوس کرتا ہے یہ سب خدا کے حضور جمع ہوئے ان کا نائب امام منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیا اس نے ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ کیا اور سال بھر کے لئے ایک مرتب شدہ پروگرام پیش کردیا جس کی تکمیل کے لئے دعائیں مانگی گئیں التجائیں کی گئیں اور یوں یہ عظیم الشان اجتماع زندہ آرزؤں کی ایک نئی دنیا بسا کر لئے دوسری صبح منیٰ کے میدان میں آ گیا یہی وہ میدان ہے جہاں ملت حنیف کے پیشوائے اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل لٹا دیا تھا اور یوں اپنے ایمان محکم کا عملی ثبوت دیا تھا کہ تیرا حکم ہو تو عزیز ترین متاع

کبھی ہوا تامل شار کردی جا سکتی ہے ۔ تحریری قربانی کا دن ہے۔ چونکہ ملت اسلامیہ کے ان نمائندوں نے اس قرار کو دہرایا کہ دین کو سربلند کرنے کے لئے جو پروگرام مرتب ہوا ہے اس کی تکمیل میں جس قربانی کی ضرورت ہوگی بلا دریغ کردی جائے گی۔ یہاں پر چونکہ مختلف ملکوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے خیمے لگائے ہیں سب ہی مہمان ہیں اس لئے خود ہی مہمان اور خود ہی میزبان ہیں آج صبح ہندی مسلمانوں کے ہاں سب کے کھانے کا انتظام ہے شام کو ایرانیوں کا اہتمام ہے ان دعوتوں کے لئے قربانیاں کی جارہی ہیں سامان تو کھانے پینے ہی کا ہے لیکن چونکہ وہ مقصد عظیم جس کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے خالصۃً اللہ کے لئے ہے اسلئے یہ دعوتیں بھی دنیا کی دعوتوں سے الگ ہیں

لَن ینال اللہ لحومها ولا دماؤها ولکن ینالہ التقوی منکم کذالک سخرها لکم لتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم وبشر المحسنین ○ (۲۲/۳۷)

اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ پاکیزگی مقصد پہنچتی ہے اس نے ان چوپاؤں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کردیا کہ تم اللہ کی راہنمائی پر اس کے نام کو بلند کرو۔ اور نیک کرداروں کے لئے بشارت ہے۔

دعوتیں اور ضیافتیں ہیں ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک والوں کو اپنے مقامی حالات سے آگاہ کر رہے ہیں دماغی اور قلبی تعارف ہو رہا ہے۔ ادھر ادھر مختلف ملکوں کی مصنوعات کی نمائش لگ رہی ہے خرید و فروخت ہو رہی ہے لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم (۲/۱۹۸) اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل (یعنی معیشت) تلاش کرو۔ اس طرح یہ اجتماع ملت اسلامیہ کے لئے دینی اور دنیاوی، سیاسی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی فوائد کا ذریعہ بن رہا ہے کہ حج کا مقصد ہی یہ ہے لیشہدوا منافع لھم ۔ تاکہ لوگ اپنے فوائد کے لئے حاضر ہوں

تین دن تک یہ اجتماع رہا جس میں عالم اسلامی کے ہر گوشے اور ملت اسلامیہ کے ہر شعبے کے متعلق باہمی تبادلۂ خیالات ہوا اور یہ ہو رہا ہے۔ ادھر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ملت کے افراد اپنے اپنے ہاں وادئ مکہ کے اجتماع سے ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے عیدگاہوں میں جمع ہو رہے ہیں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے نیز اس پروگرام کو سننے کے لئے جس کا اعلان ایک دن پہلے میدان عرفات میں ہوا ہے۔ اس پروگرام کی تفصیلات ریڈیو اور تار برقی سے تمام عالم اسلامی تک پہنچ چکی ہیں مقامی مسلمان عیدگاہوں

میں پہنچے اپنے اپنے خطیبوں سے اس پروگرام کو سن لیا اور سمجھ لیا جس پر سال بھر عمل کیا جائے گا وہ حقائق یہ ہے عید وہ فریضۂ مقدس جس میں نوعِ انسانی کے قیام و بقا کا راز ہے تمام انسانوں کا اس لئے کہ مسلمان دنیا میں پہنچی نے نہیں بھیجا بلکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کو اس نظام پر چلائے جس سے انسانیت بڑھے، پھولے، پھلے اور عروج و ارتقا کی منزلیں طے کر کے اس منزل سے اگلی منزل میں جا پہنچے۔ حج اس نظام کی سب سے اہم کڑی اور کعبہ اس نظام کا مرکز ہے جَعَلَ اللّٰہُ الکعبۃ البیت الحرام قیماً للناس (۵) اللہ نے کعبہ کو جو حرمت کا گھر ہے تمام انسانوں کے لئے امن و امانت کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے انسانوں نے مختلف خطوط پر مختلف قسم کی جمعیتیں بنا بنا اور بگاڑ بگاڑ کر مختلف تجربے حاصل کئے ہیں اور ہر تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ —— تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی —— یہ سب اس لئے کہ جن خطوط پر یہ جمعیتیں بنائی گئیں وہ سب غیر فطری تھے فطرت کے مطابق تو ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کی تقسیم ملکوں اور قوموں کی رو سے نہ کی جائے بلکہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری تصور کر کے انہیں ایک مرکز کے ماتحت خدا کے قانون کے تابع کر دیا جائے یہی وہ عظیم الشان اصول ہے جس کی رو سے مکہ کو هُدًى لِلْعٰلَمِيْن تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ اور کعبہ کو قِيَامًا لِلنَّاس تمام نوعِ انسانی کے قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اس جمعیت وحدت کا فطری نتیجہ ہے دنیا کا امن و سکون۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔ جو اس میں داخل ہوا امن و حفاظت میں آگیا۔ حج اور عید اسی منزل کے نشانِ راہ ہیں۔

لیلۃ القدر (۵)

(جولائی سنہ ۱۹۵۱ء)

دنیا کی کسی قوم کو لیجئے سال میں کچھ دن ایسے آئیں گے جن میں وہ جشن و مسرت کے تیوہار منائے گی جب دنیا میں مسلمان آئے تو ان کے ذمہ عدل و انصاف کے پھیلانے اور جور و استبداد کے مٹانے کے لئے ایسے اہم فرض عائد کئے گئے کہ انہیں فرصت ہی نہ تھی کہ وہ بس تمام کے مسرت و شادمانی کے جشن منائیں لیکن اس کے باوجود ان کی داستانِ زندگی میں بعض اوقات ایسے تھے جن کی یاد تو تمام اقوامِ عالم کی نعمت و مسرت کے عنوانوں کی یاد تازہ کرنا تقاضا بس منانے کے تیوہار ہیں اور ان تیوہاروں میں سب سے نمایاں وہ جشن ہے جو شروع ہلالِ رمضان سے اور ختم روزِ عید پر ہوتا ہے۔ جس عظیم الشان واقعہ کی یاد میں یہ تیوہار منایا جاتا ہے اس کی عظمت و رفعت خود بتا دے گی کہ اس تیوہار کو کتنا اہم ہونا چاہیئے۔

قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رشد و ہدایت کیلئے مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں میں اپنے رسول بھیجے جو لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچاتے رہے لیکن خدا کے یہ پیغامات اپنی اصلی شکل میں کہیں محفوظ نہ رہ سکے کہیں یہ زمانے کے انقلابات کے ہاتھوں مٹ گئے اور کہیں خود انسانوں نے اپنے ہاتھوں سے ان کی صورت مسخ کر دی۔ اب ذرا تصور میں لائیے ایسے منظر کو کہ نگاہیں نظارے کے لئے بیتاب ہوں لیکن دنیا سے روشنی گم ہو جائے زندگی کا مدار صاف ہوا پر ہو لیکن فضا مہلک جراثیم سے بھرپور ہو جائے جانِ ناتواں پیاس کی شدت سے بیتاب ہو رہی ہو لیکن پانی کے ہر چشمہ میں زہر مل چکا ہو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اگر یکایک سورج بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے اس مہلک فضا کی جگہ بادِ نسیم کے خوشگوار جھونکے نزہت و لطافت کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لئے ایک نئی زندگی کا سامان پیدا کر دیں ان زہر سے بھرے ہوئے چشموں کی جگہ ایک چشمۂ رواں مچلتی ہوئی مسکراتی دامن کہسار سے

تازہ ولولوں کی بشارتیں لیے بڑھتی چلی آئے تو فرمایئے کیا یہ واقعہ ایسا نہیں ہوگا کہ اس کی یاد اس وقت تک تازہ رکھی جائے جب تک دنیا میں زندگی کے قیام و بقا کے لیے نفیس روشنی، لطیف ہوا اور صاف پانی کی ضرورت ہے یہ آفتابِ جہاں تاب، یہ نسیم حیات پرور، یہ کوثر و تسنیم کی جوئے رواں ہمارے لئے اللہ کا وہ پیغام تازہ ہے جو قرآن کریم کی شکل میں دنیا کو اس وقت ملا جب حیاتِ انسانی کے ہر شعبے پر مردنی چھا چکی تھی اور زندگی کی تاریک رات میں امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی اس لئے مسلمانوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر جشن و مسرت کی تقریب اور کوئی نہیں۔

نزول قرآن

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔ ([illegible])۔

اے انسانو! تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی جانب سے (ایک ایسا زندگی عطا کرنے والا پیغام) آیا (جو سرتاپا) نصیحت ہے، دل کی تمام بیماریوں کے لئے شفا اور ہدایت و رحمت ہے ان کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اے پیغمبر! تم ان سے کہہ دو کہ یہ اللہ کا فضل ہے اور اس کی رحمت، پس چاہیئے کہ اس پر خوشی منائیں، یہ دولت ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔

یہ ہے وہ نورِ مبین جس سے رمضان کے مہینے میں چشمِ انسانیت نے بینائی حاصل کی۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ (۲/۱۸۵)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن کا نزول ہوا، وہ قرآن جو انسانوں کیلئے راہنما ہے، ہدایت کی روشن صداقتیں اپنے اندر رکھتا ہے اور حق و باطل میں امتیاز کرنے والا ہے۔

اور اسی پاک مہینے میں وہ مبارک رات ہے جس میں نورِ خداوندی کی پہلی جھلک سے دنیا کی نگاہیں آشنا ہوئیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۔ سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۔ (۹۷)

ہم نے اس کتابِ مبین کو عظمتوں والی رات میں نازل کیا اور تم کیا جانو کہ عظمتوں والی رات کیا ہے وہ رات جو اپنی قدر و قیمت میں ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ اس رات میں فرشتے اور جبرئیل امین اترتے ہیں کہ امن و سلامتی کی جنت کو خوشیوں سے بھر دیں یہ رات امن و سلامتی کی رات ہے جو طلوعِ سحر تک رہتی ہے۔

اس مقدس رات میں اللہ تعالیٰ کے اس ضابطۂ قوانین کا نزول شروع ہوا جس کا ایک ایک لفظ برحق و یقین ہے وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ (۶۹/۵۱) جس میں کہیں کسی جگہ شک و شبہ اور قیاس و تخمین کی کوئی گنجائش نہیں لَا رَیْبَ فِیْهِ ایسا حق کہ باطل اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا (۴۲/۴۱) حق کہتے ہی اسے ہیں جو ثابت ہو اٹل ہو، اٹمٹ ہو، اپنی جگہ پر قائم ہو حقیقت کے ہر معیار پر پورا اترے علم و بصیرت کی ہر کسوٹی پر کھرا ثابت ہو اور اسکے برعکس باطل وہ جو مٹ جانے والا ہو جو باقی نہ رہ سکے قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ حق ہے باطل کا اس میں کوئی دخل نہیں علم و دانش ہے توہم پرستی کا اس میں کوئی شائبہ نہیں کسی خاص ملک خاص قوم و خاص جماعت کی ہدایت کیلئے نہیں بلکہ نسلی، لسانی، طبقاتی، وطنی، قبائلی حدود و قیود کو توڑ کر تمام دنیا کے لئے یکساں طور پر آئین حیات ہے پھر جس طرح صحیفۂ فطرت مکانی حدود سے بلند ہے، اسی طرح زمانی قیود سے بھی ناآشنا ہے یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانہ میں یہ کہہ دے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح قرآن کریم بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ اب ہمیں تم کسی

رموزِ فطرت

اور رہبر کی تلاش کرو۔ قطعاً نہیں قرآن کریم کی آیات کو کھولتے جائیے جہاں جہاں زمانہ در زمانہ آگے بڑھتے جائیں گے دقائق میں نپٹ لیجئے فطرت کی کسی چیز کو لیجئے مثلاً پانی اس کے متعلق ابتدائی انسان اتنا ہی جانتا تھا کہ اس سے پیاس بجھتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے نہایا بھی جا سکتا ہے لیکن پانی کے اندر بھی اور خصوصیتیں تھیں Latent Properties زمانے کی عقل و علم تجربہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں گویا وہ سمندر کی لہروں کے نیچے لپٹی ہوئی تھیں آج پانی سے جس قدر کام لئے جاتے ہیں ابتدائی زمانہ میں بھی یہ خصوصیتیں پانی کے اندر موجود تھیں اور آج بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پانی کے اندر جس قدر قوتیں خوابیدہ تھیں وہ سب کی سب بیدار ہو چکی ہیں اس فضا کو دیکھئے جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی آج اس میں ایتھر کی لہروں نے ایک نئی دنیا آباد کر دی ہے ایتھر تو پہلے بھی موجود تھا اس خلا میں لپٹا ہوا تھا جوں جوں انسانی علم و دانش کی سطح بلند ہوتی گئی اس کو ان چھپے ہوئے دبی ہوئی چھپی ہوئی قوتوں کے خزانوں کی چابیاں اس کے حوالے کر دیں یہی کیفیت مسلمانوں کے نزدیک قرآن کریم کی ہے زمانہ اور عقل کی سطح تک چاہے بلند ہوتی جائے قرآن کریم اس سے بھی آگے نظر آئے گا ہمارا یقین ہے کہ اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ اور جس کے علم سے کوئی شے باہر نہیں ہے ہم مسلمانوں کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآن کریم محض چند نظری عقیدوں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ضابطۂ قوانین ہے مذہب، سیاست، تمدن، تہذیب، معاشرت، معاشیات۔ غرضیکہ دین و دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق اسکے اندر ہدایت کے اصول موجود نہ ہوں ایسے اصول جو سب سے محکم اور سیدھی راہ دکھانے والے ہیں۔

ناحق کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اسی جذبۂ اطاعت کی تقویت کے لئے حکم دیا گیا کہ اس کے حکم کے ماتحت کچھ وقت کے لئے حلال اور طیب چیزوں کو بھی چھوڑ دیا جائے تاکہ حرام اور ناجائز کی طرف کبھی نگاہ بھی نہ اٹھنے پائے۔ انہیں دن بھر بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرنے کا خوگر بنایا گیا تاکہ یہ جہادِ زندگی کے سخت ترین مرحلوں سے ہنستے کھیلتے گزر جانے کے عادی ہو جائیں۔ انہیں راتوں کو مساجد میں جمع کیا گیا کہ قانونِ خداوندی کا وہ ضابطہ جس کے ماتحت انہیں زندگی بسر کرنا ہے پورے کا پورا مسلسل ذہن نشین ہوتا رہے۔ یہ گویا ایک سالانہ ٹریننگ کیمپ تھا جس میں زندگی میں تازہ ولولے پیدا کرنے کے سامان فراہم کئے گئے تھے۔ ایک یادداشت تازہ کرنے والا (Refresher Course) تھا جس میں خدا اور بندے کے براہِ راست تعلقات کی یاد تازہ کی گئی تھی۔ سالانہ محاسبہ (Stock-taking) تھا جس میں سال بھر کے اعمال اور نتائج کی جانچ پڑتال کرکے جائزہ لینا تھا کہ ہم ایک سال میں کس حد تک آگے بڑھے ہیں۔ جب پورے ایک ماہ کی محنت اور اطاعت کے بعد دلوں میں تزکیہ، نگاہ میں بصیرت، ذہن میں جلا اور روح میں بالیدگی پیدا ہو گئی تو ان تمام کو یکجا جمع ہونے کا حکم دیا گیا تاکہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور دیکھیں انہیں اس زندگی کے حاصل کرنے اور قائم رکھنے کیلئے کیا کچھ کرنا ہے جو جماعت مومنین کی خصوصیت ہے اور جس کے وعدے قرآن کریم کے ایک ایک صفحہ پر بکھرے موتیوں کی طرح ابھرے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ اس سوچ بچار کے بعد اپنے لئے ایک پروگرام تیار کریں جس کا اعلان اس دن کا منتخب امام اپنے خطبہ میں کرے۔ اس کے بعد ان کے نمائندے اس طے شدہ پروگرام کو لیکر ملتِ اسلامیہ کے مرکزِ محسوس یعنی بیت اللہ شریف کی طرف روانہ ہو جائیں جہاں ان مختلف مقامی پروگراموں کی روشنی میں تمام ملت کے لئے مشترکہ نظام تجویز کیا جائے۔ یہ ہیں اس تربیت کے مختلف اجزاء اور یہ ہے ان اجزاء کی اجمالی تفصیل۔ انہیں سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ یہی تقریبیں جن کے گوشہ ہائے پنہاں میں کبھی زندہ آرزوئیں مچلتیں اور تازہ ولولے رقص کرتے تھے۔ نئی روح کے نکل جانے سے، دجل وفریب نے کس طرح رفتہ رفتہ محض بے جان رسوم کی شکل اختیار کر گئیں۔ بقول حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

آپ عیدگاہ میں پہنچیں گے تو آپ کو رمضان کے مسائل سمجھائے جائیں گے بتایا جائے گا کہ عید کس طرح سیدھی زمین

چاہییں دونوں پاؤں کے درمیان فاصلہ کتنا ہونا چاہیئے کندھے کے ساتھ کندھا کس طرح ملنا چاہیئے ہاتھ کس طرح باندھنے

عیدگاہ میں

اور کہاں تک اٹھانے چاہئیں تکبیریں کس طرح کہنی چاہئیں یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں اور ان کی پابندی لازمی لیکن ان ظاہری ارکان کی پابندی کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی تو ضروری ہے کہ آپ یہاں جمع کس غرض کے لئے ہوئے ہیں نماز آپ کو کیا پیغام حیات دیتی ہے جماعت کے ساتھ نماز کیوں ضروری ہے جماعت ایک ہی کیوں ہوتی ہے متعدد کیوں نہیں ہوسکتیں امام بھی ایک ہی کیوں ہوتا ہے اور اس کی ایک آواز پر ہلا چون وچرا سب کو ایک ہی حرکت کیوں کرنی پڑتی ہے اس سے کہیں بھول چوک ہو جائے تو اس کی اطاعت سے کیوں سرتابی نہیں کی جاتی اور اس کے لئے بھی جہاں تک ممکن ہو غلطی سے بچنا کس قدر ضروری ہے کہ اس کے سہو کا کفارہ پوری جماعت کو ادا کرنا پڑتا ہے یہ سب کیا ہے یہ اٹھنا بیٹھنا کیسا ہے کس طرح۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے   ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

وحدت افکار وکردار یعنی خیالات میں یکسانیت اور اعمال میں یکرنگی۔ قوموں کی زندگی کے یہی بنیادی اصول ہیں اور ان چیزوں کے حاصل کرنے کے لئے تمام قومیں مختلف قسم کی جدوجہد کرتی ہیں لیکن اسلام میں یہ سب کچھ خود موجود ہے اور موجود ہے اس تعمیت کو لئے ہوئے جو مسلمانوں کا امتیازی نشان ہے لیکن آج مسلمانوں میں افکار اور اعمال کی وحدت کی جو کمی نظر آتی ہے اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ

رہ گئی رسم اذاں، روح بلالی نہ رہی۔

ہمارے اور مناسک اور شعائر کی شکلیں باقی ہیں لیکن اصلی روح باقی نہیں رہی اور ان کی شکلیں بغیر روح کے ایسی ہی ہیں جیسے جسم بغیر جان کے یا پیام بغیر نوا کے لیکن اس کے باوجود ایک اہم نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے ہر چند ہمارے ان اشغال میں آج وہ روح باقی نہیں رہی لیکن ان کی پابندی اور قیام نہایت ضروری ہے اسلئے کہ ہماری فلاح اور

پُر امیدی

سعادت جب بھی ہمیں ملے گی انہی شعائر کی راہ سے آئے گی آپ تاریخ انسانیت کے بہترین زمانہ یعنی عہد رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم پر نگاہ ڈالئے نظر آجائے گا کہ فلاح اور سعادت کے چشمے انہی چیزوں سے پھوٹے تھے۔

اس لئے ہمارے لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں خدا کی زندہ کتاب ہمارے پاس ہے اسی میں اس کے رسول کا اسوۂ حسنہ روشنی کے بلند میناروں کی طرح ہماری راہ نمائی کے لئے موجود ہے اس کی برگزیدہ جماعتوں کے کارنامے مردہ دلوں میں نئے ولولے پیدا کرنے کے لئے ہمارے سامنے ہیں۔ بس اتنی ضرورت ہے کہ ہم ہر طرف سے کٹ کر اپنے آپ کو پھر سے [illegible] سے وابستہ کرلیں۔ تو انہی چٹانوں سے ہمارے لئے زندگی کے چشمے اسی گرمجوشی سے ابلنے لگ جائیں گے اور ان کی سیرابی سے ہماری ملت کے گلستان میں پھر سے بہار آنے لگے گی۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

میری طرف سے آپ احباب کو مبارک ہو وہ عید جو ہمارے سامنے اسلامی زندگی کے جمال و جلال کی جھلک پیش کرتے اس بھولے ہوئے عہد و پیمان کی یاد تازہ کر دیتی ہے کہ

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لا الٰہ الا اللہ۔ واللہ اکبر۔ اللہ اکبر و للہ الحمد۔

ہر قسم کی بڑائی اللہ کے لئے ہے اس کے سوا کوئی ایسا نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔ کبریائی و ستائش کی سزاوار اسی کی ذات ہے۔

نبی اکرمؐ تشریف لائے اور انہوں نے ساری دنیا کو مخاطب کر کے کہا کہ یاد رکھو کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر اپنی مرضی چلائے انسانوں کے باہمی معاملات کا فیصلہ ان کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیے یعنی نظامِ حکومت مشاورتی ہونا چاہیے نہ کہ شخصی و استبدادی اس ایک آواز نے غلامی اور محکومی زیردستی اور فرمان پذیری کی ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر الگ پھینک دیا جس میں انسانیت صدیوں سے جکڑی چلی آ رہی تھی آج ساری دنیا اس مشاورتی نظام کو بہترین نظامِ اجتماعیہ قرار دے رہی ہے اگر آج سے تیرہ سو سال پہلے حضورؐ کی یہ آواز نہ اٹھتی تو سوچیے کہ آج دنیا کی کیا حالت ہوتی؟ کیا یہ آواز تمام نوعِ انسانی کے لئے سرچشمۂ رحمت نہیں ثابت ہوئی۔

اب ایک اور سمت دیکھئے۔ ملوکیت کی غلامی انسان کے جسم کی غلامی تھی لیکن اس سے بدتر ایک اور غلامی تھی جس کے طوق و سلاسل میں انسان کی روح جکڑی ہوئی تھی یہ غلامی تھی پیشوائیت (Priesthood) کی غلامی۔ بادشاہت کے حکم کی خلاف

پیشوائیت

ورزی سے انسان کی یہ دنیا برباد ہوتی تھی لیکن مذہبی پیشواؤں کے ارشاد کی تکمیل میں ذرا سی کوتاہی دنیا و آخرت دونوں میں ذلت و رسوائی کا موجب بن جاتی تھی اس لئے ان کی حکومت انسان کی روح پر چھائی ہوئی تھی اور ان کی ہیبت اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست اور اس کے خون کے ذروں میں حلول کر چکی تھی نبی اکرمؐ آئے اور آپ نے ساری دنیا کو پکار کر کہہ دیا کہ یاد رکھو خدا اور اس کے بندے کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں ہو سکتی اس لئے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ بارگاہِ خداوندی کا حاجب و دربان بن کر بیٹھ جائے اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہے کسی انسان کی نہیں اس آوازِ حریت سے باطل کی مقدس تمدنیوں کی تمام زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں اور نوعِ انسانی نے پیشوائیت کی غلامی کے عذاب سے نجات حاصل کر لی سوچئے کہ اگر ساتویں صدی عیسوی میں یہ حریت آموز و انقلاب آفریں آواز بلند نہ ہوتی تو آج روحِ انسانیت کن زنجیروں میں جکڑی ہوتی یہ آواز ساری دنیا کے لئے رحمت بنی۔

ملوکیت و پیشوائیت نے اپنے استبداد کی زنجیریں مضبوط کرنے کے لئے یہ عقیدہ وضع کر رکھا تھا کہ کچھ انسان پیدائشی طور پر حکومت اور پرستش کے حقوق لیکر آتے ہیں اور دوسرے انسان پیدائشی طور پر غلام ہوتے ہیں انسانوں کی یہ تقسیم خود خدا کی متعین کردہ ہے اس کے

پیدائشی امتیازات

خلاف آواز اٹھانا خدا کے فیصلوں کے خلاف سرکشی ہے ظہورِ اسلام کے وقت یہ فریب خوردگی و پیشوائیت ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا حضور نبی اکرمؐ احترامِ آدمیت کا پرچم بلند کرتے ہوئے آگے بڑھے اور ساری دنیا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یاد رکھو پیدائش کے اعتبار سے چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔ عزت و تکریم کا معیار انسان کے ذاتی جوہر ہیں نہ کہ خاندان کی نسبتیں۔ پیدائشی نسبتوں سے معاشرے میں امتیازی خطوط کھینچنے والے فسادِ آدمیت کے جرمِ عظیم کے مرتکب ہوتے ہیں اس آواز نے تمام انسانوں کو ایک صف میں کر کھڑا کر دیا۔ اور اس طرح پیدائشی امتیازات کے وہ تمام بندھن ٹوٹ گئے جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی پوچھئے تاریخِ عمرانیت کے مبصرین سے کہ اگر دنیا میں یہ آواز بلند نہ ہوتی تو آج دنیا کس درجے گندی ہوتی۔

اور آگے بڑھیے انسانوں نے مختلف ملکوں اور خطوں میں بسنا شروع کیا اور یہی خطے ان کے وطن قرار پا گئے اس سے زیادہ ان جغرافیائی حدود کی کچھ حیثیت نہ تھی لیکن ذہن انسان کی تنگ نظری نے دریاؤں، پہاڑوں کی یہی لکیریں قومی امتیازات کے سانپ بن گئیں اور اس کے بعد ہر خطے کا انسان دوسرے خطے کے انسانوں کے خون کا پیاسا ہو گیا یہی وہ قومیت ہے یعنی (نیشنلزم) ہے جو دنیا میں اس قدر کشت و خون اور تباہی و بربادی کا موجب بن رہی ہے حضور نبی اکرمؐ نے تمام دنیا کو پکار کر کہہ دیا کہ تمہارے

نیشنلزم

دلچسپوں کی تکبیریں خود ساختہ ہیں۔ تمام انسان بلاتمیز رنگ و نسل و زبان و وطن ایک درخت کی شاخیں اور ایک کنبے کے افراد ہیں ان سب کو ایک بن کر رہنا ہوگا کیونکہ ان سب کی حیات کا سرچشمہ ایک ہے ذرا غور کیجئے کہ جب ساری دنیا میں ایک حکومت قائم کرنے کی جو آوازیں اٹھ رہی ہیں کیا وہ اسی پیغام وحدت انسانیت کی صدائے بازگشت نہیں سوچئے کہ گذشتہ عالم اس دور سے پہلے تک کسی ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ ساری دنیا کے انسانوں کو ایک برادری کی طرح ایک عالمگیر نظام کے تابع زندگی بسر کرنی چاہیئے

اب انسان کی زندگی کے ایک اور گوشے کو لیجئے انسان کی حالت یہ تھی کہ مذہبی دنیا میں ہر فرد اپنی نجات کی فکر میں غلطاں و پیچاں تھا اور معاشی دنیا میں ہر شخص اپنے مفاد کی فکر میں سرگرداں و حیراں یعنی ساری دنیا میں محض افراد (Individu als) بستے تھے انسانیت (Humanity) کا کہیں وجود نہ تھا سوچئے کہ جس دنیا میں ہر فرد اپنی فکر میں مضطرب و بے چین پھر رہا ہو اس میں کس قدر نفسا نفسی کی قیامت برپا ہوگی اس تخم انفرادیت کا نتیجہ وہ شجر خبیثہ ہے جسے سرمایہ داری کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس میں ہر انسان دوسرے کا خون پی جانے کی فکر میں رہتا ہے دنیا اس جہنم سے گذر رہی تھی کہ نوع انسان کا وہ محسن اعظم آیا

سرمایہ داری

جس نے وحدت انسانیت کی چھپی ہوئی حقیقت کو اس طرح اجاگر کر کے دکھا دیا کہ ہر فرد کو دوسرے افراد کی پرورش اور تربیت میں خود اپنی ذات کی بالیدگی اور بہرہ مندی نظر آنے لگی۔ اس نے کہا کہ جب تک ہر فرد معاشرہ کی ضروریات زندگی کی کفیل اور ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما کے اسباب و ذرائع بہم پہنچانے کا ذمہ دار نہیں بنتا اسے دنیا میں قائم رہنے کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ ایک زلزلہ تھا جس سے دنیا کا ہر قارون زمین میں دھنس گیا اور اسکے تمام خزانوں اور دفینوں کے دروازے ارباب حاجت کیلئے کھل گئے کہئے کہ یہ زلزلہ انگیز پیغام انقلاب تمام نوع کے لئے رحمت تھا یا نہیں ؟

آپ ان چند بھرے ہوئے عنوانات کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ پیغمبر اسلام کا ظہور تمام اقوام عالم کے لئے رحمت ہے یا نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی علامہ اقبال کے الفاظ میں دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان ایک حد فاصل کے طور پر کھڑی ہے۔ یہ مقام ہے انسانیت کی تاریخ ایک نیا موڑ مڑی ہے جس سے اسکے سامنے زندگی کی جدید منزلیں آتی ہیں آپ دیکھیں گے کہ اس تیرہ سو سال میں انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں جس قدر ایسے انقلابات آئے ہیں جن کے نتائج تعمیر انسانیت کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں ان کا سرچشمہ وہی پیغام تھا جو محمد رسول اللہ کی وساطت سے دنیا کو ملا اس پیغام نے انسان کو نئی زندگی اور زندگی کی نئی تعبیر عطا کی جس سے شش جہت کائنات جاندار و تپش آمادہ ہوگئی اور علامہ اقبال کے الفاظ میں۔

"نوع انسانی خشک ریستان کی طرح ایک ذرے کے منتظر تھی وہ بجلی کا شرارہ اس ذرہ جلیل کی صورت میں چمکا تو ساری دنیا شعلہ صفت بن گئی"

لیکن یہ ظاہر ہے کہ سورج کی روشنی اسی کو راستہ دکھا سکتی ہے جو اپنی آنکھوں سے کام لے بارش اسی کسان کی جھولی موتیوں سے بھر سکتی ہے جس نے اپنے کھیت کو سیرابی کے قابل بنا رکھا ہو اسی طرح رسالت محمدیہ بھی اسی قوم کے لئے صحیح معنوں

رحمت کس کیلئے

میں رحمت بن سکتی ہے جو اپنے معاشرے کو ان خطوط پر متشکل کرے جو اس پیغام خداوندی نے نوع انسان کی ربوبیت کے لئے متعین کئے ہیں اسی لئے دوسرے مقام پر ہے کہ ورحمۃ للذین امنوا منکم۔ یہ رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اس نظام خداوندی کو اپنا نصب العین بنائیں رحمت کہتے ہیں اس قالب (Pattern) کو جس کے اندر کوئی شے اپنی تکمیل کو

پہنچے انسان کی صلاحیتیں صرف اس قالب کے اندر اپنی کامل نشوونما حاصل کر سکتی ہیں جو آئینِ خداوندی کی حدود متعین کرتا ہے جب انسانی ہیئتِ اجتماعیہ اس نظام کے قالب میں ڈھل جائے گی اس وقت انسان دیکھے گا کہ رسالتِ محمدیہ کس طرح فی الحقیقت رحمۃ العالمین ہے۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں!

---

(۸) معراج

کائنات میں جب سے شعورِ انسانی نے آنکھ کھولی ہے زندگی اور اس سے متعلقہ مسائل اس کے لئے ہمیشہ وجہ کاوش و فکر رہے ہیں۔ انسان کیا ہے؟ جوئے زندگی کا سرچشمہ کون سا ہے؟ اس کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے؟ کاروانِ حیات کی منزل کون سی ہے؟ مرنے کے بعد انسان پر کیا گذرتی ہے؟ اسی قسم کے اور سوالات ذہنِ انسانی میں پیدا ہوتے رہے اور علمِ انسانی ان کے اطمینان بخش حل کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہا۔ بلکہ فکرِ انسانی کی پوری تاریخ انہی سوالات کے حل کی تلاش کی مسلسل داستان ہے۔ یونان کی حکمت گاہیں، [illegible] کی غاریں اور شام کی خانقاہیں سب اسی داستان کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ فکرِ انسانی نے اس باب میں بڑی کد و کاوش سے کام لیا ہے لیکن جہاں وہ ایک طرف ان مسائل کی [illegible] اور بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا ہے ایک جوئندۂ حقیقت کے لئے یہ امر بھی کچھ کم باعثِ حیرت نہیں کہ وہ دوسری طرف [illegible]

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

اگر آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت ابھر کر آپ کے سامنے آجائے گی کہ یہ مادی نظریۂ زندگی [illegible] یہ دعوے کہ زندگی [illegible] کے ایک ہنگامی عمل سے [illegible] میں زندگی خود بخود پیدا ہو گئی اور اس کی موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جائے گا فکرِ انسانی کی تجسس و کاوش کا حاصل نہیں بلکہ درحقیقت یہ اس کے عجز و درماندگی کا اعتراف ہے۔ یہ منزل پر پہنچے ہوئے مسافر کا سکون نہیں بلکہ تھک کر راستہ میں بیٹھ جانے والے درماندہ راہرو کی صدائے دردناک ہے۔ یہ زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا عزم نہیں بلکہ اس سے گریز و فرار کا ایک فریب

گوشۂ عافیت ہے اس نظریہ کی ابتدا یونان کی ابیقوریت سے ہوئی لیکن یہ اپنے شباب پر یورپ کی عشرت گاہوں میں بیسویں صدی میں آکر پہنچا۔ لیکن یہ نظریہ اس قدر علمِ حقیقت کے خلاف اور سطحیت کی کمزور بنیادوں پر استوار تھا کہ ابھی اپنی جوانی کی چند بہاریں بھی دیکھنے نہ پایا تھا کہ خود یورپ کے مفکرین کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اور انہی تجربہ گاہوں سے جن میں اس نے نشوونما پائی تھی ایڈنگٹن کے الفاظ میں یہ آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں کہ۔

"ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ انسان خالص طبعی عناصر سے ایک مختلف اور جداگانہ شے ہے۔"

قطع نظر اس کے کہ یہ نظریہ کس طرح علم و حقیقت کے خلاف ثابت ہوا یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اس نے اس کائنات میں انسان کے مرتبہ بلند کو کس طرح ذلت کی پستیوں میں گرا دیا اس سے انسان ایک مشین بن کر رہ گیا یا زیادہ سے زیادہ حیوان۔ زندگی نام رہ گیا ارتباطِ جسم و جان کیلئے سعی کا اور انسانی جدوجہد کا ماحصل اس روٹی کا حصول۔ نہ انسان کے لئے کوئی نصب العین رہا، نہ زندگی کے لئے کوئی درخشندہ اقدار۔ زندگی بلا مقصد، مستقبل تاریک۔ اس کا لازمی نتیجہ وہ تصادم و تزاحم تھا جس نے یورپ اور اس کے ساتھ ساری دنیا کو اس طرح جہنم زار بنا رکھا ہے ڈاکٹر ٹیس کے الفاظ میں۔

> ہمارے دور میں خوش حالی اس قدر فراواں ہے کہ باید و شاید عیش و عشرت کے سامان ہر جگہ موجود ہیں مادی کامیابی کے مواقع نچلے سے نچلے درجے کے انسانوں تک کو میسر ہیں لیکن انسان بے حد مضطرب بے قرار ہے تخلیق کی قوت محرکہ کبھی مستقل طور پر ایسے نظریہ کو سینے سے لگائے نہیں رکھ سکتی جو انسانی ذات کو محض مادے کی نمو قرار دے ایسے نظریہ کے ماتحت افراد اور قومیں دونوں تباہ ہو کر خاک میں مل جاتی ہیں۔

یہ تھا مادی نظریۂ حیات۔

حکمتِ یونان کے ایک اور گوشے نے جس میں فیثا غورث کا نام ممتاز حیثیت رکھتا ہے تسلسلِ حیات کا اعتراف تو کیا لیکن اس نے زندگی کو اسی آب و گل کی دنیا میں چکر دینے شروع کر دیئے جس سے اس کا تسلسل دوری حرکت میں تبدیل ہو کر بے نتیجہ بن کر رہ گیا اور افقِ زندگی پر مایوسی کی ظلمتیں چھا گئیں۔

لیکن قرآن نے انسان کو ایک نیا تصورِ حیات دیا جس نے دنیائے فکر و عمل میں انقلاب پیدا کر دیا اس نے کہا کہ زندگی ایک جوئے رواں ہے اور موت سے اس کا خاتمہ نہیں ہو جاتا اس سے ہوتا صرف اس قدر ہے کہ یہ ندی پہاڑ کی اوٹ میں جا کر تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے کاروانِ حیات ایک شاہراہِ عظیم یعنی صراطِ مستقیم پر ایک حسین و جمیل منزل کی طرف بڑھے جا رہا ہے یہ وہ راستہ ہے جس پر خالقِ کائنات کا قانونِ مشیت ساری کائنات کو رواں دواں اور کشاں کشاں لئے جا رہا ہے اور خالقِ کائنات، رب ذی المعارج یعنی بلندیوں کا خدا ہے اس لئے یہ صراطِ مستقیم نہ صرف سیدھی راہ ہے بلکہ بلندیوں کی طرف لے جانے والی بھی ہے لہٰذا زندگی کی حرکت دوری نہیں بلکہ عمودی اور ارتقائی ہے بلند سے بلند تر مقامات تک لے جانے والی، خاک کے ذرے اپنی ارتقائی منزل طے کر کے انسانی پیکر میں متشکل ہو گئے اب اس کے بعد یہ ارتقاء طبیعی ارتقاء (Physical Evolution) نہیں بلکہ شرفِ انسانیت کا ارتقاء ہو گا اس عروج و ارتقاء سے انسان قرآن کے الفاظ میں اقطار السموات والارض۔ یعنی اس طبیعی کائنات (Physical Universe) کی حدود سے آگے نکل سکتا ہے وہ قوت جس سے انسان شرفِ انسانیت کی ان حیرت انگیز بلندیوں تک جا پہنچتا ہے ضمیرِ کائنات یعنی قوانینِ خداوندی کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے اسی کا نام اطاعتِ خداوندی ہے جو درحقیقت قوت و حیات کے اس سرچشمۂ حقیقی سے رفاقت کا نام ہے اسی اطاعت و رفاقت کو اسلام کہتے ہیں اور اس کی مکمل تفسیر مقامِ محمدی میں ملتی ہے اس لئے مقامِ محمدی شرفِ انسانیت کے نقطۂ کمال کا ترجمان ہے اور اسی کا نام انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے پیامِ محمدی نے (جو وحی کے ذریعہ صرف رسول ہی کو مل سکتا تھا) انسان کو اس کے حقیقی مقام سے آشنا کرا دیا اور اسے بتا دیا کہ مادی دنیا ارتقائے انسانیت کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی تسخیر اور صحیح مقصد میں اس کا استعمال اس ارتقاء

کے لئے ممد و معاون ہوتا ہے درخت کی جڑیں اس لئے خاک میں پیوست ہوتی ہیں کہ اس کی شاخیں آسمان کو چھو لیں اس تسخیر مادہ سے خود مادہ کے اندر روح کی نمود ہو جاتی ہے اور اس طرح انسان اپنی ارتقائی منازل طے کرتا اقطار السموات والارض یعنی کائنات کی چار دیواری سے بلند ہوتا جاتا ہے یہی معراج انسانیت ہے جس کے فقدان سے نوع انسان باہیں ہمہ ادعائے علم و تحقیق جہالت اور سبعیت کی پستیوں میں گرتا جا رہا ہے اور جس کی تصویر میبن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"ہمارے دور میں جس چیز کی کمی ہے وہ انسانی خودی ہے جس کی نمود مادہ اور روح دونوں میں ہونی چاہیئے انسان مادی کامرانیوں میں ڈوبا ہوا اور ایک عجیب الجھاؤ میں ہے اس لئے کہ اس کی ذات اپنے آپ کو مادہ سے بلند نہیں لے جا سکتی۔ بلکہ مادہ کے اندر ڈوبی ہوئی محسوس کرتی ہے اس کا اضطراب اس لئے ہے کہ اس کا تحت الشعور یہ چاہتا ہے کہ وہ ثابت کر دے کہ وہ مادہ سے جن چیزوں کی تخلیق کرتا ہے تو وہ ان سے کچھ بیش ہے وہ مادی کاریگری کو بحال رکھنا چاہتا ہے

اس لئے کہ اس کی قوت تخلیق کی مدد کے لئے یہ ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو مادیت سے بلند لے جائے اور اس کی ذات کا اندازہ اس کی مادی تخلیق سے نہ لگایا جائے بلکہ اس سے کہ وہ خود کیا ہے"

سلام ہو اس ذات اقدس و اعظم پر جس نے انسان کو بتایا کہ وہ مادی کاریگری کو بحال رکھتے ہوئے کس طرح اپنے آپ کو مادہ کی چار دیواری سے بلند لے جا سکتا ہے اور صرف بتایا ہی نہیں بلکہ خود معراج انسانیت کے اس افق اعلیٰ پر متمکن ہو کر دکھا دیا کہ ان بلند مقامات تک پہنچنے کی راہ کون سی ہے اگر مسلمان دنیا میں معراج محمدی کی یاد قائم رکھنا چاہتا ہے تو اس کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ یہ اپنے آپ کو ایک ایسی ملت ثابت کرے جس کے سامنے زندگی کا بلند نصب العین ہو اور دل میں اس نصب العین کے حصول کی تڑپ جس کی نگاہ پاک ہو اور حوصلہ بیباک، سینہ کشادہ ہو اور ہمت بلند جو کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے انھیں تعمیر انسانیت کے پاکیزہ مقصد میں صرف کرے اور اس طرح خود بھی خار و خس چمن ہونے کی بجائے شاخ نہال سدرہ بن جائے اور اپنے ساتھ ساری دنیا کو اس جہان آب و گل کی پستیوں سے نکال کر فلک الافلاک کی بلندیوں تک لے جائے۔

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں۔

(جون سنہ ۱۹۴۷ء)

مطبوعہ - فیروز سنز پریس میکلوڈ روڈ کراچی